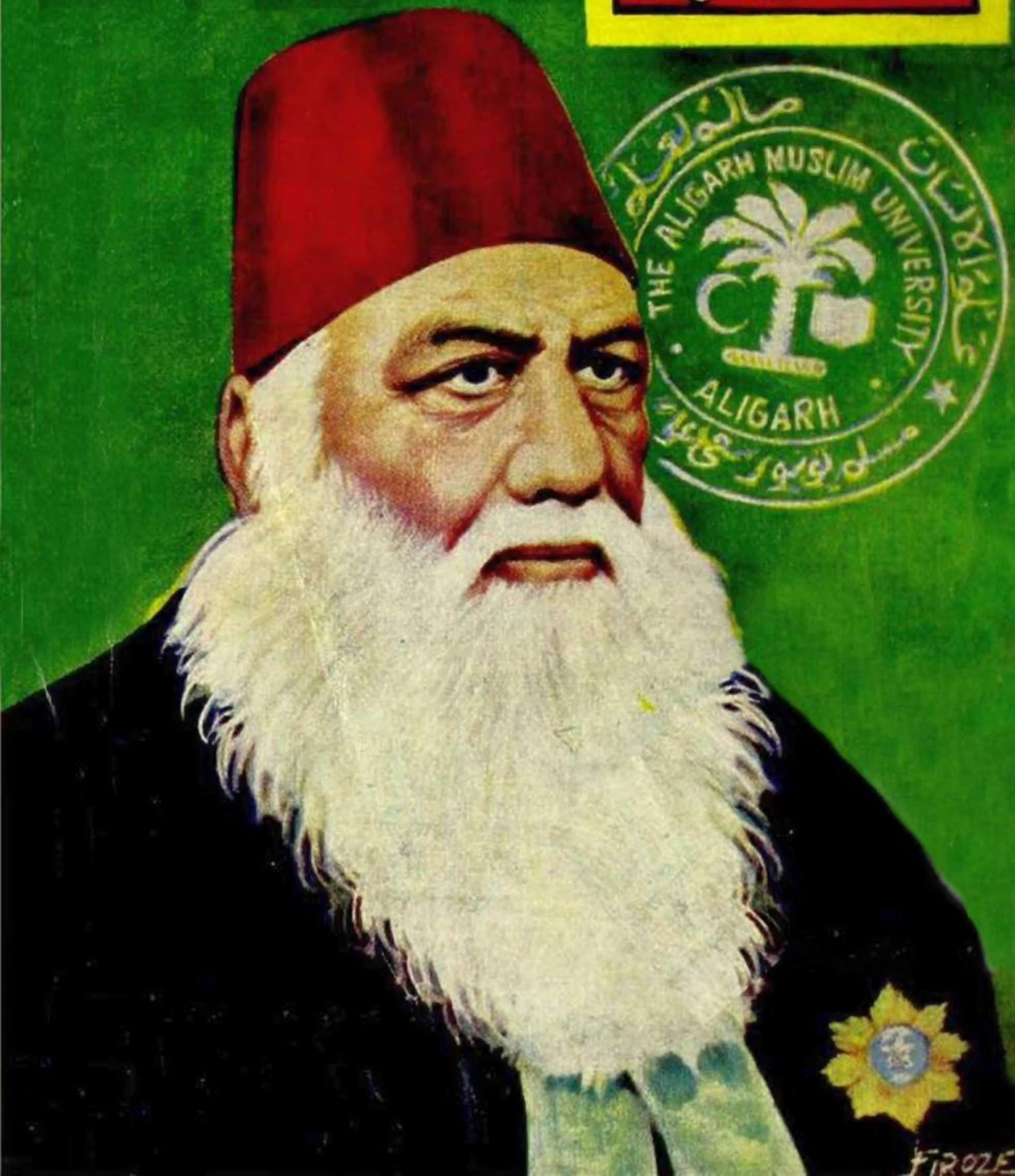


علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



FIROZE







اگست ۱۹۷۲ء

جلد ۸

شمارہ ۷۲

ہما سلیکٹرز کی بطور مہلت میں سے ایک

اردو ڈائجسٹ  
معا



فون  
۷۸۸۶۴

مدیر  
عبدالوحید  
صدیقی

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

قیمت : چار روپے

عام شمارہ کی قیمت، ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ سال بھر کی قیمت  
تیس روپے۔ جس میں سالانہ کی قیمت و بارہ روپے جبری  
اک خرچ کے لئے بھی شامل ہیں، ہر شمارہ جبری سے بھی جاتے

اردو ڈائجسٹ ہما۔ جے ۱، جنگپورہ ایگنیشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳







# ہمارے بال و پر

۱۰	عبدالوحید صدیقی	۷۳	دیں منزل	اداریہ
۱۲	خالد ہندی		مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالمیمون	ملاقاتیں
۲۴	خالد ہندی		اسٹوڈنٹس یونین کے صدر سید قیصر محمود سے ملاقاتیں	
۷۰	عبد البصیر نعیمی		اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے آئیری جزل سکرٹری	
۲۹	ادارہ		حاجی عبید الرحمن خاں شیردانی کے ساتھ چند لمحے	
۳۰	ادارہ		ایک ملاقات نواب محسن الملک سے	تعارف
۵۲	ماخوذ		اب تک کے چانسلر اور پرنسپل	
۸۵	خلیق نظامی		مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء تک	
۶۵	سراغھاں مرحوم		اب تو مشگئے تیرے مٹانے کے نشان بھی	
۱۱۲	حافظ احمد سعید آف چھتاری		علی گڑھ کی روایات	
۳۸	مرسید		مسلم یونیورسٹی میری زندگی کا عظیم کارنامہ	تلخیص
۱۰۴	ماخوذ		میرے زمانے کا علی گڑھ کالج	یادداشتیں
۱۷۶	سید محمد ضمیر اختر حسنی		سید احمد خاں آپ سے مخاطب ہے	خطبات
۲۱	ڈاکٹر انثرٹ		مرسید کے جنازے سے ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ	عبرت و نصیحت
۱۸۲	محمد اکرام اللہ خاں		کے انتقال تک	
			مسلم یونیورسٹی کا اقامتی کردار	مشعلِ راہ
			علی گڑھ کے چند سرپیرے	شخصیات
			جسے سب سے کم سمجھا اور جانا گیا۔ اس کا نام ہے	جامنہ
			علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	



۱۹۷	پرفانہ رد دہلوی	اللہ اکبر، اللہ اکبر	کھیل کود
۱۶۵	شوکت علی مرحوم	علی گڑھ کے کھیلاندرے	تنظیمیں
۱۴۳	جاوید حبیب	مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین	لطائف
۱۲۹	شاہین ملک	علی گڑھ اسلامک اسٹڈنٹس	یادوں کے جھروکے
۲۱	جواہر خواجہ	کالج کی زندگی انہوں سے۔ پہلی ہڑتال تک	تاریخ پارے
۱۸۹	محمد احمد	کالج کی صدائیں	تربیت
۱۴۵	ایم رحمان	جن کی گود میں سرسید کا بچپن گزرا	سوانح حیات
۲۰۶	صابر علی	یہ ہیں سرسید	چارٹ
۱۵۱	ماخوذ	سرسید احمد خاں ایک نظر میں	متفرقات
۳۴	فرخ جلالی	نسب نامہ سرسید احمد خاں مرحوم	
۱۴۹	ماخوذ	سائنٹیفک سوسائٹی۔ نشاۃ ثانیہ	
۱۶۳	نواب چھتری کٹی انری سے	نواب مزمل اللہ خاں کو یونیورسٹی کے متعلق ایک خط	
۱۶۴	ادارہ	عہد سرسید کے کچھ ہندوستانی اساتذہ	
۱۸۹	ماخوذ	سید کی بوت پر یورپین لیڈی کا مرثیہ	
۱۹۵	ابوالکلام	علم کے اس سوتے کے باجے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مائے	
۲۱۱	ماخوذ	بیگ کیشی کی سفارشات کا خلاصہ	
۲۲۹	بی۔ پی۔ موریہ	مسلم یونیورسٹی سیکولر روایات کا گہوارہ	
۲۴۳	احتشام حسین	علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو	
۲۱۲	محکمہ اطلاعات	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۴۷ء حکومت کا نقطہ نظر	نقطہ ہائے نظر
۲۲۳	عبد البصیر اور عبید الرحمن	مسلم یونیورسٹی شعلوں کے زغے میں ایکٹ کے مخالفوں کا نقطہ نظر	
۲۳۱	شاہ صدیقی	ایکٹ ۱۹۴۷ء قطعی غیر جمہوری۔ ایک نقطہ نظریہ بھی ہے۔ شاہ صدیقی	



# ایکٹ ۱۹۷۲ء اچھا یا بُرا

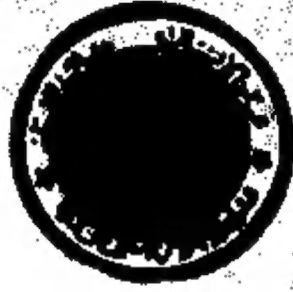
- ۱۔ اچاریہ جے۔ بی کرپانی
- ۲۔ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی صدر مسلم مجلس
- ۳۔ خواجہ احمد عباس ادیب اور فلم ڈائریکٹر
- ۴۔ شیخ عبداللہ کشمیر
- ۵۔ اجیت پرشاد جین (ایم۔ پی)
- ۶۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
- ۷۔ کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
- ۸۔ مولانا اسحاق سنبھلی ممبر پارلیمنٹ
- ۹۔ فخر احمد صدیقی دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش
- ۱۰۔ این۔ جی گورے سوشلسٹ لیڈر
- ۱۱۔ کے نریندر ایڈیٹر پرتاپ
- ۱۲۔ میر مشتاق احمد چیرمین میٹروپولیٹن کونسل دہلی
- ۱۳۔ کے۔ ڈی۔ مالویہ (ایم۔ پی)
- ۱۴۔ جن سنگھ کے پروفیسر بلراج مدھوک
- ۱۵۔ سید مظفر حسین شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ
- ۱۶۔ پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی
- ۱۷۔ غلام سرور ایڈیٹر سنگم پٹنہ
- ۱۸۔ نام گوپال (ایم۔ ایل۔ سی)
- ۱۹۔ سید کی لورج تربت
- ۲۰۔ علی گڑھ کول
- ۲۱۔ اقبال
- ۲۲۔ اسلم حیرا چوہی

## منظومات

ترتیب:۔ احمد مصطفیٰ صدیقی ————— تزئین کار:۔ بہزاد لاہری ————— ناظم اعلیٰ:۔ خالد صدیقی  
 ————— مطبوعہ:۔ شرما آفیسٹ پریس چاوڑی بازار دہلی ————— پرنٹر:۔ پبلشر:۔ عبدالوحید صدیقی  
 مکان:۔ ہما پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۱۰ ————— مقام اشاعت:۔ جے ۱۷ جگمورہ ایکشن، نئی دہلی ۱۱۰  
 ————— "ہمانی دہلی" کے حوالے سے ہر مضمون نقل کرنے کی اجازت ہے







بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

## وضاحت

اپنے اس پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے انسان کو جنم ہونے  
خون سے پیدا کیا۔ لوگو! پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کرم کرنے  
والا ہے۔ وہ، وہ ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور  
انسان کو ان چیزوں کا علم دیا جس کو وہ پہلے سے نہیں  
جانتا تھا

نوٹ :- قرآن حمید کی پہلی وحی کا پہلا لفظ ہی ”تعلیم“ ہے  
اس کے بعد انسانی تخلیق کا بیان ہے گویا انسان اور تعلیم کا جسم و  
جان کا تعلق ہے۔ لیکن تعلیم سے مراد وہی تعلیم ہے جو انسان بنانے  
والی ہے، مختصر یہ کہ قرآنی تعلیم اور پھر اس معیار پر جو تعلیم بھی آجائے  
یعنی ساری دنیا کی جائز تعلیم۔

(احمد مصطفیٰ صدیقی)

میں کہاں رکنا ہوں عرش و فرش کی آواز سے  
بھک جانا ہے بہت اونچا صبر پر داز سے

## ۳۷ ویں منزل

انگریزوں کے دور حکومت میں جب انگریزی زبان نے سرکاری دفاتر سے فارسی کو  
بیدخل کر کے اس کی جگہ اپنا سکتہ چلا یا اور نظام حکومت میں حصہ دار بننے کے لئے انگریزی زبان  
اور جدید علوم سے ————— آگاہی ناگزیر بننے لگی تو ہوا کار خ پہچان کر  
ہندوستانیوں کے دانشمند طبقوں نے حکمرانوں کی زبان سیکھنے اور جدید علوم حاصل کرنے کی طرف سبقت کی نتیجے  
میں وہ بتہ بتہ اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز ہونے لگے لیکن مسلمان اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہدایت کے  
مطابق انگریزی تعلیم اور علوم جدیدہ کی تحصیل سے گریزاں رہنے کی بنا پر نظام حکومت میں موثر اور قابل قدر جگہ  
حاصل کرنے کے قابل نہ بن سکے۔ اور اس پسماندگی کا اثر ان کے پورے معاشرہ میں نمایاں ہونے لگا۔ سرسید احمد  
خاں نے اپنے فرقہ کی اس کوتاہی کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اگر مسلمان اس دوڑ میں شریک ہونے سے اسی طرح  
گریز کرتے رہے تو وہ بالکل مغلوب ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا مستقبل بیکار و بیک ہو جائے گا۔ اس  
احساس کے ساتھ ہی ان کا درد مند دل ٹپ اٹھا اور انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور علوم  
جدیدہ کے حصول کی طرف مائل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور کسی دوسرے کی نہیں خود  
مسلمانوں کی حوصلہ شکن مخالفتوں کے باوجود اپنے اپنے عزم و استقلال میں بغرض نہ آنے دی۔ چنانچہ ان  
کی پرفلوس کوششیں بار آور ہوئیں اور تدریستہ علوم کی شکل میں جو نفاذ ساپودا علیگڑھ کی سرزمین پر نصب  
کیا گیا تھا۔ اس کی شاخوں نے پھیل کر جلد ہی مسلم اینگلو اور نیٹیل کالج کی شکل میں ایک تناور اور فیض بار  
درخت کی حیثیت اختیار کر لی اور پھر یہی درخت ایک مثالی یونیورسٹی بن کر کئی براعظموں کے تشنگان علوم جدیدہ  
کو سیراب کرنے لگا۔ ————— آج ہم اسی یونیورسٹی کا تعارف ہمارا کی اس خاص اشاعت



کے ذریعہ کراسے ہیں۔ اس یونیورسٹی نے کتنے

عظیم کامائے انجام دیئے۔ ایسی کسی نامور شخصیتیں پیدا کیں۔ زندگی کے ہر میدان میں کس طرح اپنی افادیت اور خدمت کے جھنڈے گاڑے یہ سب کچھ آپ کو اس خاص شمارہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ ہم تو ان سطحوں میں صرف چند قابل توجہ حقیقتوں کی طرف اشارے کرنا چاہتے ہیں۔

درستہ معلوم ملے گا کہ قیام ایسے وقت میں ہوا جب فرنگی ہندوستانیوں کو مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے

سے متفرک کر کے لڑاؤ اور حکومت کروہ کی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ ایسے میں کسے گمان ہو سکتا تھا

کہ کوئی سرسبز ہندوستانی انگریزوں کی اس بنیادی پالیسی پر ضرب کاری لگانے کی جرأت کر سکتا ہے۔

لیکن سید احمد خاں نے جام و سداں بافتن کا یہ کھیل اتنے خوبصورت انداز میں کھیلا کہ باغیاں بھی خوش

رہا اور حیدر بھی ناراض نہ ہوا یعنی انہوں نے یہ علمی مرکز قائم تو اس لئے کیا کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے آشنا بنانے

ترقی کی دہ میں دوسرے پہلوؤں سے پیچھے نہ رہنے دیا جیسے لیکن ان کی حکمت عملی کا روشن ترین پہلو یہ تھا کہ جب

حاکم و محکوم دونوں میں سے کوئی بھی سیکولرزم کی اصطلاح سے آشنا نہ تھا اس وقت انہوں نے اس مبارک عرصہ میں

فردوں اور گروہوں کے بغیر سیکولرزم کی بنیادیں استوار کیں، انہوں نے فرقہ وارانہ منافرت کے افنی کا سرغاموشی

کے ساتھ کھلا، انہوں نے ہندو مسلمان کو اس مادر علمی کی آغوش میں بھائی بھائی بنکر رہنا سکھایا۔ اساتذہ کی صفت ہو یا طلبا

— کی دنیا یہاں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں سر نہ اُبھار سکا، اور یہ حسین منظر ایسی حالت میں تھا کہ اس ادارہ کے

سربراہ مسلم کا ہر اسے امتیاز تھا، یہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا اس کے ذریعہ مسلمانوں کی علمی پیماندگی دور

کرتی تھی۔ یہاں مسلم فرقوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہاں ان کی عبادت گاہیں تھیں۔ گویا یہاں کا دروبست مسلم

تھانوار پر تو یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا اور اس کے بغیر یہاں رفاہی ہوتی، یہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہوتی

اور یہاں سچی ہندوستانی ہوتی تو ان محاسن کا سہرا مسلمانوں کے سر کیسے بندہ سکتا۔ مسلمانوں کو تو اس کا کریڈٹ اسی

وقت مل سکتا ہے جب رواداری، بھائی چارے، فرقہ وارانہ میل ملاپ اور باہمی محبت و یکجہتی کا مظاہرہ ایسے

ماحول میں ہو جہاں کے مالک و مختار بلا شکر کتہ فرے وہ خود ہوں اور سید احمد خاں نے یہی کر کے دکھایا اور آئندہ

مسلمان نسلوں کے لئے آب زر سے لکھنے کے لائق یہ سنہرا ضابطہ حیات چھوڑا۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ مثالی کردار

آزاد ہندوستان کے آزاد باشندوں کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور آج جبکہ فرقہ وارانہ یکجہتی اور یکوہزم

کے مفہوم اور اسکی اہمیت سے ہر

ہندوستانی واقف ہو چکا ہے۔ مسلم

نیزو رٹی سکاس امتیاز کو نہ صرف محفوظ رکھنے کی بلکہ اسے ادا جا کر کرنیکی بہترین کوششیں ہونی چاہئیں اور یہی مزاج دوسرے تمام ایسے تعلیمی اداروں کا بنانا چاہئے جو کسی ایک غرقہ کیساتھ منسوب ہوں اور جن پر ان کا مکمل انتظامی اور مالی کنٹرول ہو۔ اور باب حکومت اور مختلف انجیال سیاسی جماعتوں کو یقین دہانی کیساتھ اس رول کو سمجھنا چاہئے کہ یہ جتنی دیر پیا اور بہترین نتائج کی حامل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر سے پیدا ہو۔ باہر سے لادی ہوئی۔ عجیبی سے پیدا ہونے والے نتائج نہ دیر پا ہوں گے نہ نتیجہ خیز۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ۔ مسلم یونیورسٹی بل جسے حکومت نے حیران کن سرعت اور چابکدستی سے ایکٹ کی شکل دیدی اس جکل بدیابے آتش اور اہل فکر کے لئے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اسکی مخالفت بھی ہو رہی ہے اور موافقت بھی۔ ہمارا یہ خاص نمبر پیش کرنا مقصد یہ ہے کہ اس ایکٹ کے حامیوں اور مخالفوں کو مسلم یونیورسٹی کی حقیقت اور اسکا نصب العین سمجھنے میں مدد ملے اور انکی حمایت یا مخالفت اللہ کے کیلاکھی نہ بن جائے۔ ہم اس مختصر مضمون میں ایکٹ کی خامیوں اور خوبیوں سے بحث نہ کر سکیں گے پھر بھی چند ضروری پہلوؤں پر روشنی ضرور ڈالیں گے۔

ایکٹ نے یونیورسٹی کے سر پر "مسلم" کا حلقے اختیار باقی رکھا ہے، اسلامی عبادت گاہوں کو باقی رکھا ہے، اسلامیات کے مطالعہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ لیکن اس مطالعہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ ضرور کر دیا ہے کہ اسلامیات کے مطالعہ کے ساتھ ہی یہاں ہندوستانی مذاہب اور تہذیب کا مطالعہ بھی کیا جائے گا۔ یہاں بلا ارادہ نہ ہسی اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے درمیان جو حقد و فاصل قائم ہو گئی ہے وہ ذہنی اعتبار سے کتنے بھیانک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ کاش یہی بات اس طرح بھی گئی ہوگی کہ "اسلامیات کے مطالعہ کے ساتھ ہی یہاں ہندوستان کے دوسرے مذاہب و تہذیب کے مطالعہ کا انتظام بھی کیا جائے گا" تو کتنی اچھی بات ہوتی اور ایک غلط "دوسرے" کے اضافہ سے مفہوم کتنا خوشگوار ہو جاتا۔۔۔۔۔ اسی طرح ایکٹ کے محائفوں اور حامیوں نے اقلیتی کردار اور تاریخی کردار کی نئی اصطلاحات کے جھگڑے کھڑے کر کے بات کا تسکڑ بنا دیا ہے۔ حالانکہ ایک مسلم یونیورسٹی کا کردار "مسلم" ہی ہونا چاہیے۔ یعنی دی تاریخی کردار جو سید احمد خاں کے پیش نظر تھا اور جس کا عملی مظاہرہ مدرستہ العلوم کے قیام سے میکر یونیورسٹی کی ابتک کی عملی زندگی سے ہوتا رہا ہے۔ اگر یونیورسٹی کو "مسلم یونیورسٹی" تسلیم کر لینے کے بعد اسکے کردار کو ابتک کا قطعی مسلم کردار تسلیم کر لیا جاتا تو نہ "اقلیتی کردار" کی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت ہوتی نہ "تاریخی کردار" پر زور دینے کی احتیاج باقی رہتی۔۔۔۔۔ یہ کہنا بھی اپنے اندر کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کہ اسے اقلیتی (مسلم) ادارہ تسلیم کر لیا جائیگا تو اس میں صرف ۷۰ ہزار مسلمان تعلیم حاصل کر سکیں گے باقی مسلمان تعلیم حاصل کرنے کے لئے کہاں جائیں گے مسلم یونیورسٹی کو مسلم ادارہ تسلیم کر لینے کے معنی تو نہیں ہونگے کہ دوسرے تعلیمی اداروں کے دروازے مسلمان طلباء پر بند ہو جائیں گے جس طرح مسلم یونیورسٹی کے دروازے غیر مسلم طلباء کے لئے کھلے ہوتے ہیں اسی طرح دوسرے تعلیمی اداروں کے دروازے مسلم طلباء کے لئے کھلے رہیں گے۔ اگر صرف لڑکیوں کیلئے کوئی اسکول یا کالج مخصوص ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ لڑکیاں دوسرے اسکولوں یا کالجز میں داخلہ نہیں لے سکتیں۔ یا کسی ٹرین میں زنانہ کپار ٹنٹ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ عورتیں کسی دوسرے کپار ٹنٹ میں بیٹھ ہی نہیں سکتیں، تو کسی اقلیتی ادارہ کی تعلیم گاہ کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس اقلیت کے امیدوار دوسری تعلیم گاہوں میں داخل ہی نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ اسی طرح کسی اقلیت کی تعلیم و کالج وغیرہ کی حفاظت کے لئے حکومت کی طرف سے ملی امداد دینا بھی اس اقلیت کی خصوصیات کو ختم کر دینے کا موجب نہیں بن سکتا۔ اُسکے "نیشنل" ہونے کے منافی ہو سکتا ہے۔ تعلیم بھی قوم کا ایک حصہ ہیں اور انکی ہر حیثیت کی حفاظت کرنا ایک اچھی اور جمہوری حکومت کا ضروری فریضہ ہے۔ اسلئے کسی اقلیتی ادارے کو مالی امداد دینا اس کی روح اور بنیادی حیثیت کو ختم کرنے کا بہانہ کسی انصاف پسند کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتا۔

حرف آخر :- اس وسیع موضوع پر ان مختصر گزارشات کے بعد ہم اب باب حکومت سے عرض کرینگے کہ وہ کسی عقلی بحث میں پرکار ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات کے احترام کو ترک نہ کریں اور قانون کو ایسی شکل دینے کا جرات مندانہ اقدام کریں جو مسلمانوں کی جائز خواہشات کو پورا کر سکے اور مسلمانوں سے ہماری درخواست یہ ہے کہ وہ سید احمد خاں کی پالیسی کو سمجھیں اور اس پر عمل کر کے زندگی کی دلائل میں مسلمانوں کو پیچھے نہ جانے سے بچائیں۔ یہی ہمارا مشورہ ہے اور یہی ہماری درخواست ہے۔





سليم پوٽيو پٽي

علي گدھ

وائس چانسلر

ڈاکٹر

عبدالعليم

اور



مفتي  
۱۹۶۷/۷

اسخود نئس پوٽي

آمر

سید محمد محمود

سے ملاقاتی

(خالد ہندی)

**میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کمپس میں وکٹوریہ گیٹ**  
 کے سامنے کھڑا ہوا ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس عمارت کو  
 دیکھ رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد  
 ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے  
 قدموں کو جمائے اور پست ہمتی کو ہمت و استقلال اور عزم و  
 حوصلہ میں بدلنے کا وسیلہ بنی۔ جس کی ہر اینٹ ایک مظلوم ملت  
 کیلئے انتشار اور بربادی سے نکل کر اتحاد اور ترقی کی منازل طے  
 کرنے کا ذریعہ بنی، جس کا ہر دروازہ جس کی ہر دیوار آج بھی  
 زبان بے زبانی سے یہ کہہ رہی ہے کہ فرے کسی بھی ملت کو تاریکی  
 سے روشنی کی طرف نہیں لے جاسکتے۔ اگر اندھیرے سے نکلنا ہے  
 اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے اور اگر زندگی کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ  
 اپنی ملت اور اپنے ملک کے لئے مفید بنانا ہے تو صرف جذباتی  
 فرے نہ لگاؤ۔ حالات کا نور نہ پڑھو۔ سیدہ کوئی اور ہاتھ پائے  
 کو اپنا رہنما نہ بناؤ بلکہ عمل کرو۔ اشارہ قربانی کی راہ اختیار کرو۔  
 صبر و استقلال سے کام لو اور جہاد کرو۔ اپنے نفس کے غلات  
 خود غرضی اور موقہ پرستی کے غلات اگر تم عمل نہیں کر سکتے تو تمہیں  
 دنیا فراموش کر دے گی۔ تمہارا نام حرف غلط کی طرح مٹ  
 جائے گا اور آسمانی تسلیں تمہیں فراموش کر دیں گے۔

یہ وہ عمارت تھی جس نے ایک درمائدہ قوم میں علم و فضل  
 کا صحیح اور حقیقی ذوق پیدا کیا۔ جس نے اندھیرے میں بھٹکتی  
 ہوئی ایک بے سہارا ملت کے لئے منارہ نور کا کام کیا اور جس  
 نے مسلمانوں کو نقالی، ظاہر پرستی اور خوش فہمیوں کی ٹیڑھی  
 میڑھی راہوں سے ہٹا کر با مقصد زندگی کی راہ پر انکی ہمتی کی۔  
 میں دور ہا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ اگر یہ عمارت نہ بنی  
 ہوتی تو آج ہندوستان میں مسلمان جہالت کے اندھیرے میں  
 بھٹک رہے ہوتے۔ قومی زندگی میں ان کا کوئی اہم مقام نہ ہوتا۔  
 اور وہ اپنے گلوں میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد  
 کے تعویذ پہنے ہوئے بھکاریوں کی طرح بسک بسک کر زندگی

گزار رہے ہوتے۔ اس عمارت نے انہیں احساس شکست  
 اور احساس کمتری سے نکال کر با عزت زندگی گزارنے کا طریقہ  
 سکھایا۔ فتح و نصرت سے ہمکنار کیا اور ان کے تن مردہ میں نئی  
 جان ڈالی۔

آج اس عمارت کے اندر گرد و سوسے، شلوک و شہت  
 اور خوف و ہراس کے بادل منڈلا رہے ہیں، خافتگی کی بجلیاں  
 کو نہر ہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی کوئی بجلی گرے گی اور یہ  
 عمارت جس فحش خاک کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ ظم اس کا نہیں  
 کہ یہ عمارت بجلیوں کی تدویر ہے بلکہ رنج ہے اس بات کا کہ اگر  
 یہ آشیانہ جل کر خاک ہو گیا تو کوئی سرسید نہ ہوگا جو اس خاک کے  
 ڈھیر سے اس سے بہتر آشیانے کی تعمیر کر سکے گا اور کوئی محسن الملک  
 نہ ہوگا جو ایک نیا آشیانہ تعمیر کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر سکے  
 اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ یہ اینٹ اور گارے کی عمارت کروڑوں  
 زندگیوں کی علامت ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اور شاید یہ کہنا بھی غلط  
 نہ ہوگا کہ اگر یہ عمارت اپنی پوری تاریخ، اپنی ہدایات اور اپنے  
 عظیم ماضی کے رنگ و روغن سے محروم ہو گئی تو کروڑوں جسم بے روح  
 اور بے جان ہو جائیں گے۔ اسی تصور کو لے کر میں آگے بڑھ گیا۔  
 اب میں علوم و معارف ایشیائے مطالعہ کے مرکز میں داخل ہو گیا۔ اس  
 مرکز کی لائبریری میں قیصر محمود مطالعہ میں غرق تھے۔ قیصر محمود  
 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے صدر ہیں۔ دیکھنے میں  
 کم عمر نظر آتے ہیں لیکن باتیں کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سوچنے سمجھنے کا  
 انداز بالکل جیسا ہے۔

وہ مجھے ایک بہت صاف ستھرا اور پرسکون کمرے میں  
 لے گئے جس کی دیوار پر ایک طرف مشرق وسطیٰ کے مسلم مالک کا  
 نقشہ ”ہرے آئینہ“ بہا رہا تھا اور دوسری طرف بلیک بورڈ پر  
 علم حدیث کے متعلق چاک سے کچھ سوالات لکھے ہوئے تھے ہم  
 دونوں آگے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر میں نے ان سے براہ راست  
 یہ سوال کیا ”مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۴ء میں کیا غامیاں



ہیں اس کا آپ کیوں اس کے مخالف ہیں؟ انہوں نے بڑے  
مزم اور ملازم لہجہ میں جواب دیا: بنیادی طور پر اس میں چار  
غامیاں ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کا جو جمہوری اور  
خود نمائی کا کردار تھا وہ مجروح ہوا ہے کیونکہ سات سال  
پچھلے آرڈیننس نافذ کیا گیا تھا اسی کو ایکٹ کی شکل دے  
دی گئی ہے اور وائس چانسلر کو بے تحاشہ اختیارات حاصل  
ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر اساتذہ کے تقرر کے سلسلہ میں اور تمام  
دیگر امور میں اسے آمرانہ اختیارات دیتے گئے ہیں۔ اس  
وائس چانسلر کے ذریعہ جو حکومت کا نامزد افسر ہے حکومت  
یونیورسٹی پر پورا کنٹرول رکھے گی۔

”دوسری بات یہ ہے کہ اس ایکٹ نے مسلم یونیورسٹی  
کے اقلیتی کردار کو ختم کر دیا ہے جس کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے  
ایکشن سے پہلے اپنی پریس کانفرنس میں اور پھر کانگریس کے  
انتخابی منشور میں وضاحت سے اپنا نقطہ نظر رکھا تھا اور ای کی  
بنیاد پر پوری مل گڑھ برادری نے ان کی حمایت کی تھی۔ ایکٹ  
میں اس کردار کو برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے  
کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق میں طلبہ کی کوئی نمائندگی نہیں۔  
کورٹ میں طلبہ کی نمائندگی میرے خیال میں وائس چانسلر کی  
نمائندگی ہے کیونکہ طلبہ کے ان نمائندوں کو وائس چانسلر نامزد  
کرے گا اور چونکہ وائس چانسلر حکومت کا نامزد کیا ہوا افسر  
ہو گا اس لئے ایک طرح سے یہ نمائندگی بھی حکومت ہی کی  
ہو گی۔ اسٹوڈنٹس کونسل میں بھی اسی چال سے کام لیا گیا ہے۔  
اس میں ۲ نمبر ہونگے۔ ۱۰ منتخبہ اور ۱۱ براہ راست نامزد کردہ،  
کونسل کے ۱۰ اراکوں کا انتخاب بھی جمہوری نہ ہو گا بلکہ وائس چانسلر  
کے نامزد کئے ہوئے طلبہ انہیں چنیں گے۔ اس کے ساتھ ہی  
ایک اور مذاق کی بات یہ ہے کہ اسٹوڈنٹس کونسل کا چیرمین  
پھر ہو گا اور وہ بھی وائس چانسلر کا نامزد کیا ہوا۔

”چوتھی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ اور

انٹرویو۔ ہمارے شائع ہونے والی ملاقاتوں کا  
مقصد آپ کو مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے  
متنازعہ نمایاں افراد سے متعارف کرانا اور ان کے  
خیالات سے باخبر کرنا ہے ضروری نہیں ہے کہ ان  
کے خیالات سے ہمیں یا آپ کو اتفاق بھی ہو  
ان ملاقاتوں کے ذریعے آپکو ہر جماعت کے بڑے بڑے  
رہنماؤں کے دلوں کے مخفی گوشوں میں جھانک کر انہیں  
کچھ اور پہچاننے کا موقع ملتا ہے اور یہ ایک بڑا فائدہ ہے  
یاد رکھئے کہ جس شخص سے انٹرویو لیا جاتا ہے  
ہم اس سے صرف سوالات ہی کر سکتے ہیں ضروری  
نہیں ہے کہ وہ ہمارے ہر سوال کا جواب دے یا  
کسی اختلافی جواب پر ہم اس سے بحث کریں۔

(ادارہ)

سابق طلبہ (اولڈ بوائز) کو مناسب نمائندگی نہیں دی گئی  
ہے۔ وہ بھی نامزد کئے ہوئے ہوں گے۔ اس طرح نامزدگیوں  
کا ایک لامتناہی سلسلہ ہو گا جو یقینی طور پر آزادی رائے کے  
لئے بہت بڑی رکاوٹ بنے گا۔ ایکٹ پر اپنے اعتراضات  
کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد قیصر محمود نے کہا: اس  
ایکٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو پارلیمنٹ  
نے تسلیم کر لیا ہے۔

”کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آئینی اعتبار سے حکومت کسی  
اقلیتی فرقہ کے لئے کوئی ادارہ نہیں قائم کر سکتی۔ اس سلسلہ  
میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے قیصر محمود سے دریافت  
کیا اور انہوں نے زیربہ منستے ہوئے کہا: میں اس خیال  
سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اگر پارلیمنٹ یہ محسوس  
کرے کہ کوئی اقلیتی فرقہ پسماندہ ہے تو وہ اس کے لئے ایک

ادارہ قائم کر سکتی ہے۔ نہ کہ حکومت خود ہمارے قائم کئے ہوئے  
ادارہ پر قبضہ کر لے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار  
کو تسلیم نہ کرنے کے سلسلہ میں حکومت جو دلیل دیتی ہے۔ وہ  
ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس کی دلیل کو مان لیا جائے تو  
پھر حکومت کو یہ یقین دہانی کرائی ہوگی کہ مسلم پرسنل لا رہو  
یا کسی اقلیت سے متعلق کوئی بھی مسئلہ پارلیمنٹ میں آئے گا؟  
اب میں نے قیصر محمود سے پوچھا: مسلم یونیورسٹی کی تحریک  
کے سلسلہ میں بنارس اور فیروز آباد میں جو خون بہا اس کی  
ذمہ داری کس پر ہے؟ انہوں نے بڑے تیکھ انداز میں  
جواب دیا: "یہ خون ناحق ان لوگوں کی گردن پر ہے جنہوں نے  
یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم تحریک نہ چلنے دیں گے۔ جمہوری حقوق نہ  
دیں گے اور پٹا سن جمہوری طریقوں سے ایکٹ کے متعلق ایکٹ  
کے مخالفوں کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے دیں گے۔"

مجھ لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ مسلم جماعتوں نے سیاسی  
فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ تحریک چلا رکھی ہے اور وہ ایکشن  
کے وقت کانگریس اور حکومت کے خلاف مسلمانوں کی بے چینی  
سے استفادہ کریں گے؟ کیا یہ خیال درست ہے؟ میرے  
اس سوال کے جواب میں قیصر محمود نے ٹک ٹک کر کہا: میں  
بمبشتیت صدر اسٹوڈنٹس یونین اس سلسلہ میں اپنی رائے  
منہیں دے سکتا کیونکہ یونین کی پالیسی اور روایت یہ ہے کہ کسی  
بھی مسلم تنظیم کے خلاف چلے وہ سیاسی ہو یا مذہبی کوئی مذمتی  
بیان نہ دیا جائے۔ پھر وہ خاموش ہو گئے اور اپنے سامنے  
رکھی ہوئی کتاب کو الٹ پلٹ کر کہنے لگے: "ہندوستان میں  
۵۰ یونیورسٹیاں ہیں اگر ایک یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے چھوڑ  
دی جائے تو آسمان نہ پھٹ پڑے گا۔"

میں نے ان سے پوچھا: کیا ایک یونیورسٹی مسلمانوں  
کی تعلیمی ضروریات پوری کر سکتی ہے؟ اور انہوں نے میز پر  
گوئیہ مارتے ہوئے کہا: "کبھی نہیں۔ لیکن علی گڑھ کی بات

دوسری سید بیعت ایک یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کا تعلیمی  
مرکز بھی ہے اور اس سے مسلمانوں کا تین چوتھائی صدی کا جذبات  
لگاؤ بھی ہے اس کی کچھ اسلامی قدریں ہیں اس کا ہر جلسہ  
تلاوت قرآن سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ہر ڈگری پر  
بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوتا ہے اس کا مولود گرام اسلامی طرز  
کلمہ اور اس سے پڑھ کر نکلنے والے اپنے نام کے ساتھ علیگ  
لکھنا قرنی بات سمجھتے ہیں۔

"ان تمام روایات کو اسی صورت میں زندہ رکھا جاسکتا  
ہے جب اس کے ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔  
جب ایکٹ میں ان سب کو برقرار رکھنے کی ضمانت دی جائے۔  
ایک زمانہ میں علیگڑھ کی شیروانی اور علیگڑھ کا پاجامہ  
مسلمانوں کی مجلس زندگی میں اہم مقام رکھتا تھا ایک باب علیگڑھ  
کا یہ امتیاز ختم ہو رہا ہے اور غالباً غالب ہی شیروانی پاجامہ  
میں بلوس طلبہ اور پروفیسر نظر آتے ہیں۔ یہ بات سمجھ بڑی  
طرح کھٹکتی اس لئے میں نے قیصر محمود سے جو خود یونیورسٹی کے  
روایتی لباس میں بلوس بٹے کہا: کیا آپ لوگوں کے لئے پینتھام  
کا تحریک چلانا مناسب نہ ہو گا؟"

انہوں نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:  
آکسفورڈ اور کیمبرج کا بھی ایک لباس ہے۔ اسی طرح علی گڑھ  
کا بھی ایک لباس تھا اس سلسلہ میں تین دفعہ یونین نے  
ریزولیشن پاس کر کے ایڈمنسٹریشن کو بھیجا ہے کہ وہ کوئی ایسا  
انتظام کرے کہ طلباء شیروانی میں آئیں لیکن ابھی تک کوئی انتظام  
نہیں ہوا ہے۔ اب میں نے قیصر محمود سے پوچھا: کیا ان کو ایکٹ  
کے خلاف تحریک کی کامیابی کی امید ہے؟ اور انہوں نے  
بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا: جس رفتار سے سیکرٹری  
جمہوری کمار ہمارے حق میں آ رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے مجھے  
امید ہے کہ اس ایکٹ میں مزید ترامیم کر اسے میں کامیابی ہوگی۔  
قیصر محمود کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال ہے وہ ایم اے



مسلم یونیورسٹی  
یونین کی  
علمی خدمات  
جہاں  
یونین کا  
دفتر اور  
ہوان خانہ  
بھی ہے



جاتا ہے۔ جس کی یونین کے ہال میں رام چندر جی اور کرشن جی کی بھی تصویریں ہیں۔ اور جہاں ہندو اور مسلمان طلبہ ہمیشہ سے ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں شیعہ سنی، اختلافات بھی نہیں ہیں اور یہاں کے طلبہ میں مثالی اتحاد پایا جاتا ہے۔

یہ سب کہنے کے بعد انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ نہ صرف ہندو یونیورسٹی میں اس فراخ دلی کا فقدان ہے بلکہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں کسی بھی مسلم لیڈر کی کوئی تصویر آپ کو کسی بھی دیوار پر نظر نہ آئے گی۔ اب ہمیں وائس چانسلر سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ اس لئے میں نے قیصر محمود سے اجازت چاہی۔ وہ مجھے بعد خلوص باہر تک چھوڑنے آئے اور میں یہ سوچتا ہوا وائس چانسلر ہاؤس پہنچ گیا کہ کیا مسلم یونیورسٹی دوسروں اور شکوک و شبہات کی موجودہ فضاء سے کبھی نجات پائے گی جس نے نہ صرف ہندوستان کے کروڑ مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے اضطراب کا سامان کر دیا ہے۔

دعوتی اور رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کا اضافہ مزید تعلیم کے لئے الاز ہر جاسے گا ہے۔ یونین کی خدمات کے سلسلے پر وہ مسلم یونیورسٹی بل کو لے کر آئے وہ نہ خود ان کے قول کے مطابق ان کا کوئی سیاسی کیریئر نہیں ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ ماں کی شفقت کے سلسلے سے محروم ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ایک انگریزی اسکول مائیسور میں (بھراچ) میں حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں انہوں نے گورنمنٹ انٹر کالج پیر پٹھان سے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پوری یو۔ پی میں انگریزی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ وہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں پری یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اے۔ اے آنرز میں انہوں نے ٹاپ کیا اور اس وقت بھی یونین کی مصروفیات کے باوجود ان کا تعلیمی کیریئر شاندار ہے۔ حالانکہ ان کا چہرہ داڑھی اور مونچھ کے بوجھ سے آزاد ہے لیکن وہ اسلامی مزاج رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ تعصب ان کو چھو کر بھی نہیں گزرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ اس ایکٹ کے خلاف غیر مسلم طلبہ بھی ہمارے ساتھ ہیں اس کی وجہ خود مسلم یونیورسٹی کی رواداری ہے جہاں مذاہب کا احترام کیا

درست فرمائیے۔ ۱۔ ص ۱۸ کا فورم جنوری ۱۹۷۱ء کا ۱۸



علی گڑھ  
مسلم یونیورسٹی  
کے  
موجودہ  
چانسلر  
ڈاکٹر عبد العظیم  
نے  
اپنا یہ فوٹو  
خالد ہندی  
کو  
عطا کیا



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر  
عبد العظیم علم کا بھریکراں ہیں۔ ان کی علمی اور ادبی  
جیتیت مسلم ہے، کم گوئی ان کی فطرت ہے، لیکن وہ بولتے  
ہیں تو ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں  
گھر کرتا چلا جاتا ہے اور سامع ان کی تقریر کے جادو کا شکار  
ہو جاتا ہے۔

موصوف ۲۵ اگست ۱۹۰۶ء کو غازی پور (یوپی)

میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے ایس، ایل سی امتحان  
فرسٹ ڈیزن میں پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ  
دہلی سے بی۔ اے آنرز کا امتحان فرسٹ ڈیزن میں پاس  
کیا اور ۱۹۲۹ء تک وہیں اردو اکیڈمی کے فیلور رہے۔  
اس کے بعد وہ برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے  
کے لیے جرمنی گئے اور وہاں اسلامی اسٹڈیز میں ڈاکٹر  
آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں جرمنی سے  
واپس آنے کے بعد انہوں نے بطور لکچرار جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں کام شروع کیا اور ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ نیکھو یونیورسٹی میں چلے گئے۔  
اور وہاں ۱۹۵۰ء تک عربی کے لکچرار رہے، اسی سال وہ  
علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ریڈر مقرر کیے گئے  
جہاں وہ ۱۹۵۳ء میں عربی کے پروفیسر اور مراسلات  
اسلامی کے ادارہ کے ڈائریکٹر بنے انہوں نے دین فیکلٹی  
آف آرٹس اور چیف اکیڈمک ایڈوائزر برائے یونیورسٹی  
کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ جون ۱۹۶۸ء میں انہیں علی گڑھ  
مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

پروفیسر عظیم کئی کتابوں کے مصنف ہیں ہندوستان  
کی تحریک آزادی سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے چونکہ ۱۹۳۱ء  
میں تحریک آزادی کے سلسلے میں گرفتار ہو کر ایک سال  
تک وہ جیل میں رہے اس لیے قوم پرور مسلمانوں میں ان  
کی ایک خاص جیتیت ہے اور ان کے انداز فکر میں بھی  
قوم پروری کا عنصر نمایاں ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

جناب میں تو صرف آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔  
اگر آپ سے ملے بغیر چلا جاتا تو دل میں ایک کسک سی رہ جاتی۔  
اور ملی گدھ آئینگی کوئی خوشی نہ ہوتی۔

وہ پھر مسکرا دئے۔ جیسے مسکراتا ان کی مادت ہو،  
کچھ توقف کے بعد انہوں نے میرے قیام و مقام کے متعلق  
پوچھا اور پھر خاموش ہو گئے۔

پھر میں نے اس سکوت کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی  
میں کچھ کہنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ خود پر دفیسر علیم نے فرمایا۔  
”یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟“ جی نہیں۔  
میں نے مختصر جواب دیا۔

میں چاہتا تھا کہ پر دفیسر علیم سے پوچھوں کہ مسلم  
یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلہ میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟  
ان سے سوال کروں کہ کیا نیا ایکٹ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار  
کو ختم نہ کر دے گا؟ اور ان سے دریافت کروں کہ ان حالات  
میں مسلمانوں کو آپ کا کیا مشورہ ہے؟ لیکن ملی گدھ آئینکے  
بعد مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ایکٹ پر

میں یونیورسٹی کمیس میں پر دفیسر علیم سے ان کی  
کوٹھی پر ملنے کے لیے دوبار گیا، پہلی بار وہ اس قدر مصروف  
تھے کہ مجھ کو شرف ملاقات نہ بخش سکے لیکن دوسری بار خود  
ان کے پی اے نے ٹیلی فون کر کے مجھے ملاقات کے لیے  
بلایا اور جب میں ان کے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں ان سے  
ملنے کے لیے داخل ہوا تو ایسا لگا کہ کسی تپتے ہوئے صحرے  
مکمل کر سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ گیا ہوں۔

سفید کرتے اور سفید پاچے میں بلوس پر دفیسر  
علیم نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا اور میں ان کی اس مسکراہٹ  
کی وسعت میں کھو گیا، پہلے تو انہوں نے معذرت کی کہ  
ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے وہ صبح مجھ کو شرف ملاقات  
نہ بخش سکے تھے اور پھر کہنے لگے۔ ”لکھنے میں آپ کی  
کیا خدمت کروں؟“ ان نے اس مختصر سے سوال نے میرے  
دل و دماغ میں ایک پمپل سی پیچادی، میرا جی چاہا کہ میں ان  
پر سوالات کی بوچھاڑ کر دوں، کچھ، کچیلے اور تلخ سوالات  
لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور ان سے عرض کیا۔



کنوڈکشن  
۱۹۷۹ء کا  
ایک منظر  
بائیں سے دائیں  
جسٹس ہدایت اللہ  
نواب  
احمد حیدر چٹھاری  
ڈاکٹر عبدالعلیم  
ڈاکٹر زبیر زو احمد

اور میں نے ان سے رخصت ہونے کے بعد ان کے پی اے کو  
سوالنامہ دیدیا۔

لیکن نہ جانے کیوں وہ اب تک میرے سوالوں کا  
جواب نہیں دے سکے ہیں، شاید وہ بہت مصروف ہیں،  
یا وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے؟

میں نہیں چاہتا کہ پروفیسر علیم پر عہد شکنی کا الزام  
لگاؤں، لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ایک ایسا ایکٹ  
پراہوں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی جس نے نہ صرف پوری  
ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے بلکہ پورے ملک میں ایک سو  
سا پیدا کر دیا ہے اور جس مسئلہ پر ملک کا ہر سیاست داں  
اظہار رائے کر چکا ہے اور کہہ رہا ہے۔ اگر وہ علی گڑھ مسلم  
یونیورسٹی کے دانش چانسلر نہ ہوتے تو مجھے ان سے کوئی شکایت  
نہ ہوتی لیکن ان کی حیثیت اس پورے تنازعہ میں فریق  
اول کی ہے، وہ آج کل اس علمی کتبہ کے سربراہ ہیں جو  
اپنوں اور پراپوں سب کی نظر میں ایک بڑا سوالیہ نشان  
بنا ہوا ہے۔ اس لیے پروفیسر علیم کا خاموش رہنا اس سوال  
کی پیچیدگیوں میں اضافہ تو کر سکتا ہے مگر اسے حل کرنے میں  
معاون نہیں ہو سکتا۔

جب میں پروفیسر علیم سے اپنی مختصر ملاقات کے بعد  
ان کے ایرکنڈیشنڈ کمرے سے باہر نکلا اس وقت شام کے  
سائے گہرے ہو رہے تھے تاریکی پھیل رہی تھی، اندھیرا بڑھ  
رہا تھا کہ کہیں اس اندھیرے میں مسلم یونیورسٹی ہمیشہ کیلئے  
ڈوب نہ جائے، کہیں یہ تاریکی پھیل کر رہ نہ جائے ان ملت  
کے دلوں میں نہ بس جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شام  
کی سحر نہ آئے۔ ان دوسو سو اور شکوک و شبہات  
کو لے کر میں گیسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔ جہاں میرا قیام  
تھا۔ اور گیسٹ ہاؤس کی یہ رات میرے لیے  
ہزار راتوں کے برابر بن گئی۔



اظہار رائے کے سلسلے میں ہر شخص محتاط ہے بالخصوص ذمہ  
داران یونیورسٹی ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں اس  
لیے میں نے ان تمام سوالوں کو دماغ سے نکال کر پروفیسر  
علیم سے پوچھا۔ کیا آپ اپنی زندگی کا ناقابل فراموش  
واقعہ بتائیں گے؟

اور پھر ان کے کتابی چہرے پر وہی مسکراہٹ بکھر گئی،  
انہوں نے اپنی سمجھوتی کے برائے نام بالوں کو کھجائے ہوئے  
فرمایا ”میری زندگی خود ہی ایک ناقابل فراموش واقعہ  
ہے۔ ویسے جیل کی زندگی کافی دلچسپ تھی۔“  
کمرہ میں پھر وہی سکوت چھا گیا، یہ سکوت مجھے بہت  
پراسرار لگ رہا تھا، اور اس پراسرار سکوت سے میرا دل  
گھبرا رہا تھا۔

پروفیسر علیم میرے سوالوں کا تحریری جواب دینا  
چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آپ اپنا  
سوالنامہ مجھے دے جائیے، میں اپنا جواب آپ کو بھجوا دوں گا۔“



# علی گڑھ کے چاند سر کپڑے

## ڈاکٹر شرف مرحوم کے ایک مضمون سے اقتباس

مرحوم کے دور کی سب سے محترم یادگار راجہ ہند پرست ہے

ہیں۔ راجہ صاحب نے اس دور میں برطانیہ کے غلامت کا علم بلند کیا۔ جب وطن کے رند ساء اور زمین دار دستوری احتجاج کے نام سے بھی لڑتے تھے۔ بالآخر راجہ صاحب نے وطن کو خیر باد کہہ کر رقیب طاقتوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی اور اس سلسلہ میں کابل کی پہلی آزاد ہندوستان حکومت کی بنیاد ڈالی۔ راجہ صاحب ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی اس طویل جلا وطنی سے واپس آ سکے۔

مرسید کے عہد کی دوسری نشانی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے جنہیں ہماری علی سیاست سے بظاہر کوئی علاقہ نہ تھا مگر اپنی جوانی میں وہ بڑے سرگرم کارکن تھے۔ آفتاب احمد خاں کے وطن پرورد اور حیرت انگیز افکار سے اگر آپ آشنا ہونا چاہیں تو حبیب اللہ خاں صاحب کی "حیات آفتاب" کا مطالعہ کیجئے۔ ۱۹۱۱ء میں جب "وفاداران" علی گڑھ کا دور ختم ہوا تو علی گڑھ کے نوجوانوں کی ایک فوج سیاست کے میدان میں اتری۔ ان میں حسرت موہانی، کچلا اور ظفر علی خاں اپنی اپنی بے لگ

مرحوم جگر مراد آبادی ترقی پسند شاعر سردار جعفری اور ان کی بیگم کے ساتھ



صداقت اور بے لگجراتی کے اعتبار سے بے مثل تھے جسرت  
نے تنگ کا ساتھ دیا مسلمان نوجوانوں میں سب سے پہلے جیل گئے  
اور معمولی درجے کی سہیلی کپڑے کی رسل گنج (علی گڑھ) میں دوکان  
کھولی جسرت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے  
مزدور تنظیم میں حصہ لیا۔ سوویت کے نظام کو اپنایا۔ کانگریس  
میں کامل آزادی کی تجویز پیش کی۔

کچھ بلیا نوالہ باغ اور پنجاب مارشل لا کے ہیرو کپانی کے  
مشہور مقدمہ کے مزایافتہ، مسلم لیگ اور کانگریس کے خوشگوار  
عہد کے جنرل سکریٹری رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ انقلابی نوجوانوں  
کی حمایت کی، لہذا ان بھارت سمجھا، کمیونسٹ پارٹی، نند پارٹی  
ہر انقلاب پرست جماعت کی مدد کی ہے۔

ظفر علی خاں دراصل شاعر اور ادیب اور پیدائشی انجاء  
نویس تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی  
تھی اور دھماکا جنگ عظیم، خلافت تحریک میں شریک ہوئے مگر  
نہ وہ خلافت تحریک میں کھپ سکے نہ کانگریس میں۔

ان بندگان کے بعد سب سے نمایاں گروپ مولانا محمد علی  
کلی ہے۔ جس میں آپس میں الزام۔ شعیب قریشی، عبد الرحمن،  
سندھی، خواجہ عبد المجید، تصدق شروانی، عبد الرحمن بھٹو، تانی  
عبد الغفار اور ڈاکٹر سید محمود کو مجملہ دہمروں کے شمار کر سکتے ہیں۔  
محمد علی کے گول میز کانفرنس کی آخری تقریر ہماری سیاست کی  
بہترین ترجمان ہے۔ محمد علی غالب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے  
بے دست گاہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل  
شود بیستادہ سرم کہ بہ سامان برابر است  
گویمز کانفرنس کے بعد جو دور آیا اس کے سرخیل جناح

عبد الرحمن بھٹو

جنہوں نے ایم اے او کالج سے ڈگری حاصل  
کر کے ادبی کارنامے انجام دیئے

۲۲ اود ڈاکٹر ہما گتہ ۱۹۷۶ء



## عصمت چغتائی

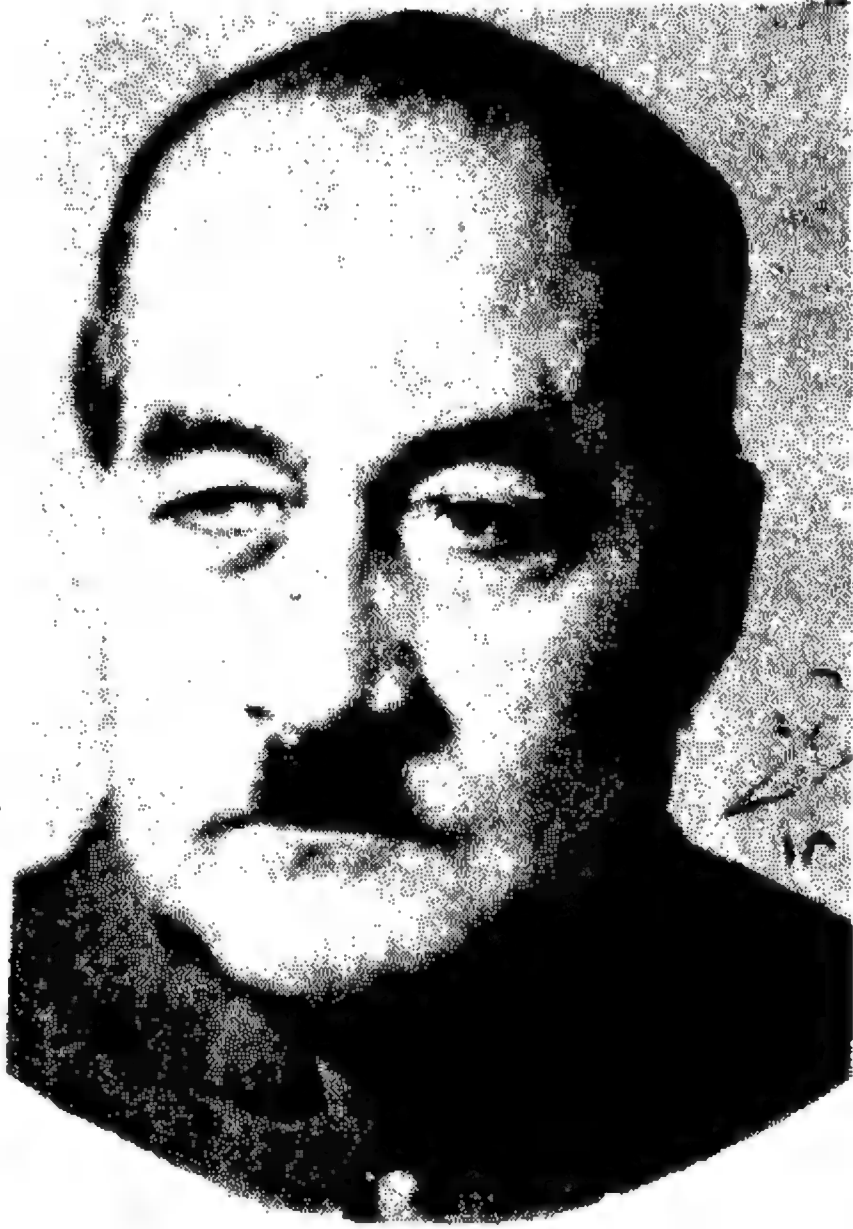
جنہوں نے جدید طرز کی محقر اردو کہانیوں میں خاصی شہرت حاصل  
کی ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں مسلم گزٹ کالج علی گڑھ سے  
گرجویشن کیا



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور شاعر  
مجاذ لکھنوی مرحوم







شبیر حسین جو شش طرح آبادی

تھے اعلیٰ گزادہ والوں کی حیثیت ندر گزرہ کی تھی۔ البتہ مسلمانوں کے قدم بہ قدم بعض ترکیبیں اٹھیں۔ ان میں خاکسار شروع میں احمدیہ آباد کے رضا کار تقسیم کے زمانہ میں نظر آتے ہیں۔ خاکساروں کے وقار کی بڑی وجہ اولاد ہوائے میاں احمد شاہ تھے اور رضا کاروں میں قائم رضوی مشہور ہیں۔

یہ فہرست ابھی ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ مغلوں کا شمار ابھی باقی ہے اور پھر ان میں طرح طرح کے سوشلسٹ ہیں۔ کوئی احمد عباس کی طرح ترقی پسند ہے جو ترقی کر کے فلم ڈائریکٹر بن گیا۔ کوئی انصار ہرداس کی طرح کانگریس سوشلسٹ بن گیا۔ کوئی جوش کی طرح شاعر ہے اور صرف اپنے آپ میں ایسے شاعروں میں آپ بجاؤ کہ، فساد نگاروں میں معصت کو، مصنفین میں رشید جہاں کو یقینی سوشلسٹوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ کمیونسٹوں میں آپ ڈاکٹر احمد کے علاوہ شرف المظہر علی، علی سردا، شبلی حسن، سید محمد ثناء کی جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر عظیم اور علی گڑھ کی نئی نسل کو آپ شامل کر سکتے ہیں۔



چودھری

خلیق الزماں مرحوم

عبدالرحمن صدیقی

اور

شعیب قریشی مرحوم

ترکی کے

روڈ بے

اور

قومی رہنما

ڈاکٹر انصاری مرحوم

کے ساتھ





اولڈ یو آئر  
ایسوسی ایشن  
کے  
جنرل سکریٹری

جائی جی اللہ جوانی

کے ساتھ  
چند لمحے

(خالد ہندو)

جگر دے کر مسلم یونیورسٹی کے پودے کو شجر سایہ دار بنایا  
تھا اس لئے اب انھوں نے گوشہ تنہائی اختیار کر لیا  
شیردانی صاحب سے میری ملاقات انکی کوٹھی  
پر ۱۳ جولائی ۱۹۷۲ء کو دن میں تقریباً ۲ بجے ہوئی۔  
علی گڑھ جا کر اگر کوئی شیردانی صاحب سے نہ ملے  
تو سمجھئے کہ اُس نے علی گڑھ کو دیکھا ہی نہیں، ان کی

شیردانی صاحب اس بڑھاپے میں بھی جوانی  
کا جذبہ رکھتے ہیں، اور آج بھی ان کے دل میں مسلم  
یونیورسٹی کی خدمت کا وہی جذبہ ہے جو جوانی کے  
دنوں میں تھا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حالات  
بدل گئے ہیں اور ان لوگوں کو جاگیردارانہ نظام کی  
علامتوں سے تعبیر کیا جانے لگا ہے جنھوں نے اپنا خون

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

۲۴ اردو ڈسکسٹیم ۱۱ اگست ۱۹۷۲ء



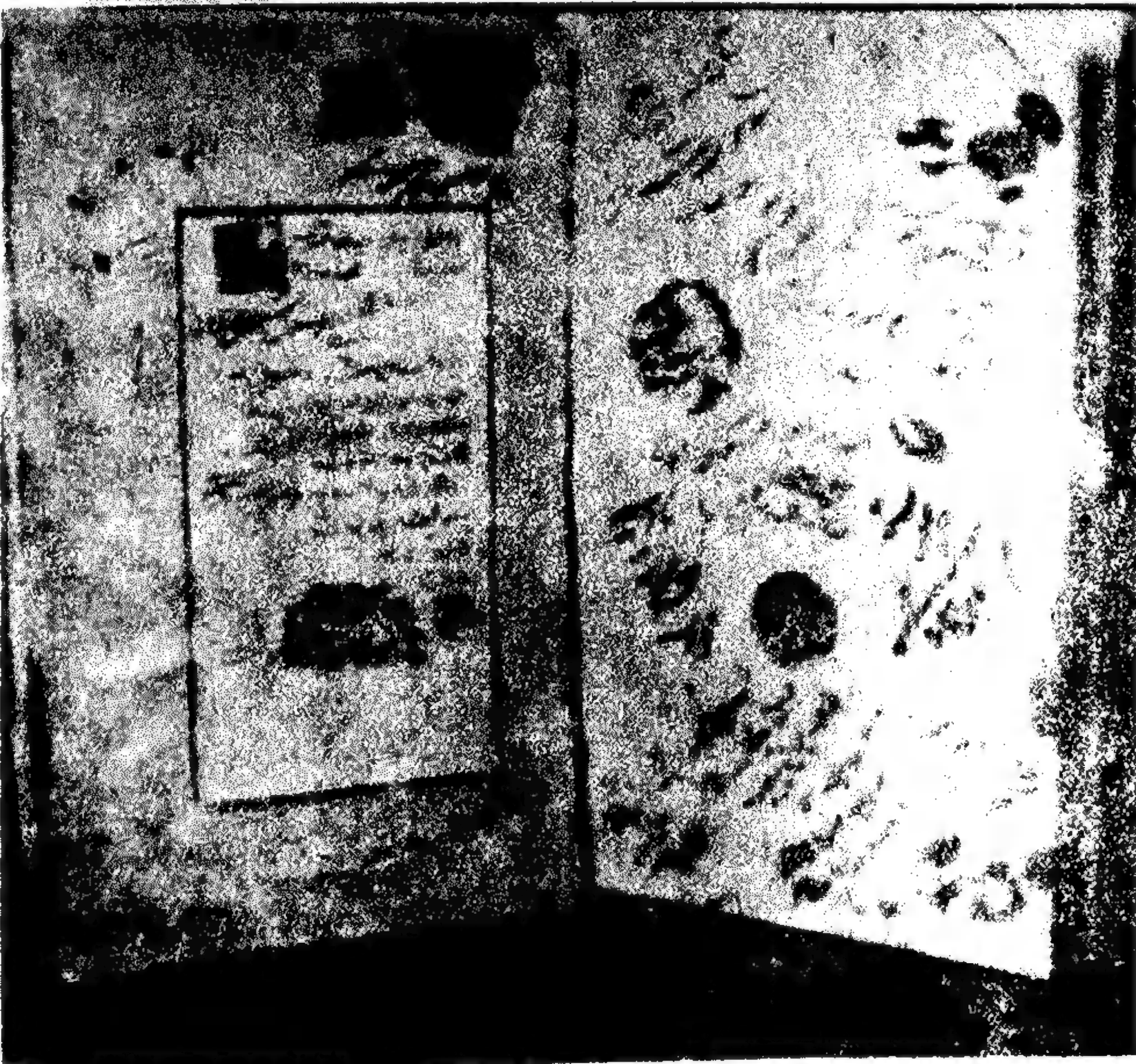
مرحوم نواب  
صدر یار جنگ بہادر  
ڈاکٹر مولانا الحاج  
محمد حبیب الرحمن خاں  
شیردانی  
جن کا  
کرد و دل روپے  
کی  
مالیت کا  
کتب خانہ  
ان کے صاحبزادے  
حاجی عبید الرحمن  
شیردانی  
نے  
مسلم یونیورسٹی کو منتقل کر دیا

زندگی علی گڑھ تحریک کی ایک مکمل کتاب ہے انھیں  
علی گڑھ کی ہر اینٹ کے ساتھ اور اس سرزمین کی  
ہاک کے ہر ذرہ سے ایک خاص نسبت ہے۔ جب  
بھی مسلم یونیورسٹی پر کوئی آفت آنے وہ سینہ سپر  
ہو گئے، ہزاروں مرحلہ پر انھوں نے اس دارالعلوم  
کی رہنمائی کی۔ وہ چار بار مسلم یونیورسٹی کے قائم

مقام وائس چانسلر رہے، خاص طور پر تقسیم ملک  
کے وقت انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر  
کی حیثیت سے جو خدمت انجام دی اُسے فراموش  
نہ کیا جاسکے گا۔

چاروں طرف سے مسلم یونیورسٹی مخالفین کے  
ترغے میں تھی، اور شیردانی صاحب اس کی





### کتب خانہ حبیب گنج مولانا آزاد لائبریری میں مثنوی گوے چوگاں طاعانی

محفوظ رکھنے میں مصروف رہتے تھے۔  
یوں تو یونیورسٹی کے لئے ان کی خدمات کی  
ایک طویل فہرست ہے لیکن کروڑوں روپے کی  
مالیت کا کتب خانہ حبیب گنج انھوں نے یونیورسٹی  
کو دے کر جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اُسے رہتی دنیا

حفاظت اس طرح کر رہے تھے جیسے طوفان میں  
پھنسا ہوا کوئی پرندہ اپنے نشیمن کی حفاظت  
کرے۔ خود ان کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ  
۲ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکتے تھے۔ اور حکام  
فصل کے ساتھ یونیورسٹی کو اثرار کے حملوں سے





مولانا  
ابنک زب  
بھی  
کتب خانہ  
جیب غنج  
کے ساتھ  
مسلم یونیورسٹی  
کو  
منتقل  
ہو گئی

نک یادرکھا جائے گا۔  
مسئلہ میں مسلم یونیورسٹی کا کیا حال تھا؟  
میں نے شیروانی صاحب سے پوچھا شیروانی صاحب  
فرمانے لگے۔ ”رات کو اٹھ کر ایک ایک ہوٹل  
میں جانا۔ طلبہ کے درمیان بیٹھ کر ان کی تشفی کا سامنا  
پیدا کرنا۔ ہر طرف خفشار تھا۔ ہر طالب علم گھر جانا  
چاہتا تھا لیکن راستے بند تھے۔ حضور نظام جید آباد  
مرحوم اپنی ریاست کے بچوں کو بلانا چاہتے تھے اور  
میں روکتا تھا کہ اگر حیدر آباد کے بچے چلے گئے تو  
دوسرے بچے گھبرائیں گے۔ آسام اور پشاور کے  
بچوں کو کیسے پہنچایا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ  
حضرت نے میری بات رکھ لی، وقت گزر گیا اور کسی  
کی تکسیر بھی نہیں پھوٹی۔“

شیروانی صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ  
”اس نازک وقت میں رفیع احمد قدوائی مرحوم  
سے بڑی مدد ملی جو ان دنوں یوپی کے وزیر داخلہ تھے۔  
اس سلسلہ میں وہ مسٹر گووند رائے (موجودہ  
مرکزی ہوم سیکریٹری) کی بھی بڑی تعریف کرتے ہیں  
جو ان دنوں علی گڑھ کے کلکٹر تھے۔“

مولوی حاجی محمد عید الرحمن خاں شیروانی  
ربیع الاول ۱۳۸۶ھ مطابق جون ۱۹۶۷ء میں بمقام

مولانا عبید الرحمن شیروانی  
اور  
سابق ڈائریکٹر چانسلر  
کتب خانہ کو  
منتقل کرنے کی  
ہم  
ادا کرتے ہوئے





مرحوم نواب زادہ ریاض علی خاں نے بھی علی گڑھ میں پڑھا تھا

حبیب گنج ضلع علی گڑھ پیدا ہوئے۔ شروع میں عربی فارسی کی تعلیم مکان پر حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک مدرستہ العلوم علی گڑھ کے اسکول میں داخل رہے اور ۱۹۱۴ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی سے میٹرک کرنے کے بعد دوبارہ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ایف اے میں داخل ہوئے۔ مگر ۱۹۱۸ء میں والد بزرگوار نواب صدر یار جنگ بہادر کے صدر الصدور امور مذہبی مقرر ہو کر حیدر آباد تشریف لے جانے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ چھوٹنے پر مجبور ہوئے اور اپنی ریاست کا کام سنبھالا۔ امور ریاست بڑی ترقی تھی اور قابلیت سے انجام دیتے اور جائزہ میں قابل لحاظ اضافہ کیا۔

سیاسی، تعلیمی اور سماجی کاموں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے۔ کئی سال تک آنریری

اسپیشل مجسٹریٹ رہے اور آخر میں اختیارات میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۲ء تک مسلسل صوبے کی آئین ساز مجلس کے ممبر رہے۔ اور ۱۹۲۲ء کے انتخابات کے ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ آئین ساز مجلس کی متعدد ذیلی کمیٹیوں پر کام کیا اور اپنی محنت اور حُسنِ کارکردگی کا سکہ بٹھایا۔ ۱۹۲۲ء ہی میں مسلم یونیورسٹی کورسٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر جلد ہی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت وقت نے ”خان بہادر“ کا خطاب عطا کیا لیکن ۱۹۳۴ء میں آپ نے یہ خطاب واپس کر دیا۔ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر منتخب ہوئے اور مسلسل ۱۹۴۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ خدمت ہمیشہ اعزازی انجام دی اور کبھی تنخواہ یا الاؤنس نہیں یا۔ اس دوران میں کئی بار قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض بھی انجام دیے۔ ۱۹۴۴ء کے پُر آشوب اور طوفانی دور میں بھی آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک ٹریژرر کے عہدے پر فائز رہے۔ فرض شناسی جانفشانی اور یونیورسٹی کے ساتھ تعلق خاطر میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس عمر میں بھی ۱۰-۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اپنی اعلیٰ پوزیشن سے کبھی اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ نہ کسی اختلافی مسئلہ میں الجھے۔ مسلم یونیورسٹی ہے ملحق تینوں اسکولوں کے آنریری میجر بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان عرصہ میں کئی سال تک فنانس کمیٹی کے ممبر رہے۔

# مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے چانسلر

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۲ء تک

- ۱۔ سلطان جہاں نیگم صاحبہ بیگم بھوپال یکم دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۳ مئی ۱۹۲۱ء تک دس سال چانسلر رہیں
- ۲۔ محمد حمید اللہ خاں نواب بھوپال ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۷ اپریل ۱۹۲۵ء تک پانچ سال چانسلر رہے
- ۳۔ میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد ۲۶ اگست ۱۹۲۵ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۳۷ء تک بارہ سال چانسلر رہے
- ۴۔ سید رضا علی خاں نواب رامپور ۳ نومبر ۱۹۳۷ء سے ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء تک پانچ سال چانسلر رہے
- ۵۔ ایچ، ایچ، طاہر سیف الدین ۱۳ اپریل ۱۹۵۲ء سے ۲۸ اپریل ۱۹۶۵ء تک بارہ سال چانسلر رہے
- ۶۔ حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری ۱۹۶۵ء سے تادم تحریر یونیورسٹی کے چانسلر ہیں

# مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پرنسپل چانسلر

۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۵ء تک

- ۱۔ ایس، ایم شاہ آغا خاں ۱۹۲۵ء سے ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء تک پندرہ سال چانسلر رہے
- ۲۔ سید ایم رضا علی خاں نواب رامپور ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء تک پندرہ سال چانسلر رہے
- ۳۔ حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری یکم مئی ۱۹۵۰ء سے دسمبر ۱۹۶۵ء تک پندرہ سال چانسلر رہے

نوٹ: ۱۹۶۵ء کے بعد سے آج تک اس عہدے پر کسی کا تقرر نہیں ہوا۔



(ادارہ)

# مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۲ء تک

- ۱۔ محمد علی محمد خاں (نواب محمود آباد)
- ۲۔ محمد منزل اللہ خاں (ایکنگ)
- ۳۔ آفتاب احمد خاں
- ۴۔ ایم منزل اللہ خاں (ایکنگ)
- ۵۔ راس مسود (جنہوں نے صبح معنی میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو طبع کیا) ۹ فروری ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء تک
- ۶۔ شاہ محمد سلیمان
- ۷۔ محمد اسماعیل خاں
- ۸۔ ڈاکٹر ضیا مالدین احمد
- ۹۔ شاہ محمد سلیمان (اعزازی)
- ۱۰۔ ایم عبید الرحمن خاں (ایکنگ)
- ۱۱۔ ضیاء الدین احمد
- ۱۲۔ نام حسین
- ۱۳۔ ایم عبید الرحمن خاں (ایمر جنسی تقرری)
- ۱۴۔ محمد اسماعیل خاں
- (جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء تک اعزازی خزانچی بھی رہے)
- ۱۵۔ ذاکر حسین خاں
- ۱۶۔ قاضی عزیز الدین بلگرامی (OFFG)
- ۱۷۔ کرنل بی، ایچ۔ زیدی
- ۱۸۔ بدر الدین طیب جی
- ۱۹۔ علی یادو جنگ
- ۲۰۔ پروفیسر عبدالعلیم
- دسمبر ۱۹۲۰ء سے فروری ۱۹۲۲ء تک وائس چانسلر رہے
- مارچ ۱۹۲۲ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء تک
- یکم جنوری ۱۹۲۳ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء تک
- یکم جنوری ۱۹۲۴ء سے ۸ فروری ۱۹۲۴ء تک
- ۹ فروری ۱۹۲۴ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء تک
- یکم جولائی ۱۹۲۵ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء تک
- یکم اکتوبر ۱۹۲۵ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء تک
- ۲۰ اپریل ۱۹۲۵ء سے ۲۹ اپریل ۱۹۲۵ء تک
- ۳۰ اپریل ۱۹۲۵ء سے ۲۳ اپریل ۱۹۲۵ء تک
- جون ۱۹۲۹ء سے جولائی ۱۹۲۹ء تک
- مارچ ۱۹۳۱ء سے اپریل ۱۹۳۱ء تک
- ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء سے ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء تک
- ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء سے ۷ اگست ۱۹۳۱ء تک
- ۸ اگست ۱۹۳۱ء سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء تک
- ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۳۱ء تک
- ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۱ء تک
- آپ اعزازی خزانچی کے عہدے پر بھی ۳۰ نومبر ۱۹۳۱ء سے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء تک مامور رہے۔
- نومبر ۱۹۳۹ء
- ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء سے ۱ نومبر ۱۹۶۲ء تک
- ۷ نومبر ۱۹۶۲ء سے ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء تک
- یکم مارچ ۱۹۶۵ء سے ۵ جنوری ۱۹۶۸ء تک
- ۶ جنوری ۱۹۶۸ء سے تادم تحریر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں

(جواہر خواجہ)

یادوں کے چہرہ کوں سے

ایک اے او کا بج کی زندگی

اٹھوا بیہوش سے ہر حال تک

کو روشن کر چکی ہیں۔ جہاں کے طالب علم اپنے نام کے ساتھ  
ان یونیورسٹیوں کا نام شامل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔  
اگر آج دنیا کے ہزاروں عظیم سائنس دان، شاعر، مصنف،  
لیڈر اور سیاست دان اپنے نام کے آگے "آکسن" اور  
"ازہری" لگانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو یہ بھی ایک  
حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے درجنوں ملکوں میں ہزاروں لیڈر  
سیاست دانوں، شاعروں اور مصنفوں کو اپنے نام کیساتھ  
"میلک" لگا کر فخر حاصل ہے۔

سرمد کا خواب حقیقت کس طرح بنا رہا جانے  
کیلئے ہمیں یہ جانتا ضروری ہے کہ وہ کیسا ماحول تھا، وہ  
کیا خوبیاں تھیں جنہوں نے ایم۔ اے او کا بج کی زندگی  
شہرت یافتہ مسلم یونیورسٹی بنا دیا۔ آئیے ہم آج سے سو سال  
پہلے کے مسلمان شیل کا بج میں واپس چلیں اور وہاں کی  
دیکھیں اور سبق آموز زندگی کا مطالعہ کریں۔  
"آکسن اور ڈاکٹر کیمبرج کے چرچوں کی طرح ہر کانچ

"شاید لوگ میری باتوں کو شیخ چلی کا خواب سمجھتے  
ہوں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہم ایم۔  
اے او کا بج کو آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی عظیم یونیورسٹیوں  
کی صف میں لا کر دکھائیں گے۔" یہ تادمہ خواب جو  
آج سے سو سال پہلے ایک دیوانے نے دیکھا تھا۔ اور واقعی  
اس وقت اس خواب کی حیثیت شیخ چلی کی بڑے زیادہ نہیں  
تھی۔

لیکن آج جب دنیا کے چند عظیم ترین تعلیمی مرکروں  
کا نام لیا جاتا ہے تو مسلم یونیورسٹی کا نام سرفہرست ہوتا ہے۔  
برطانیہ کی آکسفورڈ اور کیمبرج، امریکا کی واشنگٹن اور  
بارورڈ، روس کی ماسکو اور نیٹل، مصر کا جامعہ ازہر،  
پیرو کی امریکن یونیورسٹی اور ہندوستان کی علیگڑھ  
مسلم یونیورسٹی دنیا کی وہ چند عظیم ترین تعلیمی مرکز ہیں جہاں  
علم حاصل کرنے کیلئے دنیا بھر سے علم کے پیاسے جوق در  
جوق چلے آتے ہیں۔ جہاں سے علم کی کرنیں پھوٹ کر پوری دنیا



کی اپنی ایک مسجد ہوگی، بورڈنگ ہاؤس ہوں گے جس میں ہر طالب علم کو ایک سونے کا کمرہ، ایک پڑھنے کا کمرہ، غسل خانہ وغیرہ دیا جائے گا۔ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرے۔ غیر مسلم طلباء پر بیابندی عائد نہیں ہوگی۔ مسلم طلباء کا لباس سفید پانجامہ، کالی ٹیروانی اور لال فیض کیپ ہوگی۔ ہر طالب علم کو مغربی انداز کے جوتے اور مونے پہننے ہونگے، کالج میں دعوتی پہننے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لفظ "جھوٹے" کا استعمال بھی گالی کے برابر سمجھا جائیگا اور اس کے استعمال کو خوالے کو سزا دی جائیگی۔ کوئی بڑی سزا یا ایسی سزا جس سے طالب علم کی خودی پر آخ آئے نہ دی جائیگی۔ غلطی کرے والے طلباء کو پنج پر کھڑے ہونے یا گھر سے زیادہ کام کر کے لانے کی سزا دی جائیگی۔ چھوٹے لڑکوں کو پنج پر کھڑا کر کے کاغذ کی ٹوپی پہنا دی جائیگی جس پر لکھا ہوگا۔ شیعہ اور سنی لڑکوں کو ہاسٹل یا کالج میں اپنے مذہبی اختلافات پر بحث کرنے کی قلمی اجازت نہیں ہوگی۔

جب کالج شروع ہوا تب اس میں صرف ایک ہی بورڈنگ تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ایچ، آئی، سڈن کو ہیڈ ماسٹر بنایا گیا اور جناب جے ماسٹر پر سادو کیکنڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

بورڈنگ طلباء کی معاشی حالت کے مطابق تین حصوں میں بنا ہوا تھا، اول درجے کی کل فیس بارہ روپے ماہوار تھی۔ دوسرے درجے کی سات روپے اور تیسرے درجے کی صرف ۳ روپے ۸ آنے ماہوار تھی۔ کالج کی انتظامی کمیٹی میں ۲۲ ممبر تھے جن میں سے ۶ ہندو تھے۔ فرسٹ ایر کی کلاسیں ۸۷، ۸۸ میں شروع کی گئیں۔ کالج کے پہلے گریجویٹ تحصیل کیر کے فری ایجووے صارف تھے اور کالج کے پہلے ایم۔ اے شری ابھار سادو

بورڈنگ ہوا۔ یا۔ جوان  
مرد ہو۔ یا۔ عورت  
ابھی کہانیاں اور دل کش افسانے سبھی پسند کرتے ہیں۔

کیا آپ نہیں پسند کرتے؟  
ہر نوع کی دلچسپ کہانیوں کے لیے

## واقعات

بلاشبہ سب سے اچھل۔ سب سے حسین  
اور سب سے ارزاں ماہانہ رسالہ ہے فولو آفٹ  
کی صاف ستھری بال تصویر چھپائی عام شمارے  
۱۱۶ صفحات اور قیمت صرف ۲۰ روپیہ کافی کافی  
نمبر ۱۸ صفحات اور قیمت صرف ۲۰ روپیہ کافی کافی  
لیکن سالانہ خریداروں سے ایک سال  
کے ۱۲ شماروں کی قیمت صرف ۱۲ روپے معنی عام  
شمارے اور خاص نمبر دونوں کے لیے صرف  
ایک روپیہ فی کافی۔

آج ہی ۱۲ روپے کا منی آرڈر بھیج کر ایک سال  
تک عام شمارے اور خاص نمبر گھر بیٹھے حاصل کرتے  
رہتے۔ معرکتہ آرا کہانی نمبر تمام ایسے خریداروں کو بھیجا  
جا چکا ہے۔ اور آئندہ شائع ہونے والے تمام خاص نمبر بھی  
بھیجے جائیں گے۔

نمونہ۔ صرف ایک روپے کا منی آرڈر بھیج کر طلب کیجئے۔  
جس ماہ کا شمارہ موجود ہوگا بھیج دیا جائے گا۔

— مینجر "واقعات" نئی دہلی ۱۳ —



تھے۔ کالج شروع میں صرف یہ مضامین پڑھانا تھا۔

(۱) انگلش، عربی، فارسی، اور سنسکرت۔

(۲) منطق، فن خطابت، فلاسفی اور مہترسی۔

(۳) قدرتی فلاسفی، حساب اور قدرتی سائنس۔

(۴) اسلامی قانون اور شیعہ سنی اسلامی تعلیمات۔

کالج کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ شروع میں

طلباء کو امتحان دینے آگرہ جانا پڑتا تھا جو کلکتہ یونیورسٹی کا

قریب ترین مرکز تھا۔ لیکن آگرے کے مقامی طلباء کے

بڑے بڑے بڑے بڑے سرسید نے بی۔ اے کے طلباء کو

کلکتہ اور انٹرلس کے طلباء کو الہ آباد بھیجنا شروع کر دیا۔

دن میں تین مرتبہ حاضری لی جاتی تھی۔ صبح ۷ بجے

کمروں میں، شام کو ۷ بجے مسجد میں اور گرمیوں میں رات

کو ۸ بجے سردیوں میں رات کو ۶ بجے کمروں میں۔ کالج کے

ادقات میں طلباء کو اپنے کمروں میں جانے کی اجازت

نہیں تھی۔

۱۸۸۰ء میں فرسٹ کلاس بورڈنگ کی فیس بڑھا کر

۱۳ روپے کر دی گئی۔ بیس (Basis) میں صبح ناشتے میں

چائے اور بسکٹ، دوپہر کے کھانے میں تین چھٹانگ گوشت

اور روٹی۔ شام کو چائے اور بسکٹ، رات کو گوشت اور

روٹی اور اس کے علاوہ ہفتے میں تین بار پلاؤ دیا جاتا تھا

دوسرے درجے کے طلباء کو پلاؤ ہفتے میں صرف دو بار

اور گوشت صرف دو چھٹانگ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ

انہیں ہر مہینے مٹی کے تیل کی آدمی بوتل بھی دی جاتی تھی۔

اسکے لیے انہیں آٹھ روپے دینے پڑتے تھے۔ تیسرے

درجے کے ہوسٹل میں صرف دال اور سبزی دی جاتی تھی۔

اور انہیں صرف ۵ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کے کینڈی ہال میں محمد فدا حسین (مشہور آرٹسٹ) کی بنائی ہوئی چند تصویریں



(مرتبہ و فرخ بھالی)

# نسب نامہ سرسید احمد خاں مرحوم

سید دوست محمد

سید بربانی

سید محمد عطاء

سید محمد قباذ علی خاں ہمدی  
حیدرآباد چلے گئے تھے


میر متقی (وفات ۱۸۳۸ء)

جواد الدولہ میر محمد جواد علی خاں ہادی  
وفات ۱۸ شعبان ۱۲۳۵ھ

بیگم صفیہ

جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ

پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء



وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء

سید محمد  
سید محمد احمد

سید حامد

امت العزیز

سید محمود  
پیدائش ۲۷ مئی ۱۸۵۰ء  
وفات ۱۹۰۲ء

احمدی بیگم

سید اس مسعود

محمدی بیگم جیا

انکی شادی مرزا محمد حید سے ہوئی  
عطیہ

ان کی شادی ممتاز کھلاڑی اور  
سفیر ایم و این مسعود سے ہوئی

سید انور مسعود سید اکبر مسعود نادرہ بیگم زوجہ احسان رشید

شہزاد مسعود شیر ناز مسعود سید احمد مسعود سید محمود مسعود

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

۳۴ اردو ڈائجسٹ ہماگست ۲۰۰۲ء

## کالج اور افواہیں ۱۔ کالج اور سرسید کے مخالفین

ذرا دیر بھی تو خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ سرسید نے کالج اپنے رشتہ داروں کو نوکری دلانے کیلئے کھولا ہے اور وہ خود یہاں سے بہت زبردست تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں یہ افواہ لائی گئی کہ سرسید نے نماز کے لیے اذان دینا بند کرادی ہے۔ اور نماز کے وقت کی اطلاع گھنٹہ بجا کر دی جاتی ہے۔ ۱۸۸۱ء میں طلباء کے والدین کو سیکڑوں خطوط بھیجے گئے جن میں لکھا گیا کہ زلزلوں کی وجہ سے کالج کی عمارت گر گئی ہے اور طلباء کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۱ء میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ کالج فنڈ کمیشن نے فتویٰ دیا ہے کہ طلباء کو نماز پڑھتے وقت ایک دوسرے سے بات کرنا بھی اجازت ہے اور نماز پانچ وقت کی بجائے اب صرف دو وقت پڑھنی ضروری ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی افواہ اڑائی گئی کہ نماز میں رکوع اور سمجھے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور طلباء کو بغیر اس کے ہی نماز پڑھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ کٹر مذہبی لوگوں کی اس مخالفت کی وجہ سے کئی سال تک کالج کے طلباء کی تعداد میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

## کالج کی پہلی ہڑتال ۱۔ کالج میں طلباء کی پہلی ہڑتال فروری ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ کچھ طلباء اور ڈانٹنگ

ہال کے بیروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ سرسید نے تحقیقات کے بعد کچھ طلباء کو کالج سے نکال دیا۔ طلباء نے سرسید سے یہ آرڈر واپس لینے کی درخواست کی جسے انہوں نے نامتور کر دیا۔ اسپر طلباء نے ہاسٹل خالی کر دیا اور رسل گنج میں کمرے کرانے پر لیکر رہنے لگے۔ جناب ولایت حسین اور پروفیسر ریٹے نے بات چیت کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اگلے دن پرنسپل بیک طلباء سے ملے اور انہیں پولیس

ایکشن کی دھمکی دیکر ہاسٹل واپس لے آئے۔ مولوی مسیح اللہ کو تار دیکر مراد آباد سے بلایا گیا۔ طلباء نے سرسید اور دوسرے استادوں سے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

ہر بدھ کی صبح کو کالج میں مباہتے ہوتے تھے۔ یہ مباہتے مہینے میں تین بار انگریزی میں اور ایک بار اردو میں رکھے جاتے تھے۔ پہلے مباہتے کا ٹاپک تھا۔ "تعلیم نسواں کی ضرورت ہے، لیکن گھر میں روک کر نہ کہ کالج یا اسکول میں جا کر۔"

کالج میں کرکٹ ٹینس اور فٹ بال بہت زور شور سے ہوتا تھا۔ کالج کی پہلی کرکٹ ٹیم کے کپتان پروفیسر راماشنکر مشرا تھے۔ ہر جمعہ کچھ رکھتے جاتے تھے۔ ہر آدمی سے پانچ پیسے لیے جاتے تھے۔ اور سب کو کھانے کے لیے تے ہوئے خشک میوے اور بسکٹ دئے جاتے تھے۔

ٹینس کی شروعات ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹر فیض الدین نے کی تھی۔ ٹینس کلب کا نام چارپائی کلب تھا کیونکہ یہاں ٹینس کے جال کی جگہ پر چارپائیوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

## کالج کی زندگی کا ہنگامہ خیر دور ۱۔ ۱۹۲۰ء میں

خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون کا دور کالج کی زندگی کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیر دور تھا۔ اب تک کالج کے طلباء انگریزوں کی اندھی تقلید کرتے تھے اور یونین جیک کے پورے پورے وقادار ہوتے تھے۔ لیکن اب اس اندھی وقاداری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ۱۱ اکتوبر کو گاندھی جی اور علی برادران (مولانا محمد علی شوکت علی) علیگڑھ آئے۔ ۱۲ اکتوبر کو گاندھی جی نے ۴ گھنٹے تک مسلم اسٹوڈنٹ کلب میں تقریر لی۔ انہوں نے طلباء سے کالج کا بائیکاٹ کرینگی اپیل کی۔ ۱۳ اکتوبر کو زیادہ تر طلباء نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور یونین کلب میں



کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۲ طلباء نے نئے کالج میں شامل ہونا منظور کیا۔ بدر بڈنگ میں کچھ خیمے لگا کر کالج کی شروعات کی گئی۔

کالج مکمل تباہی سے اس لیے بچ گیا کہ زیادہ تر طلباء کو امتحان دینے تھے اس لیے ان کے واسطے نئے کالج میں شامل ہونا ممکن نہ تھا۔

۹ ستمبر ۱۹۲۰ کو یونیورسٹی بل پاس کیا گیا اور اس طرح اینگلو اورینٹل کالج، مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ راجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد کو پہلا وائس چانسلر منتخب کیا گیا۔

اور اس طرح ایک شیخ علی کا خواب جیتی جاگتی حقیقت بن گیا۔

جمع ہو گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی آتش بار تقریروں نے طلباء میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک آگ بھڑکادی۔ ۲۳ اکتوبر کو مولانا آزاد، علی برادران، حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ اور دوسرے لیڈروں کی ایک میٹنگ کالج کی مہدی میں ہوئی جہاں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۹ اکتوبر سے ایک قومی کالج جو برطانوی اثر سے آزاد ہو گا شروع کیا جائے گا۔

۲۹ اکتوبر کو کالج کی مہدی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ



# سیر کی لوحِ شریف

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے سیر  
اس جہن کے غمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ  
اے کہ تیری روح کا طائرِ نفس میں ہے سیر  
فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدہٴ تقریر دیکھ  
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تسلیم دیں  
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں  
ترک دنیا قوم کو اپنے نہ سکھانا کہیں  
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھڑ  
رنگ پر جو آب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھڑ

تو اگر کوئی مدتب ہے تو سن میری صدا  
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبائے  
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا  
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پر وائے تجھے

بندہٴ مومن کا دل بیم ورجا سے پاک ہے  
وقتِ فراں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر اتھوں میں تیرے خامہٴ معجز رقم  
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو  
شیشہٴ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم  
ہونہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگادے شعر کے اچھاڑے  
خرمنِ باطل جلا دے شعلہٴ آواز سے

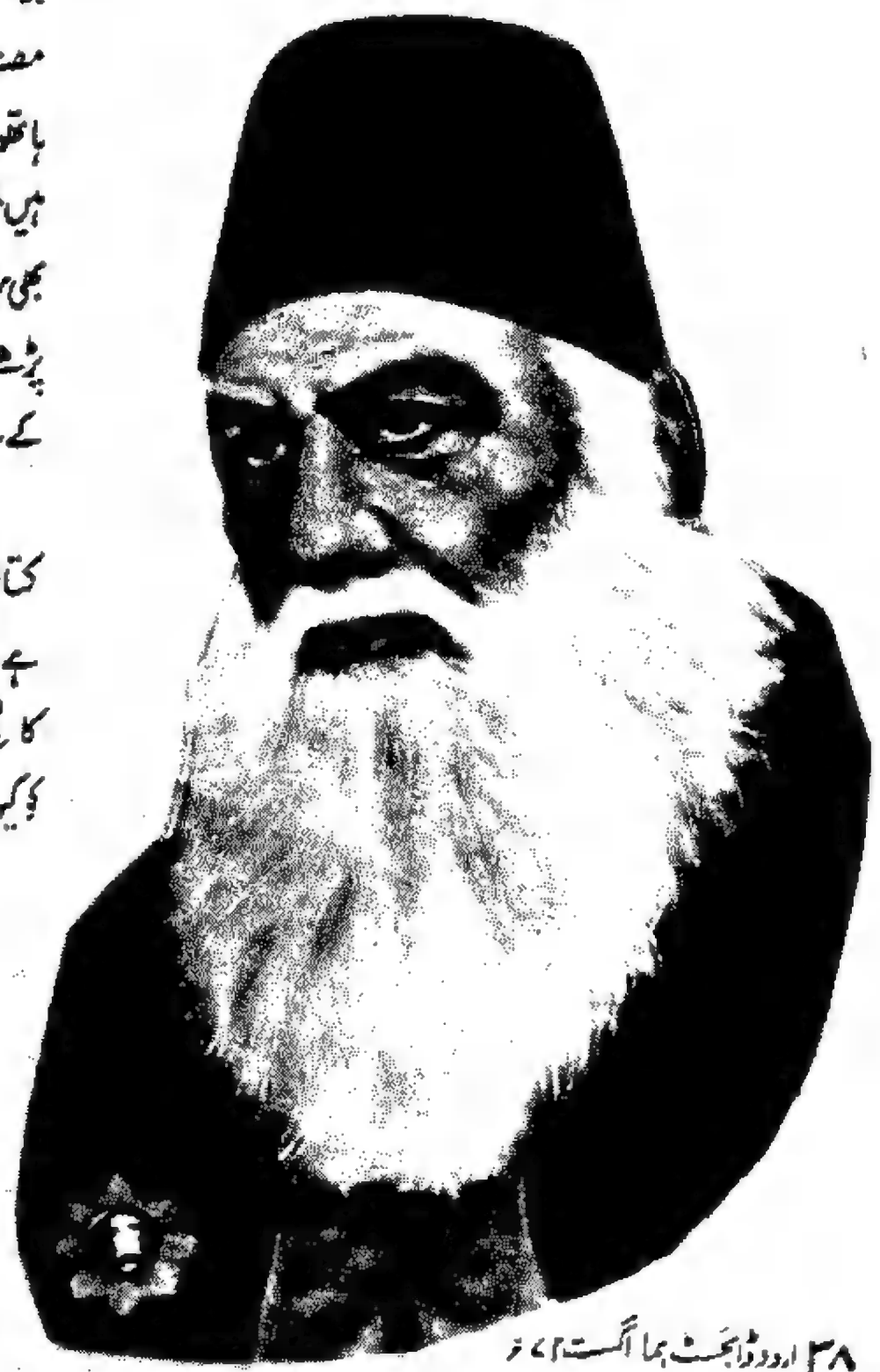
اقبال

# سیراجہ خان

آپ سے

## مخاطب

(ماخوذ)



پورے اس خطاب عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں، تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو مختلف علوم کو پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ مقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے ساتھ پیرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پرکار اور محکم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

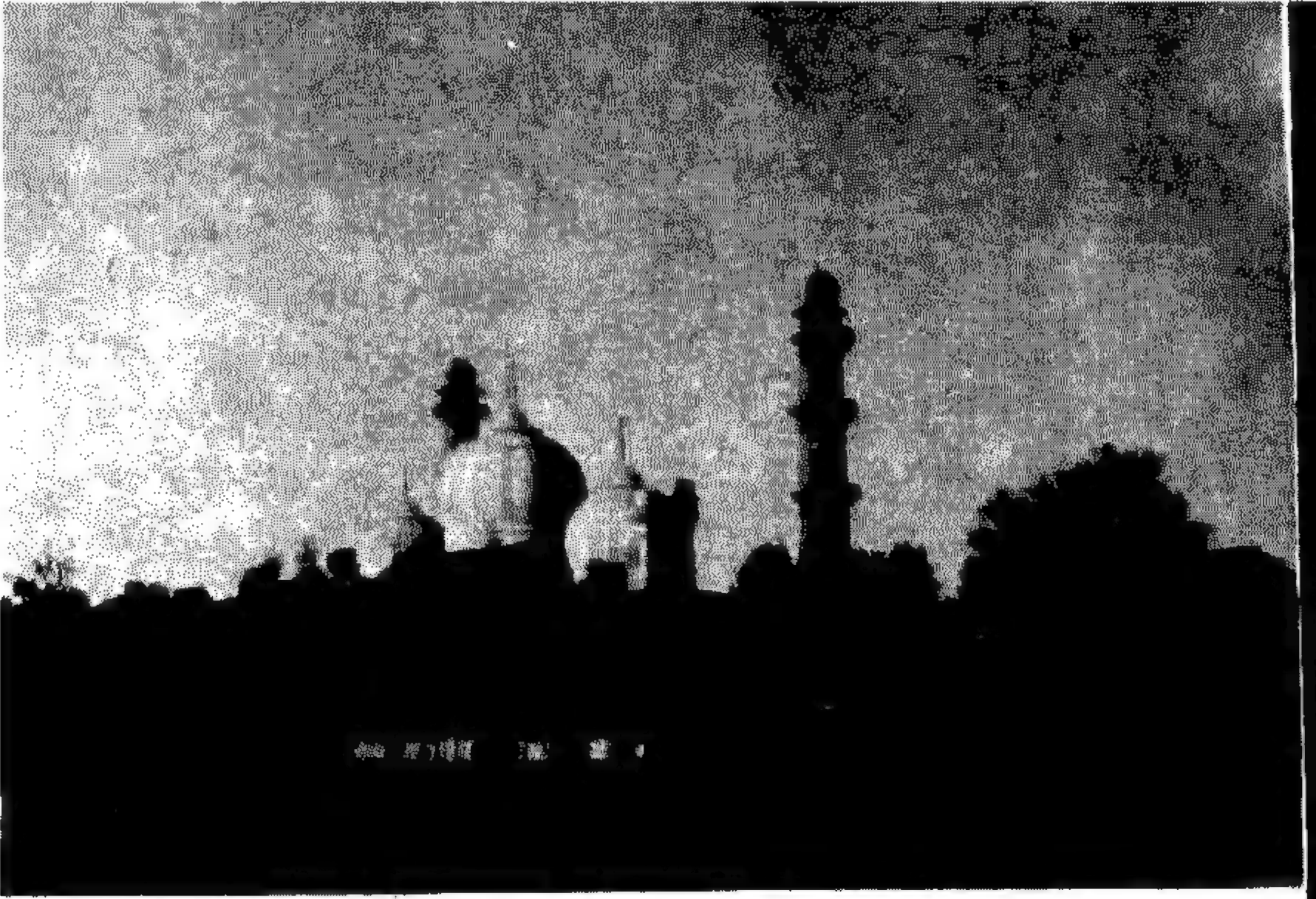
اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے کالج لائف، یانی



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خیر





مسلم یونیورسٹی کی مسجد کا ایک ایمان افروز منظر۔ یہ تصویر مسجد کی پشت سے لے گئی ہے جس سے متحدہ کریکٹ گراؤنڈ ہے

کے ساتھ نہ بڑی تو تم نے اس پہلے اہول کو کہ تم سب ایک عاقل  
ماں کے بچے ہو تو زور دیا۔

بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی۔ اگر اس  
کے پرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام  
کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اور اس نے اس سے فائدہ اٹھانے  
کے لئے تمہارا درست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔  
تمہارا کھانا، پینا، رہنا، پہنا آپس میں ہر وقت ملنا سوسنا  
میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا، تفریحی جلسوں  
میں شریک رہنا یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور  
دوستی، ایک دوسرے کی ہمدردی ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے  
پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا منظر تمہارے سر ہوگا  
اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو، اسی  
عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔ (مقالات مرستہ ص ۷۸-۷۵)

زندگی یہی اصل کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا  
اصلی فائدہ اور اصلی مقصد زندگی کا اور اس کا لچ کا ہے  
اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہارا  
آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔  
ورنہ اسکی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے  
بہتر ہے۔ اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیونکر  
فائدہ اٹھانا اور اس کو کیونکر گزارنا چاہئے؟

سب سے اوّل اور تمام ہر کتوں کی جڑ تمہارا آپس میں  
سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے  
ہوں یا پنجاب کے، پنجاب کے ہوں یا کچھم کے، اتر کے ہوں یا  
مکھن کے جب وہ سب تمہاری عاقل ماں (کالج) کی گود میں  
پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ  
مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے

علیگٹھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اردو ترجمہ ۱۱ اگست ۱۹۶۰ء

میں نے یہ درس گاہ کیوں قائم کی، میرے دوستو! آپ نے اپنے ایڈریس میں محمد ن اینگلو اوری اینٹل کلچ علی گڑھ کا ذکر کیا ہے مجھ کو افسوس ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کلچ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کلچ کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تہذیب اور محتاج ہوتے جاتے تھے ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہلتا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی بحال پر ہے پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہو گا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تہذیب کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمد ن اینگلو اوری اینٹل کلچ کے قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کلچ میں دونوں بھائی ایک ہی تعلیم پاتے ہیں۔ کلچ کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہ ابھی امتیاز نہیں ہے مرنے والی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کلچ میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور برادر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ تقریر بمقام لاہور ۳ فروری ۱۸۸۴ء (لیکچرول کا مجموعہ ص ۱۹۸)

تقریر امرتسر۔ مدرستہ العلوم بے شک ایک ذریعہ قوی ترقی

کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرستہ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لئے اور جو اس وقت کے محرومی ان کو یوں پہنچا سانس (SCIENCE) اور لٹریچر کے حامل کرنے میں تھی اس کو دفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیشنل ہندوستانی کہلاتے جاتے ہیں۔ اسی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذات سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذات سے ہندوؤں کی ذات سے پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پیئیں ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل حرقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جاویں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا مگر میرا کیا مقصد تھا کہ میں اس کو انجام دے سکتا میں ان لوگوں کا شکریہ ادا ہوں جنہوں نے اس میں مدد کی۔ اس مدد میں مسلمانوں کا اس قدر شکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنہوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرستہ کی علامت کی دیواروں اور محرابوں پر یہ ہے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے دماغ ہندو مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی؟

تقریر امرتسر ۲۶ جنوری ۱۸۸۹ء (لیکچرول کا مجموعہ ص ۱۶۷)  
علی گڑھ کی اقامتی زندگی کے متعلق میرا خواب ہم سے لوگ باہر ادا پوچھتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مجوزہ میں جو بڑے رہیں گے وہ کیونکر تربیت پائیں گے۔ ہم اس مدرستہ العلوم کو محمد یونیورسٹی یعنی دارالعلوم اسلامی بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کمبریج کی یونیورسٹی کی (جس کو ہم دیکھ آئے ہیں) نقل اتانا چاہتے ہیں۔ جو ان کے ان مکانات (ہوسٹل) میں سکونت اختیار کریں



کو جھوٹا کہہ بیٹھے گا تو وہ بہ منزلہ شگ سخت کے سمجھا جائے گا۔  
تمام طالب علم ایک کمرہ میں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائے گا۔  
گے۔ تمام چیزیں کھانے کی وقتاً فوقتاً پکائی جائیں گی اور  
ہر موسم کا یہ بھی لڑکوں کو مناسب طور سے دیا جائے گا اور ہر  
ہفتہ میں ایک خاص کھانا خود لڑکوں کی فرمائش سے پکایا  
جائے گا جس کو وہ خود اپنی کڑھ رائے سے قرادیں گے بشرطیکہ  
بہ لحاظ موسم کے وہ صحت کو معزز نہ ہو۔

لڑکوں کو صفائی سے رہنے کی نہایت تاکید ہوگی۔ کسی  
لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ گسٹے اور کٹاری لگا ہوا یا بازار کا  
رنگا ہوا رنگین دیم رنگ یا ایسا باریک جس میں سے بدن دکھائی  
دے یا ایسا رنگ جس سے چوچی اور پیٹ نظر آئے کپڑا پہنے۔  
کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بہت بڑے بڑے  
بال جو کان کی لو سے زیادہ نیچے ہوں سر پر رکھے یا کاکلیں بنائے  
یا پٹیاں جلائے یا مسی لگائے یا انگوٹھی دھلتے پہنے یا کسی انگلی  
پر ہندی لگائے۔

لڑکے جو فقیر کریں گے ان کو کسی قسم کی سزا سنائی جائے گی یا  
ایسی سزا جس سے رفتہ رفتہ غیرت جاتی رہے نہیں دی جائے گی۔  
جھوٹ بولنا گو وہ کسی ہی خفیہ بات میں کیوں نہ ہو ایک  
بہت بڑا جرم سوسائٹی کا سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی کو جھوٹا کہہ  
بیٹھنا جرم سوسائٹی سمجھو جو گاؤں کو اس شخص سے جھوٹ ہی کیوں  
نہ لولا ہو۔

خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب جس کا نام انشوار الٹ  
تعالیٰ شل کیمبرج کی کلب کے یونین کلب کہلائے گا علمی باتوں اور  
دنیاوی علوم میں مباحثہ ہوا کرے گا اور قواعد ایچ بی بی بی بی بی  
کیمبرج یونین کلب میں ہیں۔

مدرسہ کی بنیاد جس دن رکھی جائے گی وہ دن ہمیشہ مدرسہ  
کی سالگرہ کا ہوگا۔ اس دن ہمیشہ مدرسہ کی یادگاری کے لئے مجلس  
اور خوشیاں کی جایا کریں گی۔

گے ان پر اسی طرح جس طرح کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں  
پر گرجا میں جانا اور نماز میں شریک ہونا ضروری ہے اپنی اپنی  
مسجدوں میں جانا اور نماز میں شریک ہونا فرض ہو گا یہی لڑکوں  
کو پانچ وقت کی نمازوں میں حاضر ہونا اور نماز جماعت سے  
پڑھنا واجب ہوگا اور شیعہ لڑکوں کو صرف تین وقت اس لئے  
کہ وہ ظہر و عصر، مغرب و عشاء ساتھ پڑھ لیں گے۔

جس قدر طالب علم آکسفورڈ، کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں  
پڑھتے ہیں ان کو ایک قسم کا کوٹ اور ایک قسم کی ٹوپی ملتی ہے  
تاکہ ایک قسم کا لباس سب کا ہو جائے اس سے نہایت عمدہ  
فائدہ ہے یہ جن کا بیان اس مقام پر ضروری نہیں۔ مدت معلوم  
کے طالب علموں کو بجائے کوٹ کالے ایکہ کا نیمہ آستنی چھ  
لال ترکی ٹوپی دی جائے گی۔ تمام طالب علم جب مدرسے میں یا  
کتب خانے میں یا محلات خانے میں یا اخباروں کے کمرے میں  
آئیں گے تو بغیر اس چن اور ٹوپی کے آنے کے مجاز نہ ہوں گے۔  
لڑکوں کے پڑھنے اور کھیلنے اور کھانے اور سونے اور  
نہانے اور کپڑا بدلنے کے سب وقت معین ہوں گے اور ہر ایک  
لڑکے کو اس وقت وہی کام کرنا ہو گا جو اس وقت کے لئے مقرر  
ہے۔ یہاں تک کہ جو وقت سونے کا ہے اگر طالب علم چاہے کہ  
میں اس وقت پڑھوں اور تھوڑی دیر کے بعد سوؤں تو وہ ایسا  
نہیں کرے گا بلکہ اس کو ضرور ہو گا کہ سونے کے وقت پر سو  
رہے۔ اگرچہ بالفرض نیند نہ آئے تو پلنگ پر آنکھیں بند کئے  
پڑا رہے۔

کھیلنے کے لئے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہونگے  
اور جو کھیل جس کو پسند ہو گا وہ اختیار کرے گا۔ گھوڑے پر چڑھنا  
بندوق چلانا، تیرنا یہ سب کام بھی مناسب طور پر اور اندازہ  
پر سکھایا جائے گا۔

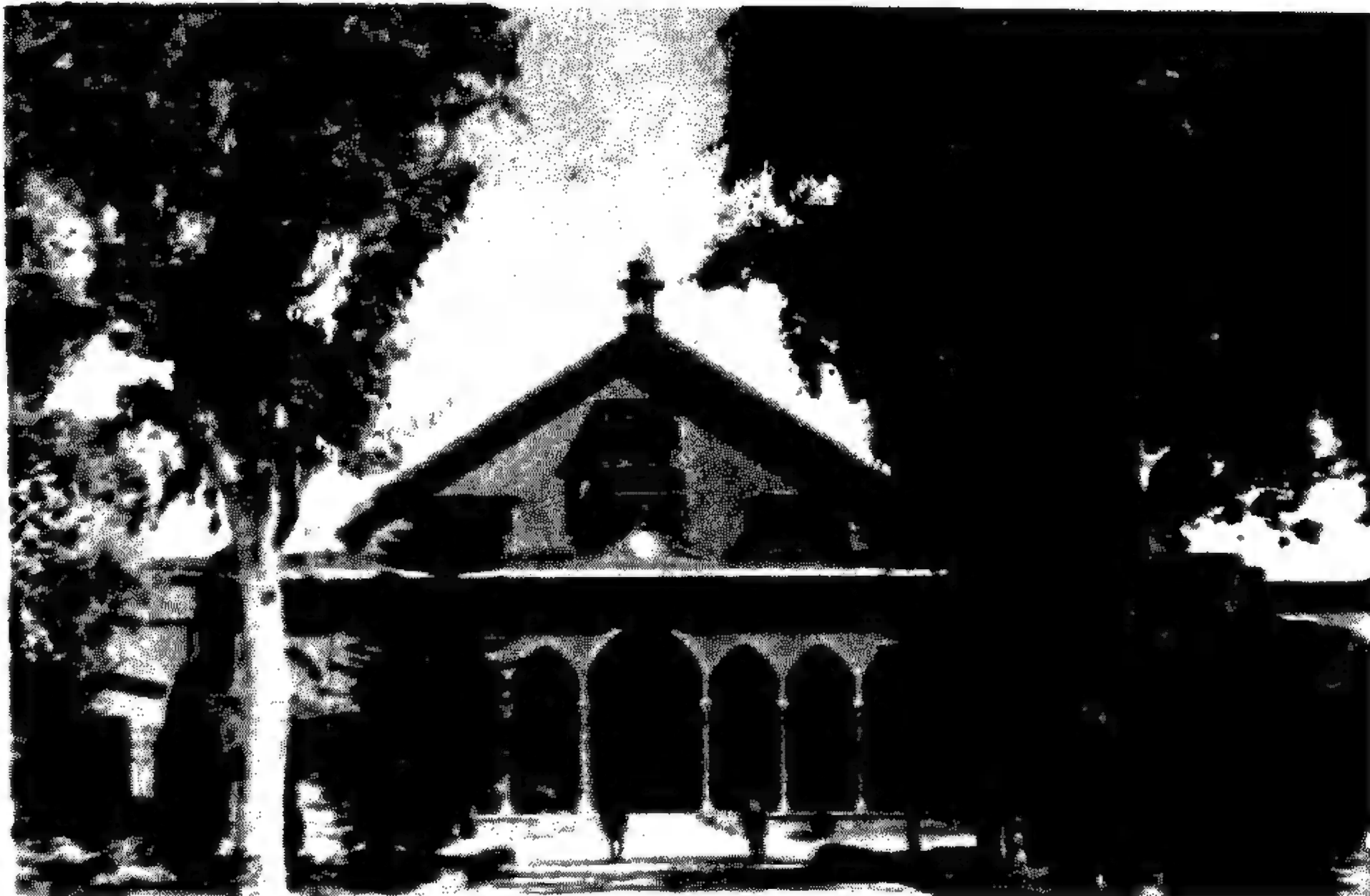
الفاظ بد جو لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں ان کو  
بولنے کا سخت امتناع ہو گا یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی

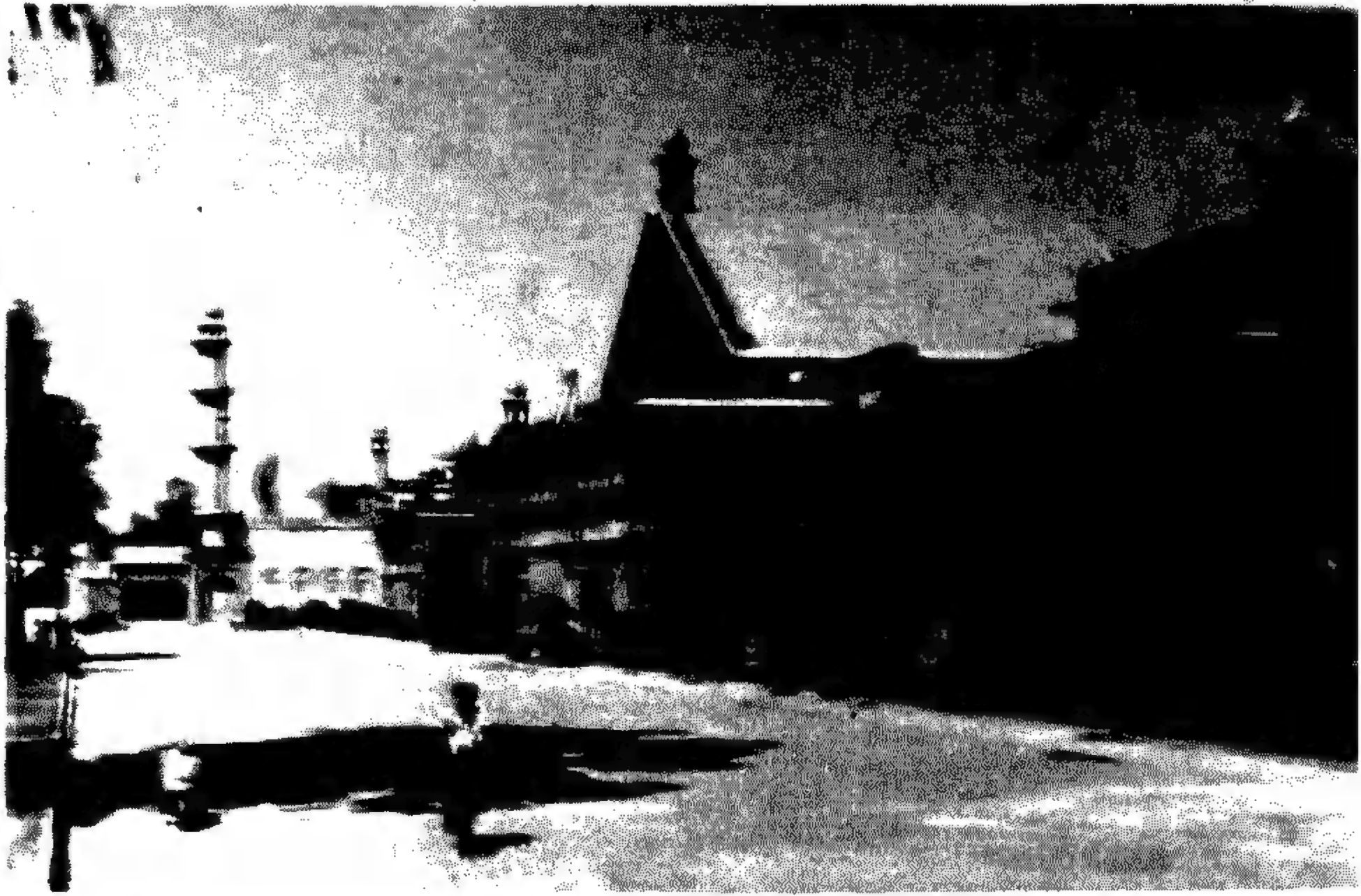


یہ سب باتیں ابھی تو مثل ایک خواب کے ہیں یا تو خدا نخواستہ وہی مثل ہوگی کہ اتنے میں آنکھ کھل گئی یا انشاء اللہ تعالیٰ بعینہ اس کا ظہور ہوا اور ٹھیک تعبیر ہوئی۔ ہم کو خدا سے امید ہے کہ ٹھیک تعبیر ہی ہوگی۔ (تہذیب الاخلاق بابت یکم رجب ۱۲۸۹ھ) میرے خواب کی تعبیر یہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر چلو اور ہمارے کالج کے ان پیارے عزیز بچوں کو دیکھو جو بطور بورڈ کے دبا رہتے ہیں جن کی صورت دیکھ ہمارے دل میں پیار آتا ہے جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے۔ ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے اس کا تماشا دیکھو۔ باپ سے زیادہ ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ ہماری فحشگی سے کوئی چیز ان کو زیادہ رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری جھڑکی، ہمارا ہانچنا، ہمارے ہاتھ کی سنٹی سے ان کو عزت اور نصیحت ہوتی ہے مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب و تنبیہ کو۔ چلو

ہمارے عزیز مگر ہمارے باہٹ افتخار مولوی مسیح اللہ خاں کا حال دیکھو کہ بورڈوں کے پیچھے کس طرح اپنی جان لگائے ہوئے ہے کسی بورڈ کی بیماری میں ان کی بے قراری کو دیکھو اور اندازہ کرو کہ آیا باپ کو اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ خود اپنی آنکھ سے چل کر دیکھو کہ جو محبت اور سرپرستی مولوی مسیح اللہ خاں بورڈوں کی کرتے ہیں۔ آیا کوئی باپ اپنے بیٹے کی بھی کرتا ہے۔ یادش بخیر مولوی مشتاق حسین کا جو حال بورڈوں سے تھا وہ تو عجائبات دنیا سے کچھ کم نہ تھا۔ گو کہ دنیاوی ترقی اور دنیاوی عزت بہت کچھ ہے، خدا اور زیادہ کرے مگر میری آنکھ میں جو عزت دین و دنیا میں ان کو بورڈوں کی نعمت سے نصیب تھی۔ اس کے مقابلہ میں حیدر آباد کی عزت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ چلو اور مولوی محمد کریم صاحب اور مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب اور مولوی محمد اکبر صاحب کا حال دیکھو کہ بورڈوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ ایسا بورڈنگ

سلمہ یونیورسٹی کی پہلی عمارت اسٹریچی ہاؤس کے سامنے کا منظر





امریکی ہاں کا ایک اور دلکش منظر جس کے پس منظر میں یونیورسٹی کی مسجد کے گنبد اور مینارے نظر آ رہے ہیں

اور کچھ نہ کر سکو گے۔ تم اگر مر جاؤ گے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں ترپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو، مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو، کافر، ملحد، پجری۔ میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواست گار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم انہیں پر رجم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پھٹا مانہ پڑے۔

پھر بمقام لدھیانہ ۲۳ جنوری ۱۸۸۳ء (پنجین کا مجموعہ ص ۱۵۹)

ہاؤس البتہ ہماری قوم کے بچوں کو تربیت دینے کے قابل ہو سکتا ہے مگر افسوس اسے ہماری قوم کے بزرگوں کو کم توان کی قدر نہیں۔ خدا تم کو ایسا دل دے کہ اس کی قدر کرو اور ایسی بھرتی دے کہ تم اس کو پہچانو۔ یہ پھر بمقام پٹنہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء (پنجروں کا مجموعہ ص ۱۴۲-۱۴۱) مصر پرستوں سے میری گزارش، اسے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو۔ ان کی آئندہ کی زندگی اچھی طرح بسر ہوئے گا سامان کرو مجھ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے تم ان کی اتر حالت کو دیکھو گے اور بے چین ہو گے۔ وہ لوگ

**ہندوستانی ایک قوم ہیں۔** ہرانی تاریخوں میں اور پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یہ ہیں مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں۔ مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گوان میں دھڑلے کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں۔ مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گوان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اسے ہندو اور مسلمانوں کا کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو، تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ درہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔

پیکر بمقام گورداسپور ۲۷ فروری ۱۸۸۴ء

(پیکروں کا مجموعہ ص ۱۷۶)

**ہندوستان کی رہنے والی ایک قوم۔** لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیسا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں یہی مختلف روایات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ہندو یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔

"جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص

اسی قوم کی پیروی کی دل سے فکرتھی۔

تقریر بمقام لاہور ۳۱ فروری ۱۸۸۴ء

(پیکروں کا مجموعہ ص ۱۹۹)

**سیکولر ازم کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں۔** جو لوگ کہ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی پر کوشش کریں کیونکہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام قواسم تمام اعضاء کے مجموعہ و سالم رہتے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور پیروی بغیر ملک کی زندگی یا پوری ترقی ناممکن ہے۔

اسے میرے دوستو! تمہارے ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں جس طرح کہ انسان میں بعض اعضاء رئیسہ ہیں اسی طرح ہندوستان کے لئے دو ہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضاء رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہتا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دوحصہ ہیں اس کے دل کا خیال یا عقیدہ خدا کا حصہ ہے اور اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اس کے بنائے جنس کا حصہ ہیں۔ پس خدا کے حصہ کو خدا پر چھوڑ دو اور جو تمہارا حصہ ہے اس سے مطلب رکھو۔

اسے عزیزو! ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جیتے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک ہی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں



عادتیں لے لیں یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں  
نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی۔ جو نہ ہماری زبان تھی  
ندان کی پس اگر ہم اس حصے سے جو کہ ہم دونوں میں خدا کا حصہ  
سے قطع نظر کریں اردو حقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بالعموم  
اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی  
ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و  
پیش رفت ممکن ہے۔ اور آپس کے اتفاق اور ہمدردی ایک  
دوسرے کی بددعا ہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔  
انہوں نے ان لوگوں پر جو اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔

پتھر بمقام پٹنہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء

(پگڑوں کا مجموعہ ص ۱۳۳-۱۳۴)

میرا سیکولر طریقہ کار۔ آپ نے اپنے ایڈریس  
میں میری ان خدمتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو میں نے اس زمانہ  
میں انجام دی تھیں جبکہ مجھ کو قانونی کونسل کے ممبر ہونے کی عزت  
حاصل تھی۔ میں اس بات کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا ہوں کہ مجھ  
کو پورا یقین ہے کہ مجھ سا شخص ہندوستان کی قانونی کونسل کی  
ممبری اور جو بڑی جوابدہی اس ممبری سے متعلق ہے اس کو اپنے  
ذمہ لینے کے لائق نہ تھا۔ میں خود ان مشکلات سے واقف تھا۔  
جو میرے عداوت میں حاصل تھیں مگر باوجود اس کے میری یہ دلی  
تمنا تھی کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی وفاق و امداد کے ساتھ خدمت  
کروں۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے  
یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔  
میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا  
مذہبی عقیدہ کیسا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے  
ہیں لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو  
ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم کے  
زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں ہم سب  
قوت کی معیتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منبر

ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں  
ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ہندو یعنی ہندوستان میں رہنے  
والی قوم۔ جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو  
خاص اسی قوم کی پیش رفت کی دل سے فکر تھی۔ مجھ کو اس بات سے  
نہایت مسرت ہوتی ہے کہ آپ میری ناپسندیدہ باتوں کی اس قدر  
وقت کرتے ہیں اور اب میں آخر میں خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگتا  
ہوں کہ وہ ہماری قوم کو جس کی تعریف میں نے ابھی بیان کی ہے  
علی ترقی عطا فرمائے جس کے ذریعہ سے ہماری قوم اور ہمارے  
ملک میں روشنی پھیلے اور آپ کی ایسوسی ایشن کی کوششوں کو  
کامیاب کرے اور نیز آپ کی تمام کوششوں اور کاموں میں  
آپ کا معاون ہو۔

تقریر بمقام لاہور۔ انٹرن ایسوسی ایشن کے

ایڈریس کے جواب میں۔ ۳ فروری ۱۸۸۳ء

(پگڑوں کا مجموعہ ص ۳-۴)

دینی اور دنیاوی امور ملائے نہیں جاسکتے۔  
دنیا میں دو قسم کے امور ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرے جسمانی  
یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور  
دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں چند معتمد باتوں کو جن کا  
اخلاق پر زیادہ تر ہے اور گودہ دنیاوی ہوں، بیان کر دیتا ہے  
کوئی شبہ نہیں کہ اسلام بھی جو بیشک ایک سچا مذہب ہے اسی  
اصول پر مبنی ہے اور ہمارے رسول مقبول کا یہ قول کہ ما اتاکم  
من امر دینکم فخذوه و ما اتاکم منہ فانتهوا  
اس پر دلیل کافی ہے اور قریب زمانہ نبوت میں اسی اصول  
پر عمل درآمد رہا۔

مقالات مرتبہ (ص ۶۹)  
صحیح اتحاد کیا ہے۔۔۔ برادران من ایکٹائی  
اور ایک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے  
عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدہ پر چڑھ جائیں۔ یہ امر تو قانون قدرت  
کے برخلاف ہے جو ہو نہیں سکتا۔ نہ پہلے کہیں ہوا اور نہ آئندہ

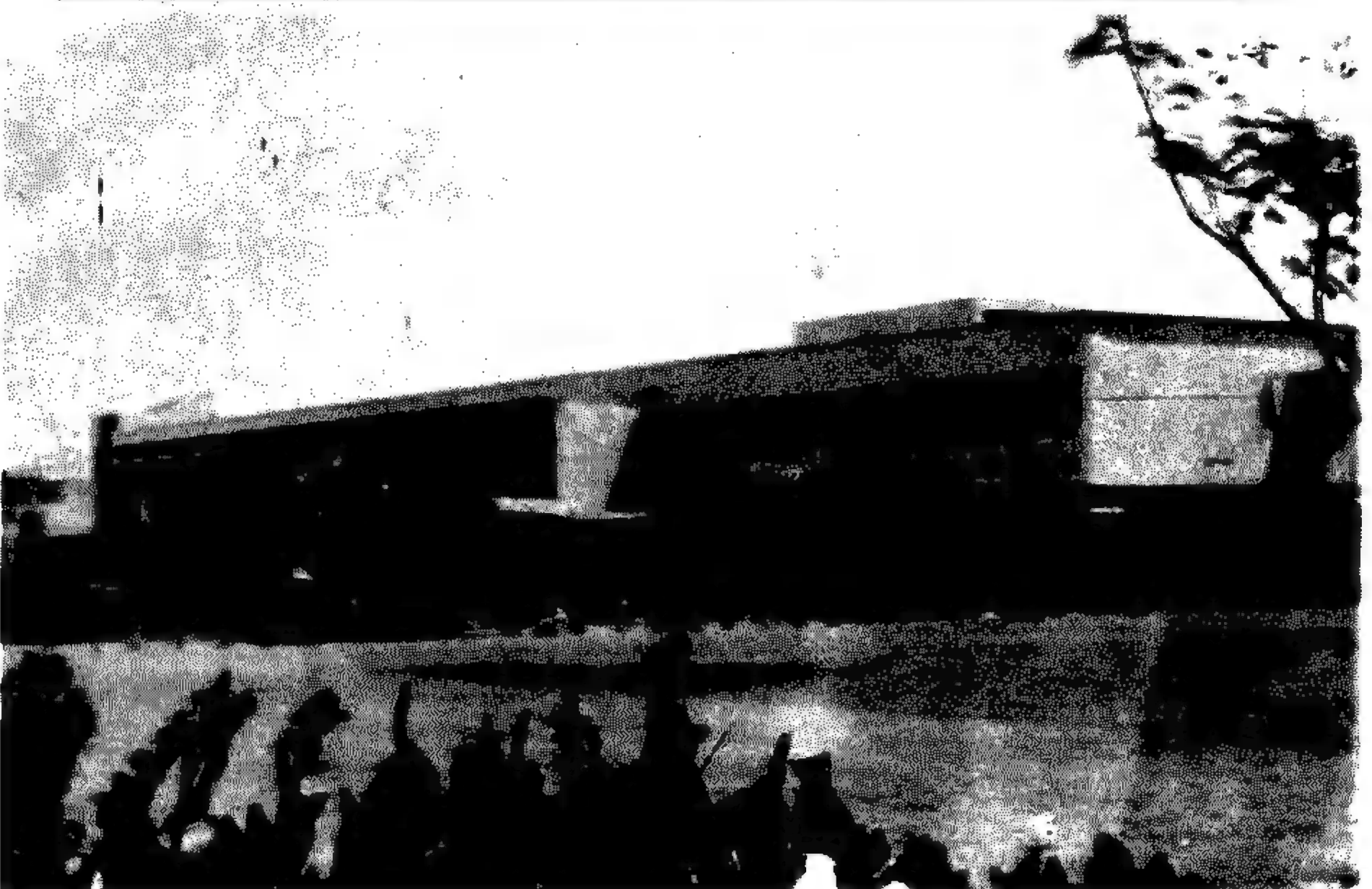
اردو راجنٹ پبلیکیشنز

کبھی ہوگا مگر اس اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقل اور عقلی راہ ہے جس کی پیروی کسی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر کرے گا تو اپنے میں دو حصے پاوے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنا جنس کا۔ انسان کا دل اور اس کا اعتقاد یا مختصر طور سے یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھائی یا برائی ہو اس کا معاد اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے نہ بیٹا نہ دوست نہ آشنا نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے کچھ تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔

ہم کو یہ بات بھی بھونی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطن بھائی ہیں۔ بہت سے

تہذیبی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی زمین پر ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی۔ دکن کی ہو یا ہمالیہ کی ہم دونوں رہتے ہیں۔ اسی ملک کی ہو اسے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چاہی نہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی و ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔ ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں۔ ایک خدا کا دوسرا اپنا حصہ جنس کا۔ خدا کا حصہ خدا کے لئے چھوڑ دو اور جو حصہ ہم میں اپنا حصہ جنس کا ہے اس سے غرض رکھو تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار ہو۔ آپس میں سچی محبت، سچی دوستی، دوستانہ بردباری رکھو کہ دونوں قوموں کی ترقی کرنے کا یہی

یونہی سنی یا لی ملک۔ جو جدید طرز تعمیر کا ایک حسین مرقع ہے





دکنور یہ گیٹ۔ اس دو منزلہ عمارت میں مسلم یونیورسٹی کے مختلف دفاتر ہیں، یہ عمارت انگریزی اور ہندوستانی طرز تعمیر کا دلکش سنگم ہے۔

داسہ ہے۔ پکرمقام لدھیانہ ۲۳ جنوری ۱۸۸۳ء (پکروں کا مجموعہ ص ۱۵۱-۱۵۰) تہذیب کیلئے جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو ضروری ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کوئی چاہئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال



ہیں آج۔ اسے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہئے:-

آزادی رائے:- مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور سومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی۔ اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آئے گی۔

عقائد مذہبی:- ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد بھی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شریک ان کے دلوں میں ہیں۔ پس اپنے عقائد کو ہیئت اسلام کے مطابق کرنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔ خیالات و افعال مذہبی:- ہندوستان کے مسلمانوں میں صد با خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ پس ہم کو مذہب ہونے کے لئے ان کی تہذیب دیکار ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں۔ ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لئے داخل کیا ہے کہ قوم کے مذہب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔ تعلیم اطفال:- مذہب کے بعد جو چیز سب سے ضروری ہے وہ تعلیم ہے ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کر ایک ایسا طریقہ تعلیم متعین کرنا چاہئے جس سے علوم دینی اور دنیوی اور دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔

عورتوں کی تعلیم:- کچھ شبہ نہیں کہ قوی تہذیب و شائستگی کے لئے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم

کوڑھ کیوں کی تعلیم کے لئے اور ان کو دوست کاری سکھانے کے لئے کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔

سامان تعلیم:- ہمارے لئے صرف طریقہ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد اور جمعی ہمت اور فیاضی سے اس کا مروسا مان بھی جتیا کر دینا ہوگا۔ ہنر و فن و حرفہ:- اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلا نا اور ترقی دینا، قومی تہذیب کے لئے ایک بڑا جزو ہے۔

مندرجہ بالا باتیں وہ تھیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی ہیں۔

قوم میں کس طرح ترقی کرتی ہیں:- آداب ہم بالا جمل ان وسیلوں پر غور کریں جن سے قوموں کی دانائی اور علوم اور تعلیمی کے اقبال کو ترقی ہوتی ہے۔ اس امر عظیم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجہ کے دریافت کرنے کے لئے ہم کو ان قوموں کے اگلے اور پچھلے حال پر نظر کرنی چاہئے جو آج کے دن فنون اور علوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر مدد رکھتی ہیں جیکہ ہم اگلے زمانے اور حال کے زمانے کی تاریخ پر متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہو اور اس نے علوم و فنون میں بزرگی اور عظمت حاصل کی ہو، ایسے شخصوں یا قوموں کی چند مثالیں ہیں جنہوں نے خود آپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یا علم ایجاد کیا یا اس کو تحقیق کیا اور پھر اس کو اس کے ہر درجوں میں پہنچائے گئے اور آخر کار اس کو کمالیت کی بلندی پر پہنچا دیا مگر عموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم تو کسی بات کو تحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس کی تحقیقات کو اس سے لیتی ہے اور پھر اپنی محنت اور استقبال سے اس کو کمالیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔ پہلے زمانہ میں ہم کو (مسلمانوں کو) فلسفہ

حکمت کا کچھ علم نہ تھا۔ اول میں ہم نے ان کو یونانیوں سے لیا اور اپنی محنت اور استقلال سے ان کو اس اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جس کی شہادت ہمارے مصنفوں کی کتابیں دے رہی ہیں۔ ہندو اگرچہ قدیم سے علم میں ایک بڑا درجہ رکھتے ہیں لیکن معتبر پرانی تاریخوں سے جواب بھی موجود ہیں اور اے کاش کہ حکمت تک وہ ہمارے پاس رہیں، معلوم ہوتا کہ ان کو وہ درجہ افتخار صرف انہیں کی ذاتی قویٰ عقلیہ سے حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اس سبب سے ہوا تھا کہ ان کو ایک ہمسایہ کی قوم سے جو ان کے شمال مغرب کی سرحد پر تھی۔ بخوبی راہ درگم حاصل تھی، اپنے ملک سے قطع نظر کر کے ہم کو صرف تاریخ انگلستان پر جو اس زمانہ میں تربیت کا ملجا و ماوا ہے نظر کرنی چاہئے۔ اس غرض سے کہ ہم دریافت کریں کہ انگریزوں نے جو کچھ ان کو حاصل ہے اس کو انہوں نے خود آپ ہی آپ نہیں سیکھا ہے بلکہ علوم و فنون کا جو ان کو علم ہے وہ بہت سی صورتوں میں ان کو دوسری قوم سے حاصل ہوا ہے اور انہوں نے اپنی تیز فہمی اور بڑی مستقل محنت سے کامیت کے نہایت اعلیٰ درجہ پر جس میں وہ مبتلا رہے ہیں پہنچا دیا ہے۔ غرض کہ قوموں کی دانائی کی ترقی کچھ تو خاص انہی کی اور کچھ اور قوموں کی محنتوں اور کوششوں سے ہوتی ہے تو میں بھی اسی طرح سے جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پالتے ہیں اس طرح کہ جو ان کے پاس ہے اور ان کو دیں وہ جو کچھ ان کے پاس نہیں ہے وہ اور ان سے لیں۔ اسی اصول پر دنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد ہے پس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ ٹھہادیں گے اور کاپی اور سستی اور خود غرضی اور ہم وطنوں کی غیر خواہی سے بے پرواہی کی حالت میں جس میں وہ اب دکھائی دیتے ہیں اور جس میں بدبختی سے وہ

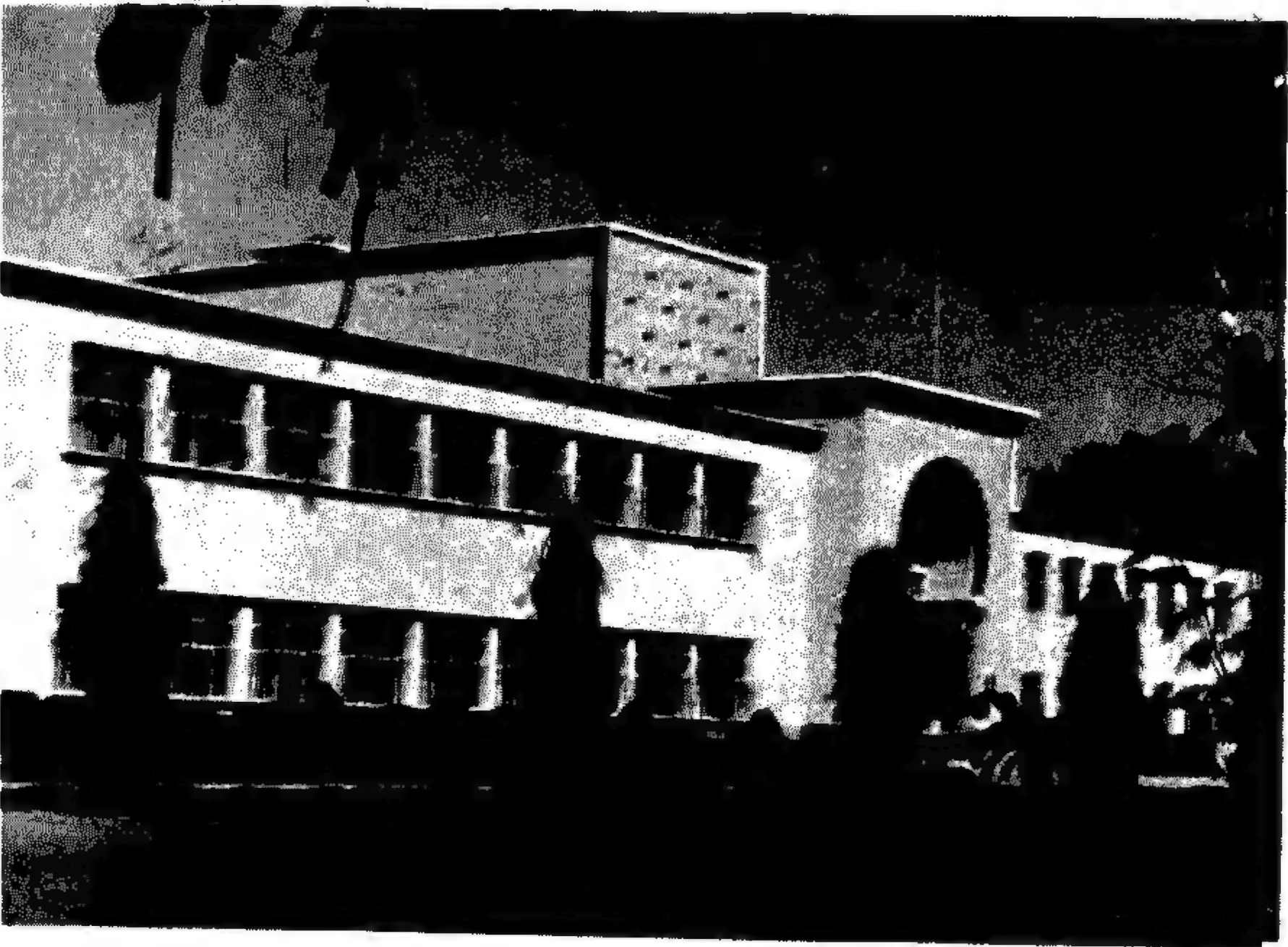
آپڑے ہیں پڑے رہنے پر ماضی رہیں گے اس وقت تک ان کی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ پس آؤ ہم مستند ہوں اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے اور ان کو بخوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھادیں اس مژدے پنے کی کاپی کی حالت میں سے نکلے کہ جس کی مدد بروز ہم میں ترقی معلوم ہوتی ہے ہر برس جو گزرتا ہے ایک نئی شکل پیدا کرتا ہے اور ہر برس وقت کو زیادہ کرتا ہے۔ اے مسلمانو! تم ہمیشہ سے مستعدی اور چالاکی اور ذہانت اور علم و فضل میں نامی ہو۔ اے ہندوؤ! تم قدیم الایام سے مشکل علوم کے ایجاد میں مشہور ہو۔ اب تم دونوں کو کس بدبختی سے ٹکرا رہے جس سے تم اپنے بزرگوں کے ناموں کو بھی ڈبوتے ہو۔ ایک نہایت فحالت کا دھبہ اپنے اوپر لیتے ہو۔ جاگو اور ہوشیار ہو اور اس پر امن وقت کو غنیمت سمجھاؤ اپنے بزرگوں کی طرح علوم و فنون کے حاصل کرنے میں مستعد ہو کر اپنے بزرگوں کے ناموں کو آفتاب کی مانند روشن کر دو۔

(الہامس بخدمت ساکنان ہندوستان علیہ السلام غازی پور ص ۱۲۵) نیاموڈ اور اس کے تقاضے۔ ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے جموں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں مگر اس زمانہ میں فی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانہ کے فلسفہ و حکمت کی تحقیقات سے بالکل غلط ہے۔ اب مسائل طبعی تجربہ سے ثابت کئے جاتے ہیں اور وہ ہم کو دکھائیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل سے اثبات کیے جادیں۔

بکر بمقام لاہور یکم فروری ۱۸۸۴ء

(بکروں کا مجموعہ ص ۸-۱۲)

ملک کی اقتصادی ترقی کیسے ہو سکتی ہے ملک کی تجارت اور دولت مندی کا اصول کیا ہے؟ وہ ملک



سولانا آزاد لائبریری کی جس میں قدیم و جدید علوم پر لاکھوں کتابوں کا خزانہ محفوظ ہے۔

دوسرے ملک کی چیز اپنے ملک میں لانٹے ہیں۔ ہم دیریا کے کنارے پر بلکہ اس زمانہ میں اپنی دکان سے چند قدم حاصل سے ریل کے اسٹیشن پر چار آنے کی چیز سوا چار آنہ پر بیچ ڈالتے ہیں یا وہیں پر اس طرح سے خرید کر اپنے ملک میں بیچتے ہیں۔ سمندر کے اندر ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے۔ غیر ملکوں سے ہمارا رشتہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملک میں آڑہست اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجہ کے تاجر ہوں۔ ملک کی پیداوار، قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑتی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ روپیہ کو کبھی اس پتیلی میں اور کبھی اس پتیلی میں ڈالنے سے روپیہ نہیں بڑھ

دوست مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ وہ ملک دوست مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت کو دوسرے ملکوں میں ترقی ہوتی ہے۔ آج کل وہی ملک دوست مند ہو رہا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی چیزیں اگرچہ دوسرے ملک میں جاتی ہیں مگر محنت کی قیمت بڑھا کر پھر اسی ہندوستان میں آجاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی چیزوں کی نسبت بھی ہم لوگوں کی تجارت ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک یا ایک شہر سے دوسرے شہر تک محدود ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی گرہ کھاتا ہے۔ ہم لوگ اپنی چیز دوسرے ملک میں نہیں لے جاتے



کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جزائیہ حساب اور ہندسہ پر، نہایت بے جا ہے۔

(حیات جاوید ج ۸۵ ص ۸۵)

**تعلیم سیاسی حقوق کے حصول کا راستہ ہموار کریں**

اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیئے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ خواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلادے گی۔

(بیکمر بمقام امرتسر ۲۹ جنوری ۱۸۸۲ء)

(بیکمر کا مجموعہ ص ۱۸۹)

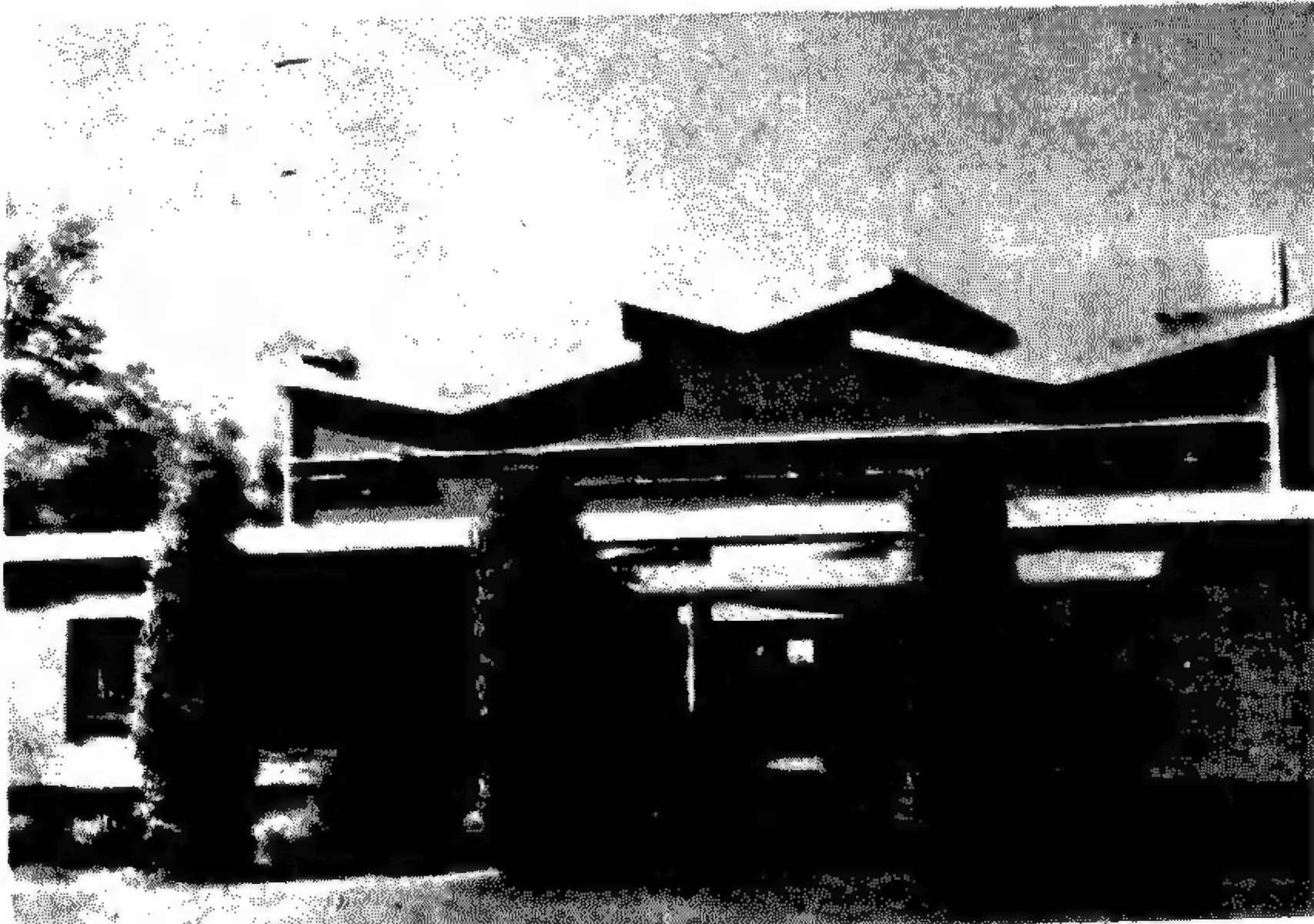
**عزت شخصی نہیں قومی چیز ہے۔** ”دنیا میں عزت

ایک بڑی چیز ہے مگر وہ ہر شخص کو فرداً فرداً کسی طرح نہیں مل

جاتا جب تک کہ باہر سے لاکر اس میں روپیہ ڈالنا جاوے جب تم ایسا کرو گے اس وقت بے شک جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں پہنچ لائیں گے۔ (مقالات سرسید)

**تعلیم کا مقصد۔** ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جدت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ ہم اس قدر تعلیم

استاد طلب کی تو بصورت محالیت، جو سادگی احمد لکھنوی میں اپنا جواب آپ ہے۔



سکتی جب تک کہ اس قوم کو جس میں کا وہ شخص ہے عزت حاصل نہ ہو۔ اگر ایسی قوم میں سے جو دلیل ہے کسی خاص شخص کو عزت حاصل ہو تو اس سے قوم کو تو کیا عزت ہوگی وہ خود اس وجہ سے کہ وہ اسی دلیل قوم میں کا شخص ہے ہمیشہ ذلیل ہی رہے گا۔ پس جو لوگ اپنی عزت چاہتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ قوم کی عزت میں کوشش کریں۔ جب قوم ذلت سے نکل جاوے گی اور پھر اس میں سے کوئی شخص کسی قسم کی عزت حاصل کرے گا تو اس کی اصلی عزت ہوگی اور وہ بھی کل قوم کی عزت کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ مجھ مسافر کی اس صدا کا آپ ہمیشہ خیال رکھیں گے۔ (سفر نامہ پنجاب ص ۸)

میں نے فرار کی زندگی کو پسند نہیں کیا۔ خدا کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تعلقہ جوڑنے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا جب ہمارے دوست مسٹر شکسپیر نے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک بلی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں سے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ بالکل سچی بات تھی میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنے گی مگر حال اس وقت قوم کا اتحاد مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا آپ یقین کیجئے کہ اس غم سے مجھ کو لوٹھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔

”یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے عرقی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر کسی گوشہ حافیت میں جا بٹھوں میں اس کے ساتھ مصیبت میں رہتا

چاہئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ادا بھرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔ (پیکر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء) (مسلم یونیورسٹی کانفرنس) میری مصروفیت ۴ میری فرصت اور کاموں کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جو دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت کم اور کام بہت نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو دس گھنٹے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو دوسری طرف سے ضروری کام ملتوی ہو جاتے ہیں۔“

(تقریر جالندھر ۲ فروری ۱۸۸۳ء) (پیکروں کا مجموعہ ص ۱۲۲) زمانہ کا ساتھ دو دو خدا کا حکم کوئی تحریر نہیں آتا، مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔ (۱۸۸۳ء) (پیکروں کا مجموعہ ص ۱۸۳)

علم کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں کر لو۔ سب ترقی کی جڑ ہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو کا کر لو۔ (بنارس ۲۰ دسمبر ۱۸۸۶ء) (پیکروں کا مجموعہ ص ۱۸۳)

اپنی خامیوں کا احساس پیدا کرو۔ دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کچھ یکنی کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔ (پیکروں کا مجموعہ ص ۱۲۲)

کاہلی چھوڑ دو۔ ”ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی کچھ میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا کام کاج، محنت مزدوری میں جستی نہ کرنا لٹنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر خیال نہیں کہ کدلی قوی کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔“ (مقالات مسرہ ص ۱۸۳)



مرید احمد خاں

مردم

کا

ایک

نادر

اور

نایاب

فوتو

(بشکریہ پروفیسر

خلیق نظامی)

سچائی اختیار کرو، انسان کو چاہئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لادے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ جو شخص اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ بھولا کرنا ہے۔ (تہذیب الاخلاق جلد ۲ ص ۱۹۱)

تاریخی ورنہ کی حفاظت کرو، کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔

(پیکر دوں کا مجموعہ ص ۱۲۱)

اپنی مدد آپ کرو، یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ نقطہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا او نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے لوگوں میں پایا جادے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور مضبوطی کی جڑ ہے۔ (مقالات مرید ص ۱۲۱)

سب مذاہب کا احترام کرو، ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے، پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسے ہی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ۔

(خطبات احمدیہ)

فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کرو، میری نصیحت تم سب کو یہ ہے کہ کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین ہے اور مت کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہاں کی نیکی منھری۔

(مرزا پورہ ۲ نومبر ۱۹۰۷ء۔ پیکر دوں کا مجموعہ ص ۱۲۱)

آزادی ملت ضروری ہے، یہ ریلوں کا بند رہنا، خواہ بہ بہت کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بہ بہت اندیشہ برادری و قوم کے، اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گونہ منت

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی خیر

کے ظلم سے، نہایت ہی بڑی چیز ہے۔ ریلوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو، بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔ (مقالات مرید ص ۱۵۱)

خوشامد ایک بیماری ہے۔ دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔

(مقالات مرید ص ۱۵۱)

ہمارا قافلہ کیسے آگے بڑھائے، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔ (مقالات)

(بشکریہ پروفیسر خلیق نظامی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)



# مٹ گئے تیرے شانے نشان بھی اب تو

ماخوذ

میں جگہ جگہ درختوں سے نعشیں لٹکی ہوئی ہیں اور ان کے گرد  
کوڑے اور چیلےیں منڈلا رہی ہیں۔ دہلی کے بے شمار کنوئیں  
نعشوں سے بھرت گئے ہیں بازاروں کا عالم یہ ہے کہ  
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے بھٹانوی  
سامراج نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں  
ڈال دیا ہے۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان ظلم اور  
بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے دیہاتوں

ایم اے ادا کالج میں ایک یادگار مشاعرہ کی نادر و نایاب تصویر۔ آپ بھی سرسید مرحوم کے دور کے چند ممتاز شعراء کو دیکھ سکتے ہیں





ایک یادگار فوٹو سلسلہ شکر یہ پروفیسر خلیق نظامی (فرش پر بیٹھے ہوئے) (بائیں سے دائیں) (۱) مولانا شوکت علی مرحوم (۲) پروفیسر اسے عزیز، انپکڑات اسکول (۳) میاں احسان الحق (۵) مولانا ظفر علی خان (۶) خواجہ کمال الدین (کرسی پر بیٹھے ہوئے) (۱) نواب حسین خاں خیال (۲) سید مسیح اللہ خاں "کور" (۳) راجہ محمود آباد (محمد علی محمد خاں) (۴) سر آغا خاں مرحوم (۵) نواب فتح علی خاں قزلباش (۶) خواجہ یوسف علی (کھڑے ہوئے پہلی قطار میں) (۱) عبدالعزیز (۲) سید علی بلگرامی (۳) آفتاب احمد خاں (۴) سر محمد شفیع (۵) مولوی خاں یا مولوی فیح الدین (۶) ڈاکٹر ضیاء الدین (۸) سر محمد اقبال (دوسری قطار میں) (۱) مولانا حبیب الرحمن شیدائی (۵) مولوی عبداللہ (۶) مولوی محمد

نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں  
غم اور مایوسی کی گھٹائیں ہر طرف سے امنڈی چلی آرہی  
ہیں۔ زندگی ایک بوجھ بن چکی ہے۔ ہمارے سینوں میں کانٹا  
سا گھنٹا رہا ہے۔ جو سے کافور و کفن کی تمنا میں لگا ہے اور  
آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہا ہے۔  
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشان بھی اب تو  
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز  
اللہ کا ایک بندہ جب اس موج خوں کو سر سے گزرتا  
ہو کر دیکھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مصلحت خاموشی

اشارہ کرتی ہے کہ گھر میں بیٹھو اور ہونٹوں کو سیلو۔ سہولت  
پسندی چپکے سے کان میں کہتی ہے کہ یہاں سے ہجرت کر جاؤ  
اور ان مصیبتوں سے نجات پاؤ۔ لیکن وہ اور خواہ مخواہ انسان  
نامساعد حالات کے سلسلے میں ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے  
اور فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی قوم کو ذلت اور نکیلت سے نکالنے  
میں اپنی زندگی کے آخری لمحات صرف کر دے گا۔  
خدا کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا  
نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ  
رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ آپ یقین

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

کیجے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور  
میرے بال سفید کر دیئے۔ یہ خیال پیدا  
ہوا کہ نہایت نامردی اور نامردی کی بات  
ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ  
کر میں کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں۔ میں  
نے ہجرت کا ارادہ ترک کیا اور قوم کی بھلائی  
کے لئے جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ میرے  
غم خوار مجھ کو اس سے منع کرتے تھے لیکن  
میرا دل ان سے یہ کہتا تھا۔

حریف کاوش مرگان خوں زیرم نہ نامح  
بدست اور رگ جانی و نشتر راتماشا کن  
پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس  
زمانہ کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور  
یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا کیا  
اسلام کے برخلاف ہے ! مجھے جواب ملا  
کہ نہیں۔

دل کے اس جواب نے سید احمد خاں کی زندگی کا  
رخ متعین کر دیا۔ انہوں نے مغربی علوم و فنون کی ترویج  
اشاعت کے لئے تدبیریں سوچنی شروع کیں کہ اسی میں قومی  
زوال اور انتشار و ابتری کا علاج نظر آتا تھا لیکن یہ کا کسی  
طرح جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مسلمان قدیم تہذیب  
کا خستہ لبادہ اوڑھے بیٹھے تھے اور افسانوی شرم رخ کی  
کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گزشتہ کے ریگ زار میں چھپا  
رکھا تھا۔ اس طلسمی دنیا سے بھاگنے کے لئے "نوائے تلخ"  
از عزم کو کہیں، دونوں کی ضرورت تھی۔

نئے حالات میں پرانے نظام تعلیم کی بے مائیگی  
اور بے بسی سب پر ظاہر ہو چکی ہے لیکن اس میں ترمیم کی  
جرات کسی کو نہ تھی۔ سید احمد خاں نے اعلان کیا۔

"ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں  
ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے  
ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا ککانے  
دالا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے  
ہیں اور زہر ٹھکتے ہیں۔ افسوس ہاتھ پکڑنے  
والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور گھر بچھ کے  
منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ سر جھائے ہوئے رشت  
کے بڑ میں پانی دینے کے بجائے اس کے  
پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے  
چشموں میں سے نہریں کھود کر پانی لانے  
کی توقع کرتے ہیں! پچھلا طریقہ تعلیم واقعی  
بہت اچھا تھا لیکن وہ تبدیلیاں جس درجے  
سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب دوسرا ڈورا  
ان کے باندھنے کو ہونا چاہئے۔"

اس نئے دورے کی تلاش نے سید احمد خاں کو  
سائنٹفک موسائٹی کے قیام کا راستہ دکھایا اور انہوں نے اعلان کیا

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان  
میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک  
حاصل کرنا چاہئے۔ ایک متعصب انسان ان  
تمام دل چسپ اور مفید باتوں سے جو  
نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے  
حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور نادانانہ  
رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کی دماغ  
کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور تربیت  
شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق  
نشان نہیں پایا جاتا۔"

انہوں نے بار بار بتایا کہ ذہنی آزادی کے بغیر کوئی  
سماج ترقی نہیں کر سکتا۔ جس قوم نے فکر پر بندشیں لگائیں



کاش میرے وطن میں بھی ایسے لوگ ہوتے  
جو قومی خدمت کو ذاتی نام و نمود سے علیحدہ  
رکھتے اور وطن کی خدمت کا جذبہ ذاتی  
منفعت پر غالب آجاتا ہے

جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی عالی شان عمارتوں  
سے گزرے، جب بیل ال کے لیکچر روم دیکھے۔ جب  
FENNER کے میدان میں طلباء کرکٹ کھیلتے نظر آئے  
جب CHERWELL کے پرسکون سائے دار درختوں میں  
ٹہل کر ان کو فکر و نظر کی دنیا بساتے دیکھا اور جب یونین  
کلب میں ان ہی کو سرگرم گفتگو یا تو ان کا بے چین دل اور  
بے چین ہو گیا۔ ان کے ذہن نے ایک بے صبر انقلابی کی طرح  
اپنے ملک میں تعلیم کا نیا خاکہ لندن ہی میں تیار کرنا شروع  
کر دیا تھا۔

”وقت کم اور کام زیادہ۔ نہ مجھ میں یہ قوت  
ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں،  
نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر  
رات کو وسعت دے دوں۔ کوئی رات نہیں  
جاتی کہ اسی مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور  
تجویزیں یہاں نہ ہوتی ہوں۔

اے بھائی بھدی! اگر تم یہاں آتے  
تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور  
تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر  
آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل  
کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے  
واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور گردن گا  
مگر مجھ کا ذمہ درود اور گردن مڑ دڑی ہوئی  
مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے  
والے کی کون سنے گا۔“

اس نے اپنی موت کے محضر پر دستخط کر دیئے سائنٹیفک  
سوسائٹی نے ہر اول کا کام کیا اور سید احمد خاں کی ہم  
کے لئے راستہ تیار کر دیا۔

اب ایک برس گاہ کے خطوط ان کے ذہن میں ابھرنے  
لگے ہیں۔ ان کو واضح شکل دینے کے لئے لندن کا سفر فروری  
میں ہوا۔ وسائل کی تنگی نے ان پکڑنا چاہا تو گھر بار  
بچ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سفر میں جس راہ سے گزرے  
جس عمارت کو دیکھا، جس شخص سے ملے، جس جلسہ میں  
شرکت کی ان کے دل نے بے اختیار اپنے وطن کو پکارا۔

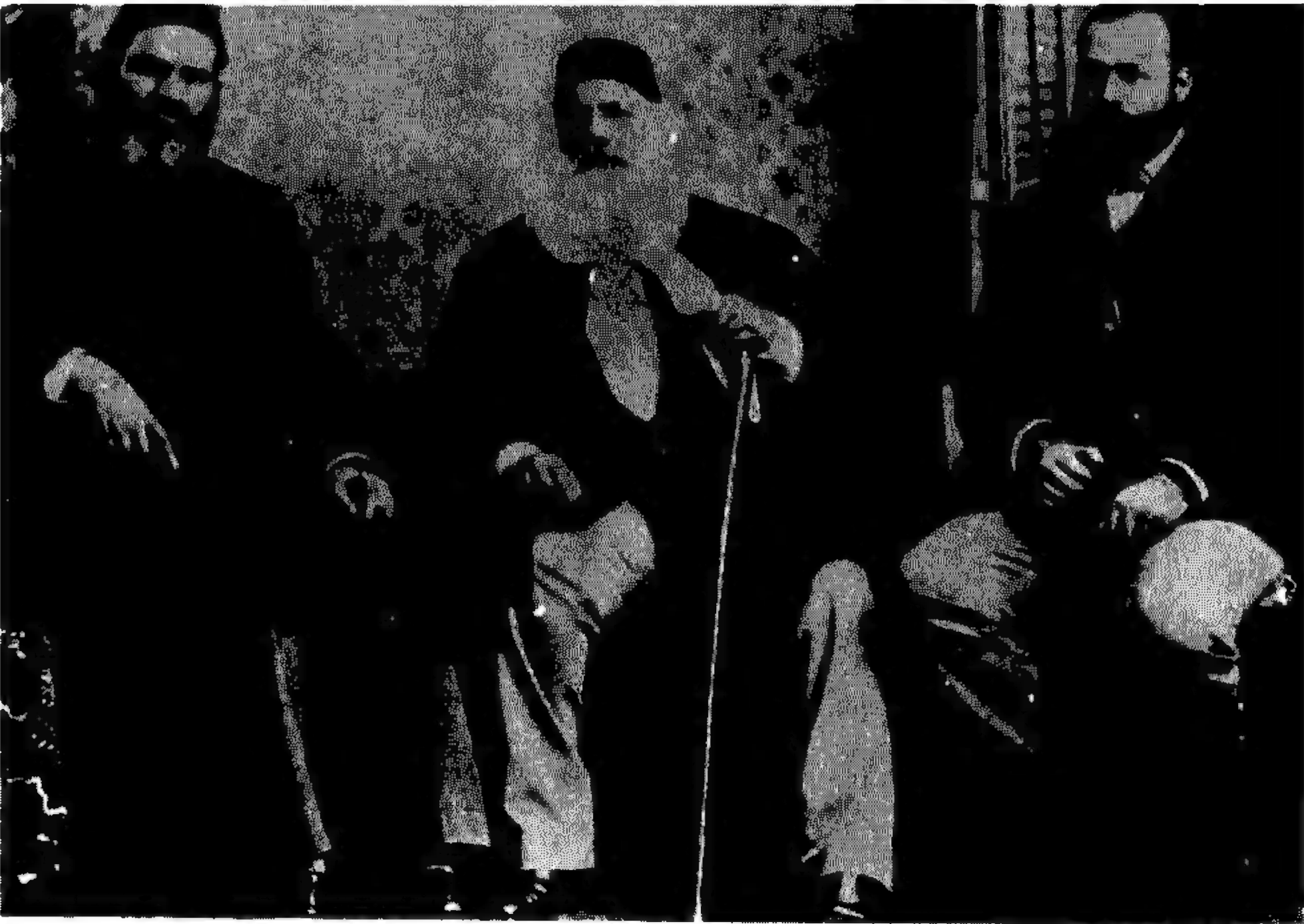
”میں نے ہر فاس خیال سے کہ کیا راہ ہے  
جس سے قوم کی حالت درست ہو اور روزگار  
کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے  
لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب  
میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عاملوں  
اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی  
مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات  
دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔ جب  
کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے  
یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت  
شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور  
اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ  
ہماری قوم ایسی کیوں نہیں ہے۔“

نہر سوئز بنانے والا انجینئر LESSEPS جہاز میں  
ہم سفر تھا۔ اس سے لوگوں کا اصرار تھا کہ نہر کا نام اسی کے  
نام پر رکھا جائے۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ وہ چاہتا  
ہے کہ اس نہر کو CANAL OF FRANCE کہا  
جائے۔ یہ جواب سید احمد کی روح کو ترپا گیا اور وہ حسرت  
سے کہنے لگے۔

ملیگڑہ مسلم یونیورسٹی منہر

سر سید کا آخری سفر پنجاب - ایک نایاب فوٹو (بشکر خلیق نظامی)





(۱) سرسید کے صاحبزادے حبیب محمد مرحوم (۲) سرسید احمد مرحوم (۳) نواب محسن الملک مرحوم

کہا کہ اس مخالفت کے بعد تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری قوم کو اس نئی تعلیم کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ مذہبی بنیاد پر مخالفت کرنی والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔  
 ”میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ امام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں اور آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں

وہی ہوا جس کا ذکر تھانوی مفتی مسلمان بوجھاڑ ہو گئی اور تو اور مولانا جمال الدین افغانی بھی اس مخالفت پر دوپگنڈہ کا شکار ہو گئے۔ کچھ دوستوں نے تردید میں کچھ لکھنا چاہا تو سید احمد خاں نے یہ کہہ کر روک دیا۔  
 ”مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے میں تو بدعتی تیرا ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دسوزی کی قدر کریں“  
 جب ان مضامین سے کام نہ چلا تو مخالفین نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کفر کے فتوؤں سے یلغار شروع کر دی۔ مخالفین کی اس مہم نے سید احمد خاں کے عزم کی بنیادوں میں سیسا پگھلا کر بھر دیا اور انہوں نے



چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست،  
بد عقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ  
نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں  
اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ  
ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم  
کے قائل کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند  
تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے  
لپٹنے لگے گھر بننے دیجئے اور اس کی وجہ  
سے کہ اس کا ہلنے والا یا اس میں مزدوری  
کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو نہ ڈھانچے  
کیا آپ مجھ ایک بد بخت، نامہ سیاہ کی شامت  
اعمال سے اپنی قوم کو اور انکی اولاد کو ڈوبونا  
اور خراب خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔  
جب ان کی یہ آواز تعصب اور تنگ نظری کے پرے  
چاک نہ کر سکی تو غم اور حسرت کے ساتھ عواقب سے اس  
طرح آگاہ کیا۔

۱۰۔ صاحبو! ہماری زندگی قریب اختتام  
پہنچ چکی ہے۔ چند سال ہی ہماری تمہاری عمر میں  
اور باقی ہیں۔ یہ سفید سفید داڑھیاں، پلوپلے  
پوپلے منہ زمین میں گڑ گڑ کر یا مگر گھٹ پر جل  
کر خاک ہو جائیں گے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ بچے  
جن کو تم نوجوان چھوڑ جاؤ گے ان کا یہ حال  
ہوگا کہ روز بروز مفلس اور ذلیل و خوار  
ہوں گے۔ جیل خانے ان سے بھر آئیں گے۔  
”اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور  
پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ انکی پرورش  
کرو۔ ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر  
ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو تم کچھ ہی کہو میری

سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی  
تعلیم کے طور پر اس کو تعلیم نہ دو گے تو وہ  
آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر  
حالت کو دیکھو گے اور بہین ہو گے رو  
گے اور کچھ نہ کر سکو گے۔ تم اگر مر جاؤ گے  
تو اپنی اولاد کی زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں  
قبروں میں ترہیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو  
سکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ  
کر سکتے ہو مگر یاد رکھو کہ میں بے چین گوئی  
کرتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح  
غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آئے گا  
کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو،  
ان کی تربیت کرو مگر تم سے نہ ہو سکے گا  
مجھ کو کچھ کفر، ملحد، نیچری میں تم سے اپنی  
شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا  
میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں  
چاہتا ہوں میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے  
بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم  
انہیں پر رحم کرو اور ایسا کرو کہ آئندہ  
کو پھٹانا نہ پڑے۔“

بنارس میں ”کیٹی خواستگار ترقی تعلیم  
مسلمانان“ کا جلسہ ہونے والا ہے۔ سر سید نے اپنے دوست  
محسن الملک کو ایک دن پہلے بلایا ہے کہ مدرسۃ العلوم  
کی اسکیم پر گفتگو ہو جائے اس رات کی داستان خود محسن الملک  
کی زبانی سنئے۔

”رات کو سر سید نے میرا لینگ بھی اپنے ہی  
کمرے میں بچھوایا تھا گیارہ بارہ بجے تک  
مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق باتیں ہوتی رہیں

اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ روپے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو آنکھ پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں گھل رہے ہیں اور ناز و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گہرا کر پوچھا کہ خدا خواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اونہ زیادہ رونے لگا اور کہا اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جا رہے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔

خون جگر کی اس آمیزش سے سرسید نے مدرسۃ العلوم کا خمیر تیار کیا! تعلیمی مہم روپیہ کے بغیر ہاتھ پر سرسوں جمانے کے مترادف تھی۔ روپیہ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا جو لوگ نام و نمود پر ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے ان سے تعلیم کے لئے چند روپیہ بھی حاصل کرنا دشوار تھا لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ دوستوں اور ساتھیوں سے سب سے زیادہ مطالبہ کئے۔ ان کے دوست چندہ دیتے دیتے تھک گئے لیکن وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ لیکن صرف دوستوں کی مہم سے یہ مہم کب سر ہو سکتی تھی۔ مجبوراً اور بے بس ہو کر فقیروں کا لباس پہنا اور گلے میں جھولی ڈال کر در بدر بھیک مانگنے نکل کھڑے ہوئے۔ ہندوستان نے فقیروں اور گداگروں کی بے شمار قسمیں دیکھی تھیں لیکن یہ قومی گداگر جس نے صد انگائی تھی ان سب سے مختلف تھا اس کی اس گداگری پر ہر دل اذیتیں قربان تھیں اور اس کے اس کاسہ گدائی کے آگے جام جم بھی بے حقیقت تھا۔ ایک دن بڑے

رنج سے کہا۔

اب ہمارا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کریں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا، اس لکھے کی بد لانا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔

پھر ایک تصویر ترتیب دیا اور چندہ حاصل کرنے کے لئے اسٹیج پر آکر آواز لگائی۔

قوم ما اے قوم! کز بہر تو

دادہ! ہمدرد ہمارے ننگ و نام را

اور کہا۔

اے رئیسو اور دولتمندو! تم اپنی دولت اور حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی حالت بری ہو مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب ان ہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لئے ہم آں اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

شبلی کا غمزہ دل یہ منظر دیکھ کر رو دیا۔

دوستو کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیر کا یقین

کیا یہ سمجھتے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں

نظر آئے گی جو سوئی ہوئی ایک زہرہ جبین

آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں

قوم کی بزم کو یوں کھیں تماشا سمجھے

ہائے گر آپ یہ سمجھے تو بے جا سمجھے



اسٹریچی ہال میں سر سید احمد اسکول کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں آکر یہ چین دیکھیں  
ریاضی قوم کا فصل خزاں میں باپن دیکھیں  
کلب میں آ کے گرا حباب رنگ انجن دیکھیں  
توزیب کر سکی صدر ایک مجتہم یونین دیکھیں  
نہ دیکھی ہوں جنہوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں  
وہ بک اور اس کے شاگردوں کو باہم سخن دیکھیں  
تاسف کرتے ہیں جو ہند کی نا اتفاقی پر  
کلب میں ہندوؤں کے آئین اور یونین دیکھیں  
اگر بادرنہ مواظا سنی اور شیعو کا  
بہم شیر و شکریاں چار یار و پنجتن دیکھیں  
نہ دیکھا ہو جنہوں نے پیار ہند و اور مسلمان  
وہ آکر مسلم و ہند کو یکجان درون دیکھیں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

نوحہ غم ہے یہاں نعرہ عشرت کیسا  
ہے یہ حسرت کا سماں جوش سترت کیسا  
ہے جنوں خیزیہ ہنگامہ عبرت کیسا  
قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا  
ہے عجب سیر اگر دیدہ بنیا دیکھے  
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے  
قوم کے خواب پریشاں کی تصویریں ہیں  
ایکڑیہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں  
برسوں کی سلسل جدوجہد نے بالآخر فضا ہموار کر  
دی۔ سید احمد خاں کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور علی گڑھ کے  
خاموش دریا نے بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ حالی نے اس  
طرح دعوت دی

۱۶۲ روز انجسٹ ہماگت ۱۳۷۲



پھر اگلے بعد وہ دیکھیں مری اپنے بچوں کا  
تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پھر دیکھیں  
خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں  
اسے جب تک دیکھیں قوم کی دھن میں گمن دیکھیں  
نہ سمجھیں یہ کہ اسکو ہے ہماری مدد کی پروا  
اگر سید کا استحقاق اہل انجمن دیکھیں  
محب قوم سنتا ہے درد دیوار سے تحسین  
جنہیں باور نہ آئے وہ محب قوم بن دیکھیں  
سر سید کا قوی میل جسے کبھی اسٹریچی ہال کے اندر آتے  
دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے کوئی جہاز بار بار پھیلائے  
طوفانی موجوں میں چل رہا ہے ماب کمزور و ناتواں ہو چکے  
ہیں ذرا تکلف سے داخل ہوتے ہیں یہ

مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کی بچوں کی  
مسیحی کو مسلمان قبا زب بدن دیکھیں  
مجسم دیکھنی ہو شکل مہر مادی جن کو  
وہ بچوں سے سلوک آئندہ ویریں دیکھیں  
اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی  
تو داکس کا بوتل درس انداز سخن دیکھیں  
دم تدریس دیکھیں چکرورتی کو اگر برسوں  
نہ پیشانی پہ بل دیکھیں نہ ابرو میں شکن دیکھیں  
ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا سخن  
تو شکی سا وجہ و عہد و یکتائے زن دیکھیں  
اگر بوجہ طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں  
تو عباس ابن جعفر سا محیط علم فن دیکھیں

لہذا اے ادکار کی پہلی فنٹ ہال ٹیم۔ کھلاڑیوں کے نام معلوم نہ ہو سکے



صورت سے عیاں جلال شاہی  
چہرہ پہ فروغ صبح گاہی  
وہ ریش دراز کی سپیدی  
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی  
پیری سے کمر میں اک ذرا خم  
توقیر کی صورت مجسم  
سدا مجمع مجسم ادب بن جاتا اور ہزاروں نظریں  
اس "پیر زندہ دل" پر گڑ جاتی ہیں۔ حالی کا دل جذبات  
سے امنڈ اٹتا ہے۔ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور سید کیرف  
رخ کر کے پڑھتے ہیں۔

عزیز دہق کی نعمت میں پیر ناتواں ہم میں  
پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں  
ہزاروں ہم میں ہوں گے بچلے اور اسٹریڈا  
گمراہ قوم پھر یہ صورتیں پیدا کہاں ہم میں  
عزیزوں کو خدادادہ نامبارک دن نہ دکھلائے  
کہ سایہ تیری ہمدردی کا ان کے سر سے اٹھ جائے  
تیرے احسان رہ رہ کے سدا یاد آئیں گے انکو  
کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے انکو  
جنہوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے  
انہوں نے پھل سدا محنت کا کم دنیاں پایا ہے  
یہ تیری خوش نصیبی تھی کہ عمرہ تیری کوشش کا  
خدا نے زندگانی میں تری تجھ کو دکھایا ہے  
بہت جھکڑے طے آئیں اکثر اندھیاں لیکن  
رہا گلزار ہو کر باغ جو تو نے لگایا ہے

ابہر میں بہت وابستہ تیری زندگانی سے  
دعا کرتا ہوں کہ اے عمرانی بڑھا تارہ  
سر سید عصار کا مہارے کر مشکل سے کھڑے ہوتے  
ہیں۔ آنکھوں میں آنسو شیر سے ہیں آواز بھرائی ہے۔ لیکن

عزم اور غلوں کی دل گیری اب بھی باقی ہے۔  
عزیز و امیر ہے بے چین دل کو آج کچھ قرار سا  
آگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا خواب  
شرمندہ تعبیر ہونے کو ہے۔ میں اب ہمیشہ  
کے لئے خاموش ہوا چاہتا ہوں میری ملازمت  
کو اس غم نے گھلا دیا تھا کہ وقت کا قافلہ  
تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے  
لیکن تم ہو کہ خواب گراں سے بیدار ہونے کا  
نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں گناہ تمہیں  
جگانے کی جدوجہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ  
پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد  
کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی  
شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے  
اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بقراری  
کی کرد میں نہ بدلی ہوں۔ آج مسجد کی  
محراب میں اور اسٹریچے وال کے یہ بام درد دیکھتا  
ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے  
دل کی بے قرار یوں نے اس کلج کا پیکر  
اختیار کر لیا ہے۔ دیکھو میری ایک نصیحت  
یاد رکھنا۔

”خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا، مگر  
زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔“  
دیکھو زمانہ کی آوازاں اب بھی آرہی ہے۔  
وہ نامح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے  
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانوں

میر بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو  
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے میری چالوں سے بگائو  
نصیحت میری بالو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ  
پھر جس وقت دیکھو میری جتوں تم بھی پھر جاؤ۔

شیر علی احمد نقوی

ملیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر

# مسلم یونیورسٹی میری زندگی کا عظیم کارنامہ

ہزہائی نس  
سر آغا خاں مرحوم  
ترجمہ و تخیص — سہیل احمد

تہذیب اور ثقافت کے عظیم آثاروں، تاج محل، لال قلعہ جامع مسجد، آگرہ اور دہلی کی خوبصورت موقی مسجد وغیرہ کی دیارت کو کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عظیم تعلیمی ادارہ اور دنیا کی ایک مثالی درس گاہ بنانے میں سرسید مرحوم اور آغا خاں محسن الملک مرحوم کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کیا تھا۔

موصوف نے اپنی کتاب MEMOIRS OF AGAKHAN (آغا خاں کی یادیں) میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی وابستگی کا بارہا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں جب موسم گرما کی سخت تپش ختم ہو گئی اور موسم باران گزر گیا تو میں نے پہلی بار شمالی ہند کا دورہ کیا۔ آگرہ، دہلی اور لاہور گیا جو مسلم ہندوستان کے مراکز تھے اسلامی

تہذیب اور ثقافت کے عظیم آثاروں، تاج محل، لال قلعہ جامع مسجد، آگرہ اور دہلی کی خوبصورت موقی مسجد وغیرہ کی دیارت کو کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عظیم تعلیمی ادارہ اور دنیا کی ایک مثالی درس گاہ بنانے میں سرسید مرحوم اور آغا خاں محسن الملک مرحوم کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کیا تھا۔

موصوف نے اپنی کتاب MEMOIRS OF AGAKHAN (آغا خاں کی یادیں) میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی وابستگی کا بارہا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں جب موسم گرما کی سخت تپش ختم ہو گئی اور موسم باران گزر گیا تو میں نے پہلی بار شمالی ہند کا دورہ کیا۔ آگرہ، دہلی اور لاہور گیا جو مسلم ہندوستان کے مراکز تھے اسلامی



ان  
کلیج اور ان  
پرنسپل انگریز  
سٹر مین اور  
ان کی انجمن



تھیں نے سرسید اور محسن الملک سے جوانی کے جوش میں کہا  
کہ ہم کیوں نہ سٹراک فیلر یا سٹراکائیگی کی طرح کے امریکی  
غیر حضرات سے مل کر اس کے لئے امداد طلب کریں لیکن میسر  
نہیں دوستانہ رسیدہ اور دور اندیش تھے اس لئے انہوں نے  
کہا کہ یہ خود ہماری ذمہ داری ہے۔ ہندوستان کے بیاہ کروڑ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اور تعلیمات کے مطابق مسلم افکار اور ثقافت کا منہ بنے گا۔ چ  
تو یہ ہے کہ کسی کو بھی ان باتوں کا اندازہ نہ تھا لیکن میں نے یہ  
ضرور محسوس کر لیا تھا کہ علی گڑھ کے حلقہ اثر کو وسیع کرنے اور  
اسے سرچشمہ ترقی بنانے کی سخت ضرورت ہے اس لئے میں ہر  
ممکن طریقہ پر جلد از جلد اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کا خواہا

مکرم محمد  
سے ملے  
عمارت  
"محمود منزل"  
میں  
سر سید  
کے  
مزار پر  
پھولوں کی  
چادر  
چڑھانے  
کے بعد  
واپس  
دانش  
چانسلر  
ڈاکٹر  
علیم  
کے ساتھ  
اساتذہ  
اور طلباء  
"مہر سید"  
پرلی گئی  
ایک تصویر



کامیاب ہوئے۔

دائسرائے کی میسینجیو کونسل میں میری رکنیت کے  
دوران ایک قابل ذکر واقعہ دہلی دوبارہ کا تھا جس کے آخر میں  
کمانڈر انچیف لارڈ کچیز کی سرمداری میں ۴۰ ہزار فوجوں کی پریڈ

اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۲ء

مسلمان اس کام کو بخوبی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم بیرونی امداد حاصل  
کریں گے تو ہمیشہ کے لئے ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔  
میں نے ان کے اس معقول خیال سے اتفاق کیا اور برسوں کی  
محنت و جانفشانی، تقریروں، کیٹیوں میں بحث و مباحثہ اور  
اعلیٰ مرتبت لوگوں سے طویل جھڑپوں کے بعد ہم اپنے مقصد میں

ملنگٹھ مسلم یونیورسٹی نمبر



ہونی تھی۔

اس دربار میں ڈیوک آف کنٹا جس نے فوج سے اسلامی لی تھی سلطنت برطانیہ کا نمائندہ تھا۔ وہ شہنشاہ برطانیہ کا بھائی اور میرا بچپن کا دوست تھا۔ دربار کے فوراً بعد دہلی میں ایک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں میں نے بہت سے تعلیمی منصوبوں پر جن میں سب سے اہم منصوبہ علیگڑھ کا تھا تفصیلی تقریر کی۔ اپنی اس تقریر میں میں نے براہ راست اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کہا — میں آپ سے دو مندا گداز کرنا ہوں کہ ایک مرکزی یونیورسٹی کے قیام پر پوری توجہ مبذول فرمائیے، ایک ایسی یونیورسٹی جو ایک دن آکسفورڈ ییپزنگ اور پیرس کی ہم پل بنے جو عظیم خیالات اور بلند نظریات کا مرکز ہو۔ ایک ایسی یونیورسٹی جہاں آپ کے نوجوانوں کو مغربی علوم کی اعلیٰ ترین تربیت دی جائے۔ ایک ایسی یونیورسٹی جہاں مشرقی تاریخ اور ادب کا علم مغربی افکار کے مطابق طوطوں کی طرح دہرایا نہ جائے بلکہ جہاں ہمارے نوجوانوں کو علم ماحول بھی حاصل ہو۔ ایک بار پھر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسی یونیورسٹی کے قیام کا مقصد بازاری شور و غل میں جو ہمارے درمیان رکوانہ بلند ہوتا ہے دب کر نہ رہ جائے۔

پچاس سال قبل میری زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ علیگڑھ کے سلسلہ میں میرے دلی جذبات کی عکاسی کرتے تھے اور میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میرے ان جذبات نے میری زندگی ہی میں عمل کی شکل اختیار کر لی۔

بنگال میں نواب علی چودھری اور نواب آف ڈھاکہ اور پنجاب میں سر محمد علی اور سر ذوالفقار علی خاں کی قیادت میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری کافی مستحکم ہو چکی تھی اور میں اپنا کافی وقت، توانائیاں اور دلچسپیاں علیگڑھ پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ میں خود کو ایک "کئی تیزابی گروپ" سمجھتا تھا جس کا مقصد علیگڑھ کو ایک عظیم مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنا تھا۔ اس زمانہ

میں ہم نے اس منصوبہ کے لئے لوگوں میں کافی جوش اور دلدادہ پیدا کر دیا لیکن ہماری اس تحریک کو ان طاقتور برطانوی عناصر کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی یونیورسٹی کا قیام نامناسب ہوگا کیونکہ اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ اور مفادات خصوصی کی ذہنیت اور تعلیمات کو فروغ حاصل ہوگا۔ میں نے اپنی تمام تقریروں۔ اپنے تمام مضامین اور مالی امداد کے لئے اپنی تمام اپیلوں میں اس انداز فکر کی تردید کی اور اس بات پر زور دیا کہ فرزند ان علیگڑھ ملک کے طول و عرض میں، آزاد خیالی، وسیع قلبی اور رواداری اور اخلاقیات کا پیغام پھیلائیں گے۔ مجھے اپنے اس مقصد میں کچھ بلند مرتبہ لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ لارڈ منٹو کی جگہ پر لارڈ ہارڈنگ وائسرائے مقرر ہوئے جو ایک آزمودہ کار سیاست داں اور مدبر تھے۔ وہ ایران اور مشرق وسطیٰ کے بہت سے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزار چکے تھے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں محکمہ تعلیم کے پنجاب سر ہرکورت بلر تھے جو ایک لائق منتظم اور ذہین افسر تھے۔ لارڈ ہارڈنگ اور سر ہرکورت دونوں نے مسلمانوں کی پوزیشن کو محسوس کیا اور وہ دونوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف سماجی، ثقافتی اور روحانی پس منظروں سے بھی آگاہ تھے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے بار بار یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو ان کی ترقی کا آخری ذریعہ نہیں سمجھتا میں اس خیال کا تھا کہ مسلمانوں کو قیادت سے نکلانے کا ایک ذریعہ اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ میرے ذہن میں کوئی بھی تنگ دلائل اور فرقہ وارانہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے شروع ہی سے یہ بات کہی تھی کہ یونیورسٹی میں سنسکرت کی تعلیم ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ہندو تہذیب۔ دھرم اور فلسفہ کی بھی تعلیم ہونی چاہئے تاکہ ہمارے عوام اپنے ہم وطنوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کی ضرورت کے سلسلہ میں میری دلیل یہ تھی کہ یہ





یونیورسٹی اسلام کے روحانی اتحاد کو فروغ دینے کا ایک مفید اور زیادہ سے ہوگی۔

دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور سرمایہ فراہم کرنے کا کام جو سب سے پہلے سے کم نہ تھا۔ میں نے پورے ہندوستان کی خاک چھانی اور عظیم مسلم لیڈروں، طلبہ اور ایڈیٹرز اور اوروں کے ساتھ دوستی طلب کر لیا۔ خود میں نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ یہ رقم اس زمانہ میں بہت بڑی تھی۔ اور میں نے کل تیس لاکھ روپے جمع کئے۔ یہ کام میں نے برسوں کی جانفشانی اور محنت سے کیا۔ میں ہفتوں سفر میں رہتا، اور ٹرینوں ہی میں کھانا پیتا اور سوتا۔ جس جگہ بھی ٹرین رکتی، میں پلیٹ فلام پر جمع ہونے والے مسلمانوں کو خطاب کرتا ہر مناسب موقع پر میں علیگڑھ کے کار کا تذکرہ کرتا۔ اس پورے سفر میں میرے اعزازی پرائیویٹ سکرٹری اور دست راست مولانا شوکت علی مرحوم تھے ان کی نگرانی اور جان توڑ کوششوں کے بغیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں ناٹور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ہماری تحریک اپنی انتہا کو پہنچ گئی، جہاں رجسٹرڈ کاغذ اس آئینم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا پروجیکٹ تھا۔ کانفرنس کے چیرمین مسٹر یوسف علی نے ہمارے مقاصد کی وضاحت بڑے اچھے انداز میں کی۔ انہوں نے کہا "اس میں افکار کی آزادی اور پاکیزگی کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ یہ اس معنی میں مسلم یونیورسٹی ہوگی کہ ان نظریات کو فروغ دے گی جو ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی دوسلوں کے تعلیمی تجربات سے تشکیل دیئے تھے۔"

اب جب میں علیگڑھ کی مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اور گزشتہ چالیس برسوں میں اس کی کامیابیوں پر نظر ڈالتا ہوں تو بے ساختہ یہ کہنے کو مجھے چاہتا ہے کہ بلاشبہ یہ میری زندگی کا ایک کارنامہ ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں میں صرف اس کے سیاسی نتائج پر زور نہیں دینا چاہتا کہ یہ وقتی تھے بلکہ میں یہ

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ اور کہاں یہ بات ممکن تھی کہ ہم اپنی دنیا اور اپنے زمانہ کی کل معلومات حاصل کرنے کے لئے لائبریریوں کے ساتھ ہر قسم کے سامان سے آراستہ لیبارٹریاں قائم کرتے۔ جسے ہم اسلامی عقائد اور تہذیب کا حقیقی مرکز بناتے اور جہاں ہم اپنے مذہب کے اصولوں، اس کی آفاقیت اور حقیقی جدیدیت۔ اس کی بنیادی شائستگی اور رواداری کے جذبہ پر عمل کرتے ہوئے دیگر عقائد کا احترام کر سکتے۔ یہ بات میرے لئے انتہائی خوشی، سکون اور اعتماد کی ہے کہ میں نے اس قسم کے مرکز کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا۔

۱۹۱۲ء کے اوائل میں دہلی دوبارہوا جس میں شہنشاہ برطانیہ اور ملکہ نے شرکت کی۔ دوبارہ کے موقع پر ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان ہوا۔ اور اجدھانی کے شایان شان ایک نیا شہر (نئی دہلی) تعمیر کیا گیا۔ بنگال کی تقسیم کو کاغذ پر ادا کیا گیا اور علیگڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور مجھے شہنشاہ برطانیہ نے سب سے بڑا اعزاز "جی، سی ایس آر آئی" دیا۔

۱۹۶۲ء اگست ۶۹

سیاہی! ہر سمت سیاہی! کہیں بھی تو ایک نفاہ  
ستادہ روش نہیں دنیا کے مسلمانوں کی قسمت کی طرح اٹھان  
سیاسی با خیالات جھٹک رہے ہیں مگر ان کی کوئی منزل نہیں  
کتنی باتیں، کتنی یادیں ایک زنجیر کی طرح ذہن کو بوجھل کر رہی  
ہیں۔ ہندوستان کے تمام مسلمان بیگم اندرا گاندھی کے جھنڈے  
تیلے جمع ہیں۔ حکمران پارٹی زندہ باد کے ظلم شکافت نعروں سے  
امین لندہ ہی ہے۔ حکمران پارٹی بھاری اکثریت کے ساتھ  
کامیاب ہو گئی۔ علی گڑھ کے مسلمانوں نے اپنے ہوسے حکمران پارٹی  
کی مانگ میں مرفی بھری۔ وزیراعظم کے لبوں پر مسلمانوں کے بھرپور  
تعاون کے لئے شکریہ کے پھول کھل اٹھے۔

مسلم لیونڈ سٹی! جہاں ایک دن بیگم اندرا گاندھی زندہ باد  
کے نعروں سے بام دودھل اٹھتے تھے۔ آج بند ہو چکی ہے۔ طلباء  
زبردستی گھروں کو بھیج دیئے گئے ہیں۔ دیکھو ان کے پُراں منظر ہر  
سے ملک و قوم کو خطرہ تھا۔ اچانک طور پر ہولناک انداسی بھری  
ہوئی تھی۔ یہ مسجد ہے! جہاں دن میں پانچ وقت اذان کی آواز  
گونجا کرتی تھی۔ جہاں طلباء پاک پروردگار کے ساتھ سجدہ ریز  
ہوتے تھے۔ جہاں وہ پیدا کرنے والے سے ایمان کی بھیک مانگنے  
کے لئے دامن پھیلا کر تے تھے۔ آج یہاں چمکاڑ پھراتے پھر رہے  
ہیں۔ سیاہ ماحول میں اس کے سفید مرفی مائل مینار آنکھیں  
بھاڑے نمازیوں کو تلاش کر رہے ہیں مگر قدر دوزیک کوئی نظر

# ایک ملاقات

## نواب محسن الملک

۷

عبد البصیر نقوی







ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم (بیگم بھوپال) جو یکم  
دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۳ مئی ۱۹۳۰ء تک دس سال علی گڑھ  
سلم یونیورسٹی کی چانسلر رہیں

میں آ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر یہ گیت کا حلیم چاٹک ہے۔ اچھا  
ہے کہ جس نے اس کو سیاہ شروانی پہنے مرید ہال میں داخل  
ہوا کرتے تھے۔ آج خود سیاہی کا ایک حصہ بنا خاموش نظروں  
سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ آتش لیکن ہے اور بھی  
ایک زمانہ پہلے ہی آج وہاں ہے۔ انجینئرنگ کالج۔  
پال ٹیکنک انجینئرنگ کالج (ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ) اسائن  
لیکن کے ڈپارٹمنٹس اجزل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ (الابریری)۔  
سب یہ میرانی کی ریز چارہ مستطی ہے۔ عبد اللہ اور مرنجی ناٹک  
ہال کے دعوئیاری دھڑکیں بند ہو چکی ہیں۔ مرید ہال۔  
آفتاب ہال اسر شاہ سلیمان ہال اور قاتالک ہال بحسن الملک  
ہال سہاں سود ہال اپو فیسر حبیب ہال! کہیں طلبہ کے قہقہوں  
نے طوفان مارا تھا جو آغوش مادر بنے طلبہ کو پیار کے نعلات سناتے  
کرتے تھے۔ آج کوئی گھوئی نظروں سے نہ چلنے ظلام میں  
کیا تلاش کر رہے ہیں۔

اسیہ مرید ہال اس ہے۔ جس کے سبزہ نادر طلبہ کو دیکھ  
کر مجھ دینے ہو جاتے تھے۔ آج غزاں رسیدہ ہو چکے ہیں کہیں اسی  
مکان میں مرید اور ان کے رفقاء کالج کی فلاح و بہبود کے لئے  
مرجوز کر بیٹھا کرتے تھے۔ آج بھوتوں کا مسکن معلوم ہو رہا ہے۔  
میں بہت تنگ کیا ہوں۔ اس مرجانی گھاس کے لان پر کچھ دیر  
بیٹھ کر تالہ دم ہوں، ورنہ یہ قہقہے کہیں مجھے سیاہی کے اس حقیق  
فار میں نہ پھینک دے۔

آیں یہ قدموں کی آوازیں کیسی؟ اتنی مات گئے یہ کون  
آ رہا ہے؟ اسے ایہ تو میری طرف آ رہا ہے اور یہ میرے نزدیک  
آ کر رک گیا۔ سیاہ شروانی اور پرٹوٹی، کشادہ پیشانی، چمکیلی  
آنکھیں، ستواں ناک اور محکمہ خوبصورت سی داڑھی ہیں اس  
سے پہلے میں دیکھ چکا ہوں۔ کہاں؟ ہاں! میں نے کہاں دیکھا تھا  
ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔ خود انہیں سے کیوں نہ پوچھوں۔  
”اسلام علیکم“

میلنگ مسٹر یونیورسٹی نمبر

”علیکم السلام“ مجھے جواب ملا اور میرے نزدیک ہی لگا  
پر بیٹھ گئے۔ پہچانا؟ ”ہ سوال کیا گیا۔

میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں سید مہدی علی خاں ہوں۔  
سید مہدی علی خاں؟“ میں پھر ذہن پروردہ لے لگاؤ  
اچھل پڑا مجھے یاد آ گیا: نواب محسن الملک!

وہ مسکرا اٹھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنا پیار تھا، کتنی اپنائیت  
تھی اس مسکراہٹ میں۔

”مگر آپ کے انتقال کو تو عرصہ گزر چکا ہے۔“ میں نے  
حیرت سے کہا۔

”ہاں! تم دست دے ہو صاحبزادے مگر آج میں

میلنگ مسٹر ہما اگست ۲۰۱۷ء



”جی وہ“ اپنی کم علمی پر میں شرمناک رہ گیا میرا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی، یعنی کہ۔

وہ شاید سمجھ گئے۔ ایک ٹک مجھے دیکھتے رہے اور پھر بولے:

میرا نام سید ہدی علی خاں ہے۔ میں ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اٹارہ میں پیدا ہوا تھا۔ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد دس مہینے ماہانہ پر محرم ہو گیا۔ ۱۸۹۵ء کی جنگ آزادی کے بعد مسٹر ہیوم کا پیشکار ہو گیا۔ میں اپنا کام جس محنت اور لگن سے کرتا تھا اس کا انجام یہ ہوا کہ جلد ہی تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اسی دوران میں میری ملاقات سر سید احمد خاں سے ہوئی اور انہوں نے میری سفارش سالار جنگ (حیدر آباد) سے کی۔ میں ڈپٹی کلکٹر کی عہدے سے استعفیٰ دیکر حیدر آباد چلا گیا اور وہاں مجوزہ کارروائی کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۹۳۵ء کو اعلیٰ حضرت فرما کر ان کے حیدر آباد سے مجھے نواب محسن الملک کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۵۹ء میں حیدر آباد سے وظیفے کر علی گڑھ چلا آیا۔ سر سید کا آخری دور تھا بقول مولانا مائی خشی تعلیم پر بنائے ہوئے لوگوں کے باعث طوفانی موجوں میں گمر گئی تھی۔ ایک لاکھ کا فن محنت پھیرا ثابت ہوا۔ مجھے سر سید کے طریق کارروائی سے اختلاف ہوا۔ سر سید نے میری ایک انسانی اس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی اور میں بھی چلا گیا۔ میرے دل میں در سگاہ سے محبت پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اس در سگاہ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان ممبر کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ ”محسن الملک سانس لینے کیلئے ڈک و فوڈ“ کچھ سوچ کر مسکرا اٹھے بولے: ”جب میں دہلی پہنچا تو وہاں کے مولوی صاحبان نے کہا کہ اس کمرے میں پکڑ سننے کے لئے جانا سیدھا جہنم میں جانا ہے۔ پکڑ سننے والوں پر ان کی منکوسہ عورتیں حرام ہو جائیں گی۔ کسی نے کہا کہ وہاں نہ جاؤ وہاں تو دجال آیا ہے۔ ان تمام باتوں کا میں نے صرف یہ جواب دیا کہ مولوی صاحبان کا یہ کہنا کہ دجال آیا ہے ایسا غلط واقع

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



ہزبانئ نس نواب حمید اللہ خاں علیگ (نواب بھوپال)  
۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء سے ۷ اپریل ۱۹۳۵ء تک پانچ سال  
مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

اپنے اس مدرسہ العلوم کو دیکھنے آیا ہوں جس کے ذرہ ذرہ کو سر سید اہل ان کے رفقاء نے اپنے خون سے سنبھالا ہے۔ انہوں نے کہا۔ لیکن مدرسہ العلوم تو۔۔۔ میں رک گیا۔ کیا کہوں ان سے، حقیقت جان کر کتنا دکھ ہو گا ان کو ”جناب!“ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا: ”ابھی تو دات ہے۔ ہر سمت ویرانی ہے اس وقت آپ کیا دیکھیں گے۔ خدا روشنی ہوئے دیں۔ پھر میں خود آپ کو یہاں کی سیر کراؤں گا۔ جب تک میں آپ کے ہائی کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

میرے ماضی کے بارے میں کیا تم میرے ماضی سے ناواقف ہو؟ انہوں نے حیرت سے کہا۔

۲۷ اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۷ء



ہزار کرا لٹھ ہائی نس میر عثمان علی خاں مرحوم (نظام  
حیدر آباد) ۲۶ اگست ۱۹۳۵ء سے ۹ نومبر ۱۹۳۷ء  
تک بارہ سال مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

اچھا ایک بات بتائیے۔ میں نے موضوع ملتے  
ہوئے کہا: ابتدا میں آپ کو سرسید کے مغز میں عقائد سے سخت  
اختلافات تھے۔ پھر بھلا آپ ان کے ساتھ کیسے ہو گئے؟  
اختلافات! ”محسن الملک چند لمحے غلامی دیکھتے  
رہے پھر بولے: مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں پہلے پہل  
سرسید سے علی گڑھ میں ملا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی  
ترقی تعلیم کی نسبت ان کے خیالات اور ارادوں پر بحث  
ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں میں ان کا مخالفت تھا اور تعلیم کے  
معاہدہ میں انکی بلند پروازیاں سن سن کر بہت ہنسنا تھا۔ اس  
وجہ سے کہ مجھے معلوم تھا کہ جس قوم کی یہودی اور ترقی کے

امر ہے کدنی شخص اس کا یقین نہیں کرے گا۔ ایک بچے سے  
بھی پوچھو گے تو وہ یہی کہے گا کہ یہودی آیا ہے۔  
”اس کے بعد میں نے انگلینڈ کا دورہ کیا۔ سارہرا ایک عظیم  
انقلاب آگیا۔ سرسید احمد خاں جنہوں نے اپنی تمام عرقم کی بھلائی  
کے لئے وقت کر دی تھی۔ جہاں قالی سے کوچ کر گئے: سید محمود  
سرسید کے جانشین مقرر ہوئے۔ مگر ان کی حالت دن بدن خراب  
ہو رہی تھی۔ وہ اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ کالج کے سکریٹری  
کے بطور کام کر سکتے۔ دوسری طرف چند بدخواہ ان کو میرے  
خلاف مسلسل بھڑکاتے رہتے تھے کالج کے ڈسینوں نے جب دیکھا  
کہ سید محمود کام کرنے کے اہل نہیں رہے تو حکومت کے اہل  
پر سید محمود کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ مجھے  
کالج کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ میں سکریٹری مقرر ہونے کے  
بعد براہ سرسید محمود کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا۔“  
ابھی آپ نے فرمایا کہ آپ نے انگلینڈ کا بھی دورہ  
کیا۔ میں نے کہا: آپ کو پسند آیا؟

میں خیال کرتا ہوں: ”محسن الملک نے جواب دیا۔  
”انگلینڈ میں دلچسپ چیز دہی ہے جس پر ہم مسلمان بہت کم  
غور کرتے ہیں۔ انگریز خواتین نہ صرف کتابوں میں بلکہ دنیا  
کے کاروبار میں مردوں کے برابر تعلیم یافتہ ہیں اور ہر علم اپنے  
بچوں کو سکھاتی ہیں۔“

اُس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ انگلینڈ کے ماحول  
سے بہت متاثر ہوئے؟ میں نے پوچھا۔

متاثر! انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں بہت متاثر  
ہوا۔ وہاں مفلسی سخت ہے۔ تکلیف شدید ہے اور ایک حصہ  
لندن میں ایسے مقبہبت زدہ لوگ ہیں جو تمام ہندوستان میں  
نہ ملیں گے۔ ایسا بے غیرت، بے حیثیت، ناپاک ملک دنیا میں  
نہ ہوگا، ایمان، غیرت اور انصاف کا نام نہیں ہے۔“ محسن الملک  
کا چہرہ سرخ ہو گیا۔



مجھ سے ہو سکے گا میں ان کی مدد کروں گا۔

مگر اس کے باوجود ایک بار پھر آپ کے سرسید سے کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ میں نے کہا: "جس سے بدلہ ہوگا آپ بھی چلے گئے تھے۔"

تم ٹھیک کہتے ہو صاحبزادے! "حسن الملک نے یہ مسکن آواز میں کہا: "میں کالج کے موجودہ ڈھلچکے سے متفق نہ تھا بیات یہ تھی کہ کالج کے ٹرسٹی بالکل ناکارہ تھے۔ لیکن اور نالائی ٹرسٹیوں کی بھرتی سرسید نے کالج کی خدمت چلائے کے لئے اور نیز اس لئے کہ ان کے دور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں ایسے لوگوں کو کالج ختم کیٹی کا ممبر بنایا جن سے مالی امداد کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکرٹری سے کسی معاملہ میں اختلاف کرنے کا نہ ان میں مادہ ہو نہ ارادہ۔ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہ ہی لوگ ٹرسٹی مقرر ہوئے۔"

ٹری گروہ سے ممبئی چلے جانے کے بعد بھی آپ کالج کی خدمت کرتے رہے۔ آخر کیوں؟ میں نے سوال کیا۔  
"کیونکہ مسلمانوں کی تعلیم کا یہ تنہا مرکز تھا اور قوم کی خدمت کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔"

"ملک میں تو اور بھی یونیورسٹیاں تھیں کیا ان میں مسلمان تعلیم نہیں حاصل کر سکتے تھے؟" میں نے پھر سوال کیا۔  
"موجودہ یونیورسٹیاں ہم مسلمانوں کی مختص الحالات حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ تھیں۔ نہ کسی قسم کی اصلاح سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ تمام حاجتوں کے لئے کافی ہوں۔ سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیال اس امر سے متفق الیاس تھے کہ ہماری ضرورتیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جبکہ ہم تعلیم و تربیت میں گورنمنٹ کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں سے آزاد ہوں اور اپنی ضرورت اور مرضی کے موافق اپنی قومی تعلیم کا خود انتظام کریں۔"

مدیر گروہ مسلم یونیورسٹی نمبر



ہزبانئی نس نواب رضائشی خاں (اسود) ۱۶ اپریل ۱۹۳۶ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء تک پروچانسلر اور ۳ نومبر ۱۹۴۷ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء تک پانچ سال مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے

لئے وہ فکر کر رہے ہیں وہ سستی اور لا پرواہی کی جگہ جاری میں مبتلا ہے۔ اس وقت میرا دل یہ ہی کہتا تھا کہ ان کو ہرگز کامیابی حاصل نہ ہوگی خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کے مذہبی عقائد کو ہندوستان کے اکثر مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سمجھتے تھے مگر کچھ عرصہ میں میرے ان خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ سرسید کا دل سچے جوش اور ہمدردی سے بھرا ہے۔ رفتہ رفتہ میرے اعتزالتا رفع ہوئے اور میرے دل نے قبول کر لیا کہ سرسید کے خیالات صحیح اور میرے غلط ہیں اس کے بعد میرا دل خود بخود ان کی طرف مائل ہو گیا اور میں نے معصم ارادہ کر لیا کہ جہاں تک



”تو میرا مہڈن ایٹھ اور نیٹل کالج دہری درگاہوں  
سے مختلف تھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ اور جو نمایاں فرق اس کالج کے اردو کے  
کالجوں کے طلباء میں ہے صرف نتیجہ بورڈنگ ہاؤس کے  
عمدہ انتظام اور عمدہ صحبت اور پروفیسروں و طلباء کے باہمی  
میل جول کا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”معات فرمائیں“ میں نے کہا ”آپ کا مقصد یہ ہے  
کہ اس درگاہ کا اقامتی کردار ضروری ہے اور اسلامی کردار  
کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ یعنی کہ اسلام“

”اسلام!“ وہ سخت لہجہ میں بولے: ”اگر تمہارے ذہن  
میں اسلام کی پہچانی کا یقین نہ رہے اور تم اپنے مذہب پر  
قائم و چوہہ جیسے کہ نام اور صورت کے مسلمان ہو تو تمہارے  
علم سے چل اچھا تمہاری تہذیب سے بے تہذیبی پتھر، بلکہ کچ  
پوچھو تو تمہاری زندگی سے قوم کے لئے تمہاری موت اچھی۔ کیا  
خوشی ہو سکتی ہے ہم کو اس سے کہ تم عالم بن گئے۔ حکیم اور فلسفی  
ہو گئے۔ دنیا کے سارے علوم سیکھ لئے، یورپ کی نئی  
تحقیقات اور یونان کے پڑائے علموں میں استاد ہو گئے مگر  
مسلمان نہ رہے اور مسلمانی چھوڑ بیٹھے۔ جبکہ تمہارے دل  
میں اسلام ہی ہے۔“ انا تو قوم تم پر کیا فخر کریں گی۔ تمہارا نام علماء  
اور حکماء میں دیکھ کر تمہارے بزرگ کیا خوش ہونگے۔ تمہارے  
گلے میں غلطی تمہارے ہار پڑے ہوئے سے کیا۔ کیا کوئی  
باپ اپنے بیٹے کو گود میں بٹھاتا ہے جبکہ اس کی جان نکل گئی  
ہو۔ گودہ کیسا ہی خوبصورت اور پیارا کیوں نہ ہو۔ پس اسلامی  
کردار اس درگاہ کی اور اسلام تمہاری جان ہے۔ اس  
کے بغیر کوئی کیسا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ایک  
مٹی سے دبائے کے قابل اور ایک نفس ہے زمین میں چھپنے  
کے لائق۔“ ”محسن الملک غفرلہ سے کانپ اٹھے اور میرا منہ  
جھٹک گیا۔“

علیگزہ مسلم یونیورسٹی نمبر



ہزراتی نس سلطان شاہ محمد (آغا خان مرحوم) جو  
۱۹۳۵ء سے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء تک  
سلم یونیورسٹی کے پروفیسر رہے

مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ میں نے اپنے سوال سے  
محسن الملک کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ میں خاموش مر  
جھکائے بیٹھا تھا کہ انہوں نے نرم لہجہ میں کہا: ”اور کچھ پوچھنا  
چاہتے ہو صاحبزادے؟“  
میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں پر محبت  
اور شفقت کا دریا موجزن تھا میری ہمت بندھی اور میں  
نے رک رک کر سوال کیا: ”کیا آپ کو کبھی کالج کی طرف سے  
تکلیف پہنچی؟“

میرا سوال سن کر وہ خاموش نظروں سے میری طرف  
دیکھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد بولے: ”ہاں ایک بار! سن ۱۹۲۵ء

ہر ہولی ٹس  
ڈاکٹر  
سیدنا  
ملا  
طاہر سیف الدین  
مرحوم  
جو  
۱۲ اپریل  
۱۹۵۳ء سے  
۲۸ اپریل  
۱۹۶۵ء تک  
بارہ سال  
مسلم  
یونیورسٹی  
کے  
چانسلر  
رہے



ہی جا رہے تھے۔ آخر ۹ فروری ۱۹۵۳ء کو یہ لاوا پھٹ پڑا۔  
طلباء راتے ہڑتال کر دی اس شورش کی تحقیقات کے لئے  
ایک کمیشن مقرر ہوا۔ کلچر جواب تک ایک وقار حاصل کر چکا  
تھا وہ سب ہڑتال کی وجہ سے مٹی میں مل گیا۔ یہ دیکھ کر مرادل  
ٹرپ اٹھا میں یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا اور میں نے استعفیٰ  
دے دیا۔ ۱۹۵۳ء کے اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ ہاں یاد آیا۔  
۲۱ اپریل کو میں نے استعفیٰ دیا تھا۔ استعفیٰ دینا تھا کہ مر

میں یورپین اسٹاف اور طلباء میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے  
یورپین اساتذہ نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اس میں نفرت  
و حقارت کے جذبات نمایاں تھے۔ کسی نے طلباء کے ایک  
مرتبے کو جو کلچر کے قریب ٹہل رہے تھے بھٹو کراری کسی نے  
موتن کو اذان دینے سے روک دیا۔ ۱۹۵۳ء میں طلباء نے اپنا  
نمائندہ شکایات کے ساتھ پرنسپل کے پاس بھیجا مگر وہ نمائندہ  
پورڈنگ ہاؤس سے نکال دیا گیا۔ حالات دن بدن بگڑتے



طرف سے غلط موصول ہوئے۔ لوگ ملنے آئے کہ ایسے وقت میں استغنیٰ دے کر کالج کس پر چھوڑے جاتے ہیں۔ اور جب ہر طرف سے مجھ پر زور پڑا تو میں نے مجبوراً استغنیٰ تو دیا لیکن یہاں تک کہ میری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ میں اس حادثہ کے بعد بری طرح بیمار پڑ گیا۔

اُن کہتے تھے کہ آپ نے اس کالج کے لئے یہ ہیں۔ وہ بھرے ایجن میں کہا: بیماری کی حالت میں تو آپ اس ذمہ دار

سے سبکدوش ہو گئے ہوں گے؟

میں نے تو پوری کوشش کی تھی: وہ بولے: مگر کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔ مولوی عبداللہ جان جو کالج کے ہمدرد ٹرسٹی تھے، انہوں نے میری خیریت کے بارے میں مجھے خط لکھا تو میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میری طبیعت کا حال کیا پوچھتے ہو۔ آپ سب صاحب میری جان کے دشمن ہو کہ جو مجھے نجات نہیں دیتے۔ آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا دل کچا



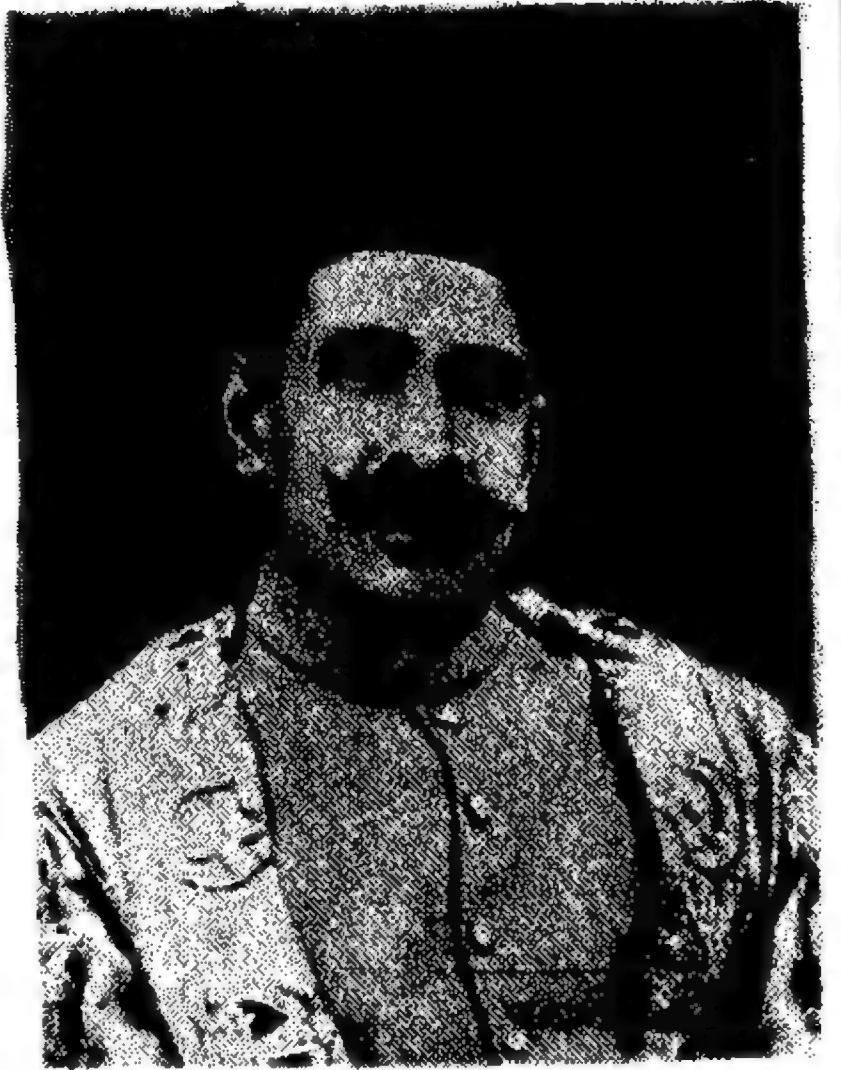
جمہوریہ ہند  
کے  
پہلے  
وزیر اعظم  
پنڈت  
جواہر لال  
نہرو  
علی گڑھ  
مسلم  
یونیورسٹی  
میں۔  
بچے  
سابق  
وائس چانسلر  
بد الدین  
طیب جی  
کو  
بھی  
دیکھا  
جاسکتا  
ہے



نے پمفلٹ شائع کئے تھے اس لئے بابائیں نالائق ہوں۔  
مجھے نہ قوم کا درد نہ اپنے قہر سے کی عزت کی پروا نہ لوگوں  
پر رحم۔ انگریزوں کا ظلم اور بے ایمان۔ مگر کیوں ایسے شخص  
کو رکھتے ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایسی حالت میں  
پہنچ گیا ہے کہ برداشت نہیں کر سکتا یہ محسن الملک خاموش ہو گئے  
اس قوم نے صرف سرسید کو ہی نہیں بلکہ ان کے ہر رفیق  
کو جس نے بھی قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا خون کے آنسو  
ڈالے ہیں۔ محسن الملک جنہوں نے اپنا سب کچھ کالج کے لئے  
وقف کر دیا کیسے کیسے امتحانات سے گزرے خود کالج کے  
ٹرسٹی ہی ان کی جان کے دشمن بن گئے مگر اس اور لواحقین انسان  
نے نامساعد حالات کے سامنے پیر نہ ڈالی۔ وہ برابر حالات  
کا مقابلہ جو انگریز سے کرتے رہے کیونکہ ان کی منزل نام و نمود  
نہیں تھی بلکہ وہ تو قوم کی ابھی ذلت کو سلجھانے کی کوشش کر رہے  
تھے اور قوم کو بام عروج پر پہنچانا ہی ان کا مقصد حیات تھا۔  
اگر کہا جاتا ہے میں نے پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے  
کہا کہ موجودہ تعلیم فرقہ پرستی کو جنم دے رہی ہے اہل اس کی  
مثال اس طرح سے دی جاتی ہے کہ اکثر فرقہ دارانہ فسادات  
ان ہی جگہوں پر ہوتے ہیں جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت  
ہوتی ہے۔ یعنی گاؤں کے معصوم اہل جاہل عوام اس فرقہ  
پرستی کے ذہر سے کسی حد تک دور ہیں لیکن شہروں میں فرقہ  
پرستی کے مظاہر سے اکثر ہوتے ہیں جہاں تعلیم عام ہے کیا تعلیم  
ہی ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ اس  
سلسلہ میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

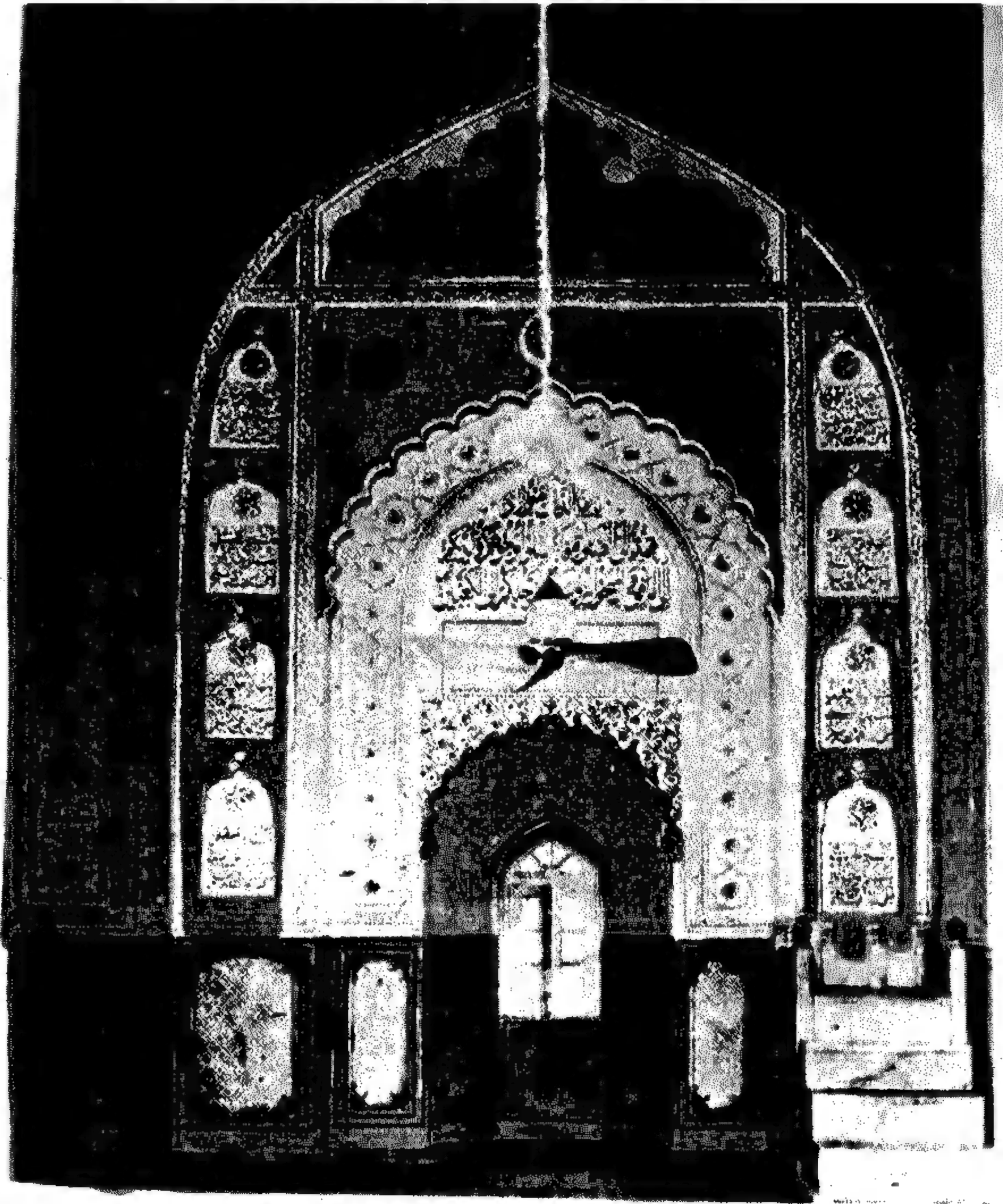
محسن الملک نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، جیسے وہ کچھ  
یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر کہنا شروع کیا: ظہرِ جنگ  
آزادی سے پہلے جبکہ انگریزی تعلیم (موجودہ تعلیم) کا نام و نشان  
نہ تھا۔ دونوں قوموں میں براہِ راست اتفاق تھا۔ ایک دوسرے  
کو دستِ بخت تھے شادی اور نفی کی تقریروں میں دونوں ایک

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



سعید الملک ڈاکٹر نواب احمد سعید خاں آف چھتاری جو  
یکم مئی ۱۹۵۷ء سے دسمبر ۱۹۶۵ء تک پروفیسر رہے اور  
اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے تادم تحریر یونیورسٹی کے چانسلر  
ہیں۔ بظلالہ العالی

غم لب نہ جانے گا جب تک میں کالج کا سکریٹری رہوں گا بیت  
گالیاں کھائیں۔ بہت آفات تھیں۔ مگر ابد گالیاں کھانے  
کی طاقت اور نہ معزز ڈسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل  
ہونے کی ہمت ہے اور نہ کالج کو جنگ و جدل کا اکھاڑا بنانا  
منظور ہے۔ درمیان میں بھی سینہ میں دل، منہ میں زبان اور ہاتھ  
میں قلم رکھتا ہوں۔ چپ چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ  
کو باضابطہ اور علانیہ ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا مگر کم ہمت  
مسلمان کچھ ایسے بدنام ہیں کہ میں کچھ بولوں تو پھر وہی زمانہ  
آجائے جو سید محمود کے زمانہ میں مرزا عابد علی بیگ صاحب



### آیات قرآنی سے مزین یونیورسٹی مسجد کی حسین و جمیل محراب اور منبر

جلسہ یہاں تک کہ عید البقرہ اور عید کا ہم مسلمانوں میں نہ ہوتا تھا کہ جس میں ہندو شریک نہ ہوتے ہوں۔ دونوں قومیں شکر و شکر تھیں اور ایک برادر ہی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر میں

دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے اپنے وطن میں دیکھا تھا کہ کوئی تقریب خوشی کی اور غمی کی ہندوؤں میں نہ ہوتی تھی کہ ہم مسلمان نہ بلائے جاتے ہوں اور کوئی

۱۰۰ ڈیڑھ بجٹ ہمارا گت ۷۹۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منبر



دیکھتا ہوں کہ جب سے انگریزی تعلیم نے ترقی کی ہے اور  
ہندوستانی کچھ کچھ تعلیم پانے لگے ہیں تب سے دوستی گشتی لا  
دستی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا تعلیم نے جس سے اتحاد پیدا ہونے  
اور نفاق و اختلاف دور ہونے کی امید ہو سکتی تھی۔ یہ جھگڑا  
پیدا کیا ہے؟ کیا علم سیکھ کر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے  
سے متنفر ہونے لگے ہیں؟ مگر یہ ایک ایسا حقیقی واقعہ ہے جس  
سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ روز بروز تعصب بڑھتا جاتا ہے  
ایک دوسرے کو برا سمجھتے ہیں اور علانیہ جڑا کہتے ہیں بعض  
گروہ تعلیم یافتوں کا اور بعض اخبار اور رسالے ہندو اور  
مسلمانوں کے نفاق کی آگ مشتعل کرنے کے لئے ہی گویا پدا  
ہونے ہیں اور بجائے پانی کے اس آگ پر تیل ڈال رہے  
ہیں۔ اس نا اعلیٰ کو دونوں قوموں کے سمجھدار اور نیک دل  
آدمی رنج سے دیکھتے ہیں اور نہایت افسوس کرتے ہیں کہ  
تعلیم کا تو نتیجہ یہ نہ ہونا چاہئے اور چونکہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے  
ہے۔ اس لئے سوائے اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ یہ تعصب  
تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ کامل تعلیم نے جن کے دلوں پر اثر کیا ہے  
وہ اس گناہ سے پاک ہیں مگر بہت سے مدعیان تعلیم ایسے  
ہیں کہ مسلمانوں کے بزرگوں، ان کے بادشاہوں اور ان کے  
مذہبی پیشواؤں کو ایسے بڑے الفاظ میں یاد کرتے ہیں کہ سننے  
والے کا خون جوش میں آجاتا ہے۔ مسلمان بھی کچھ کمی نہیں  
کرتے۔ یہ ایک نہایت بد نصیبی کی نشانی ہے اور دونوں قوموں  
کے لئے یہ باتیں شرم کے لائق ہیں۔

دونوں فرقوں کے سب ہی لوگ تو متعصب نہیں  
ہیں۔ میں نے کہا، فسادات تو فتنوں میں ہوتے ہیں جو نہ



مہاجر علی محمد خاں آف احمد آباد، دسمبر ۱۹۲۲ء سے فروری  
۱۹۲۳ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے



صاحبزادہ آفتاب احمد خاں یکم جنوری ۱۹۲۳ء سے ۲۱ دسمبر  
۱۹۲۶ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے





نواب سر محمد مزمل اللہ خاں - مارچ ۱۹۲۲ء سے ۲۱ دسمبر تک  
اور اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۲۳ء سے ۲۱ دسمبر ۱۹۲۶ء تک  
(ایکٹنگ) وائس چانسلر ہے

ہندو ہوتے ہیں اور وہ مسلمان ایسے لوگوں کا تو کوئی مذہب  
نہیں ہوتا۔ مگر یہ لوگ آگے دن کے فسادات سے دونوں  
فرقوں کے سمجھارہ گروں کے دلوں میں بھی نفرت کا بیج بویہ  
ہیں اس طرح سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک خار  
بتا جا رہا ہے حالانکہ کچھ لوگ اس خار کو بھرنے کی بھی کوشش  
کے رہے ہیں۔ لیکن اختلافات ہیں کہ بڑھتے ہی جاتے ہیں  
آؤ کس طرح یہ خار بھرے گا؟

میرے بچہ کی حسرت کو سمجھتے ہوئے محسن الملک نے بھاتے  
ہوئے کہا " میں دیکھتا ہوں کہ جو خار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ  
حائل ہے بعض نیک دل اور ملک دوست اس پر پل بنانے اور  
اس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کے لئے نصیحت  
کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے روز بروز وہ خار زیادہ گہرا، زیادہ  
چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ، چونا لاؤ  
اور اس خار کو برابر کرو۔ مگر ہاتھ میں پھاؤٹے اور کمال ہیں اؤ  
بجائے بھرنے کے وہ خار اذیت دینا شروع کیا جاتا ہے۔  
" تو پھر اس سلسلہ میں کیا کیا جائے؟ " میرے بچہ میں  
حسرت برقرار تھی۔

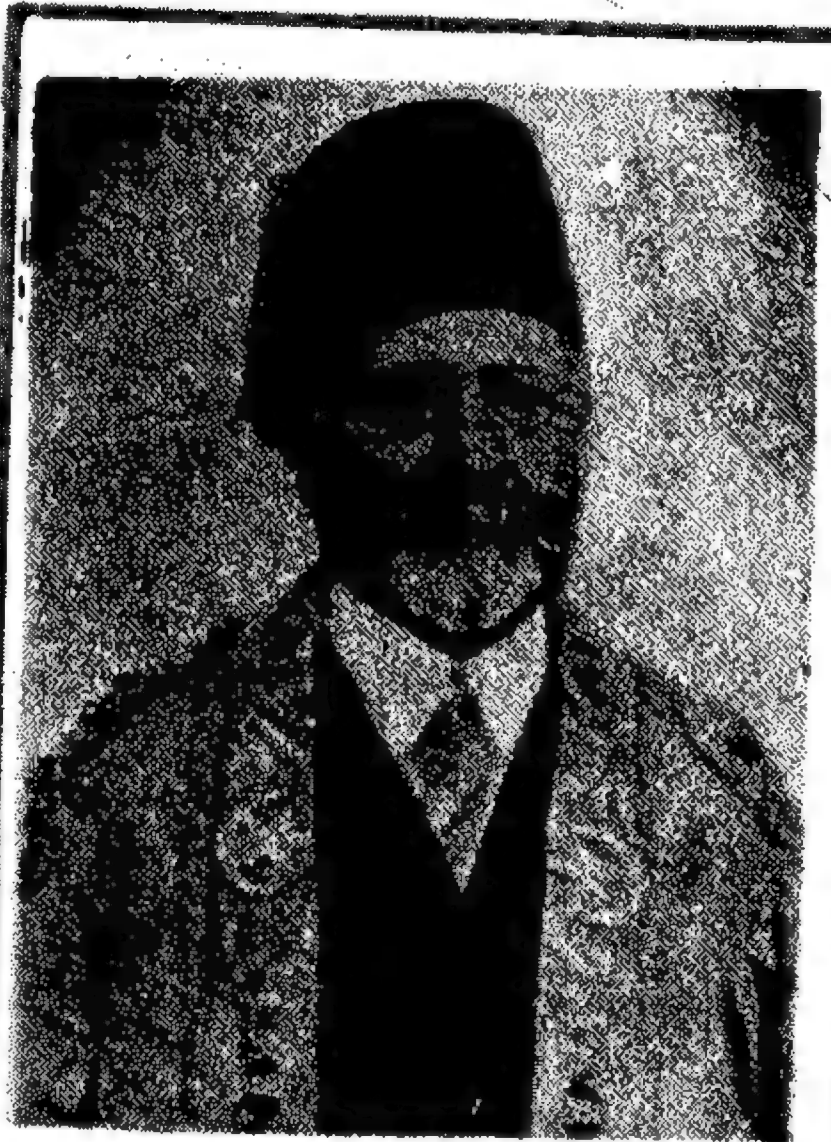
" ان لوگوں کو " محسن الملک نے کہا " جو حقیقت اتحاد  
کے خواہاں ہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس ملک بیماری کا علاج بنان  
سے نہیں ہو سکتا بلکہ ہاتھ سے۔ یہ اختلافات پلیٹ نام پر فصیح و  
بلغ پرکھ دینے سے دور نہیں ہو سکتا بلکہ وجوہ اختلاف پر غور کرنے  
اور اس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہو سکتا ہے  
" دیکھتے دراصل ہندوؤں کی چند سیاسی پارٹیاں ہی اس قسم  
کا ذہن پھیلاتی ہیں اور پھر جہاں نقصان اٹھاتے ہیں تو وہ بھی۔ "

سر سید مرحوم کے پوتے سر سید اس مسعود جو ۸ فروری  
۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء تک  
یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

ایڈیٹور: جماعت ۸۱



”میرے عزیز! محسن الملک نے میری بات کاٹے ہوئے  
 کہا ” دوسروں پر الزام رکھ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ یاد رکھو! تم ہرگز سرسید کے پیروں کے جانے والے نہیں ہو سکتے۔ تم تعلیم یافتہ کہلاتے  
 جانے کے مستحق ہو گے اگر تم نے اس لڑہائیے مادے کو اپنے ضمیر میں  
 سمایا تو تم کو ہرگز اور تم نے بھی ہندو مسلم میں فرق سمجھا کر  
 تم دیکھو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا بلکہ تمہاری  
 ساری قوم کو ہوگا۔ اور نہ صرف تم بدنام ہو گے بلکہ یہ کایا (مسلم  
 یونیورسٹی) بھی بدنام ہوگا اور ہم پر اس کا الزام آئے گا۔ مجھے  
 ہدایت و دعائی تکلیف ہوتی ہے۔ جب میں بعض اجنبیوں میں بیکتا  
 ہوں کہ علی گڑھ پارٹی متعصب ہے اور اس کے تعلیم یافتہ نوجوان  
 ہندوؤں کے مخالف ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے  
 انہیں کافیاں یا عمل اس پر جو تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ سب تو تم  
 کو کس نے سکھایا۔ کیا مرحوم سرسید نے؟ اور کیا ہم نے؟ حاشا  
 کلام سرسید نہ ہم اس کے طرز میں بلکہ برعکاس اس کے ہم نہایت  
 حقارت و نفرت سے کسی باتوں کو دیکھتے ہیں۔“



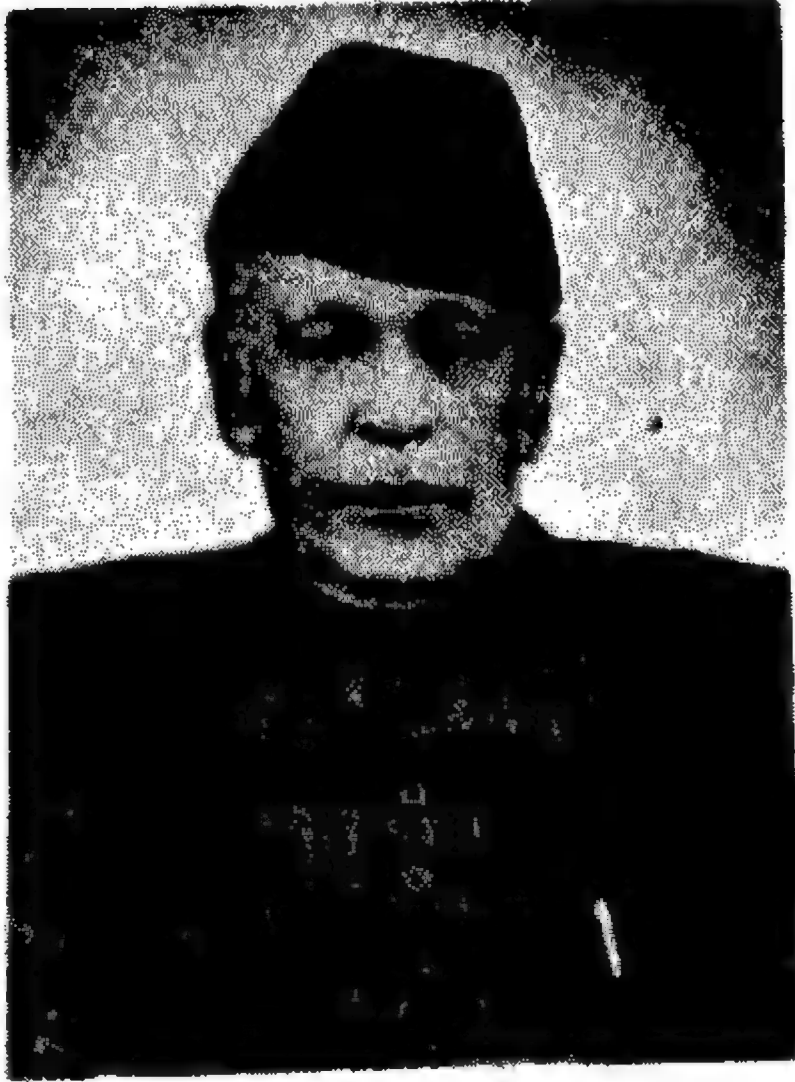
ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء سے ۲۹ اپریل  
 ۱۹۳۸ء تک اس کے بعد ۲۳ اپریل ۱۹۳۹ء سے ۲ اگست  
 ۱۹۴۰ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

”دراصل ہم پر الزام لگانے والے وہ ہیں مسلم یونیورسٹی  
 کا وجود جن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ وہ نہ اس  
 تعصب سے ہم لوگ بہت دور ہیں۔ مسلم یونیورسٹی تو محبت کد ہے  
 جہاں نہ کوئی ہندو نہ کوئی مسلمان بلکہ سب مادہ دس گاہ کی  
 آغوش کے پھول ہیں یہاں کے ہندو مسلم طلباء میں کوئی اختلاف  
 نہیں ہم سب بھائی بھائی کی طرح مل جل کر رہتے ہیں اور یہ  
 قومی یکجہتی فرقہ پرستوں کو کھٹکتی ہے اسی لئے وہ ہم پر فرقہ پرستی  
 کا بے بنیاد الزام لگاتے ہیں: میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا  
 ”میرے عزیز! محسن الملک نے کہا ” میرا پیغام اپنے ساتھیوں



→ سر شاہ ولی خان ۹ فروری ۱۹۲۹ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء  
 تک اور یکم مارچ سے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء تک اس کے بعد  
 ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء سے ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء تک یونیورسٹی کے  
 وائس چانسلر رہے





نواب محمد اسماعیل خاں ایم اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء تک اور پھر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۲۶ء تک وائس چانسلر رہے

مکمل پیچیدہ بنا کہ اسے میرے عزیز بھو! کبھی ایسے (فرقہ پرستی کے) خیال کو تم دل میں نہ لانا کبھی ایسی بات کو جس سے جھگڑا پیدا ہو نہ ہو ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو۔ ان کے بزرگوں کو عزت اور ادب سے یاد کرو۔ ان کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ۔ ان کے ساتھ پیادہ و ستانہ برتاؤ کرو جس سے وہ خود شرمندہ ہوں وہ تمہارا قتل اور تمہاری دوستی دیکھ کر تمہاری قدر کریں۔ وہ تمہارے بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنے لگیں اور بجاتے بدی کے نیکی کا پتاؤ دیکھ کر وہ خود اپنے طرز عمل کو بدلنے پر مجبور ہوں۔ یہ انصاف کی بات نہیں کہ تم اپنے آپ کو معصوم اور پاک سمجھو اور اختلافات کے سارے گناہ کا الزام ہندوؤں کو دو۔ تم اس کا بی (مسلم یونیورسٹی) کے نیک نام طالب علم اور سرسید کے بچے مقلد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت کچھ جاؤ گے جبکہ تم اپنے ہوطنوں، اپنے بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کر داور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو۔ ان ناقص تعلیم یافتہوں کو نہ دیکھو جو اختلاف پیدا کرنے کے خواہاں ہیں بلکہ ان عالی و مارغ ہندوؤں کی باتیں سنو جو اتحاد اور اتفاق بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

محسن الملک نے اپنے لڑتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بھرتائی ہوئی آواز میں کہا: اے خدا! تو ہندو اور مسلمانوں پر رحم کر اور دونوں کے تعلیم یافتہوں کو توفیق دے کہ وہ عناد کی اس آگ کو بجھا دیں نہ کہ اس کو تیز کریں! ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

ان کے آنسوؤں میں میں نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا: آئیے چلیں درس گاہ کی طرف۔ میں نے خود کو سنبھال کر جلدی سے کہا۔ وہ ایک نیک بھیتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔



سٹر زاہد حسین ۲۳ اپریل ۱۹۲۶ء سے ۷ اگست ۱۹۲۶ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے  
اور ڈائجسٹ بمبائے ۸۳



ایک یا دو افراد کو مجروح یا ظاہر سیف الدین سابق چانسلر  
نواب پھتاری (موجودہ چانسلر) کے ساتھ



ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے

۱۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

مسلم یونیورسٹی کے دانش چانسلر رہے

(آپ اعزازی خزانچی کے عہدے پر بھی ۲۰ نومبر ۱۹۳۸ء)

۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء تک نامور رہے

پھر دھیرے سے بولے "اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے واپس ملنا

ہے۔ دہاں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ میں پھر آؤں گا۔“

”کب۔“ میں نے سوال کیا۔

”اس وقت جب تمہاری آنکھوں میں مایوسی کے بجائے

خوشی کی چمک ہوگی :- یہ کہہ کر حسن الملک غائب ہو گئے۔

۸۴ اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۲ء

# علی گڑھ کی روایات

مرتبہ - پروفیسر خلیق احمد نظامی



۱۹۷۰ء میں یونیورسٹی کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک کتاب "علی گڑھ کی روایات" شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ اور اس سلسلہ میں کافی مواد بھی جمع ہو گیا تھا۔ جوبلی ملتوی ہوئی تو کتاب کی طباعت کا خیال بھی ذہن سے اتر گیا۔ یہ صفحات اسی کتاب کے ہیں اور مدیر ہما کے اصرار پر اس کتاب کا مسودہ ناظرین ہما کے لئے ان کے حوالے کر دیا ہوں (نظامی)

سرسید کی آرزوؤں کو پورا کیا۔ تم جانتے ہو کہ ان کی کیا آرزو تھی، اور تم کو معلوم ہے کہ وہ تم سے کیا امید رکھتے تھے۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو یا تمہیں یاد نہ رہا ہو تو میں تم کو یاد دلاتا ہوں۔ انہوں نے ایک موقع پر اسی مدرسہ کے بورڈروں کے خط کے جواب میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ

"اے میرے بچو اور میرے قومی بھولو! میری زندگی اور موت تمہارے لئے ہے۔ تم یقین جان لو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوشی اور آرام سے دہن کے سونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہے گا کہ ہم کنوینٹنٹ العروس اور اگر خدا نخواستہ تمہاری حالت دین میں یا دنیا میں اچھی نہ

بانی درس گاہ کی آرزوئیں اور قوم کی امیدیں ہماری روایات کی بنیاد ہیں  
نواب محسن الملک نے ایک بار طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ا

میرے عزیزو! تم درحقیقت دنیا میں ایک نئے مسلک اور نئے نظام کا نمونہ ہو سارے ملک کی نگاہیں تم پر ہیں۔ اور تمام قوم کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ اور تم اگرچہ اس دور میں شاگردی کے درجہ پر ہو مگر تم ہی آنے والی نسل کے استاد اور رہبر اور پیشوا بننے والے ہو اور تم ہی کو آئندہ نسلوں کے اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ کس طرح تم نے اپنے فرائض ادا کئے اور کس طرح تم نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے راستہ صاف کیا۔ اور تم ہی کو اپنے طریق عمل سے یہ بتانا ہے کہ تم نے کہاں تک اپنے پیشوا اور اپنے بزرگ





یونیورسٹی کانو کنیشن  
کے چند مناظر  
دائیں سے بائیں: پروفیسر  
قاسم مظہر الدین احمد، پروفیسر  
(دینیات) پروفیسر  
انوار الحق، محکمہ فیکلٹی  
آف سوشل سائنس  
پروفیسر خیر الدین احمد  
(فیکلٹی آف سائنس)  
پروفیسر مطلوب احمد  
انصاری (فیکلٹی  
آف آرٹس) پروفیسر  
قمر الحسن قادری  
(فیکلٹی آف کامرس)  
اور دوسرے معلمین  
بچی کے سابق گورنر  
سر سرتی گوپال ریڈی  
کانو کنیشن ایسوسی ایشن  
سے ہیں۔ سر سرتی گوپال  
آف چھاری گاندھ احمد  
سید خان پانڈا، کانو کنیشن  
کانو کنیشن میں کئی  
تشریف لائے ہیں

ہے اور دوسری قسم کا امتحان جہاں یا جاتا ہے وہ تہلہ انگریز  
اور تہلہ شہر اور تہلہ ملک ہے۔ علمی امتحان کے نتیجے میں  
ہیں اور اطلاق امتحان کے نتیجے میں غیر محدود۔ تم میں سے ہر ایک  
پہلے امتحان کو مشکل سمجھتا ہے اور اسی کے لئے محنت کرتا ہے  
اور اسی کی کامیابی یا ناکامیابی پر خوش یا رنجیدہ ہوتا ہے  
مگر حقیقت دوسرا امتحان نہایت مشکل ہے اور اصلی خوشی  
اسی امتحان کی کامیابی پر موقوف ہے۔

(پیکر ۱۵ جون - ۱۹ سٹڈنٹس یونین کلب ص ۱۲)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔  
(پیکر، سٹڈنٹس یونین کلب - ۱۵ جون - ۱۹ ص ۱۲)  
میں ان کے طلباء کو دو امتحان دینے پڑتے ہیں  
**ایک علمی دوسرا اخلاقی**

نواب محسن الملک نے طلباء سے کہا۔  
”تم کو یہاں دو قسم کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک علمی  
دوسری اخلاقی۔ اور دونوں چیزوں میں تم امتحان دینے کے  
لئے تیار کئے گئے ہو۔ پہلے قسم کے امتحان کا دارالامتحان یونیورسٹی





اتحاد قومی کا نمونہ۔ سید مسعود کی بسم اللہ کی تعتریب  
میں سرسید نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”اے حضرات! گویں نے اس وقت قوم ہی کا محبت  
گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت  
اور برادرانہ محبت نہیں ہے، ہماری قوم خراب حالت میں ہے اسی  
لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے۔ نہ ہم اور قوموں سے کبھی ایسی  
ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس  
کے علاوہ دشمنیت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر

ملیکزادہ مسلم یونیورسٹی نمبر

اس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔  
جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر داس اور ان کی میم صاحبہ نے  
موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام  
اس کو دے دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس  
کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی وجہ سے اس کا نام سید  
داس مسعود قرار پایا۔

”دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر کی طرف  
نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ دادھی

ایڈیٹوریل نمبر ۲۷ اگست ۱۹۷۷ء

منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید اس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھاتے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو ”چچا“ کہتے ہیں اور سید اس مسعود ”دادا ماجہ“ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔“

(حیات جاوید ج ۲ ص ۹۹-۱۰۰)  
اعتراف جرم کا اندازہ۔ ایم اے او کالج کے طلباء میں ایک شورش ہوئی۔ عزیز مرزا (والد ڈاکٹر بابر مرزا سابق صدر شعبہ حیوانیات) نے جو اس زمانہ میں طالب علم تھے اس میں خاص حصہ لیا اور کالج سے نکال دیئے گئے۔ علی گڑھ چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں ملازمت کر لی پہلی تنخواہ ملی تو سرسید کو دکھایا۔  
• عالی جناب آداب

زمانہ سابق کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم سے گردن نہیں اٹھا سکتا مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی دہنیر ہے کہ اگر خاموشی کے دامن میں پناہ لیتا ہوں تو خدا کو کیا جواب دوں گا کہ۔ کیا رنج اپنے باپ سے زیادہ مربی کو پہنچایا ہے میرا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ جس کالج کے آغوش میں تربیت پائی تھی اس کا ہوا خواہ اور معاون ہوتا لیکن افسوس ہے کہ کچھ عرصہ تک میں نے اس کے خلاف کوشش کی جس کی سزا یہ ہے کہ میں خود اپنے افعال پر گریاں ہوں۔ گو اس وقت ہذا کوس کے فاصلہ پر پڑا ہوں لیکن اے سید والا اپنے مبارک قدم اٹھا کر دیکھئے، کسی پشیمان کا سر آپ کے قدموں میں پڑا ہوگا! ہمارے ایشیائی شاعروں نے اپنے بھوں کو نلے خون جگر سے لکھے ہیں لیکن اس وقت یہ عریضہ آبِ نجات سے لکھ رہا ہوں اور قسم ہے اس نورانی ریش کی اور اس دل فریب رگ ہاشمی کی جس کو میں نے ہمیشہ شوق و تعظیم کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ کبھی شاعروں کے دل پر ایسا اثر نہ تھا جیسا کہ اس وقت میرے دل پر ہے میں جانتا ہوں کہ پشیمانی مجھ کو اس وقت تک ملت

نہ دے گی جب تک یہ سرجس نے سرکشی کی تھی آپ کے قدموں پر نہ ٹھکے میں اس وقت تک اپنے کو تنگ قوم سمجھوں گا جب تک اس صدمہ کی جو ہماری نادانی سے قومی کالج کی شاخ کو نہال پر پہنچا ہے تلافی نہ کروں میں اس وقت تک انسانیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ میں اپنے ہر قوم سرسید کی یاد سے اس طوفان بے تیزی کو محو نہ کر دوں۔ مجھ کو یاد ہے کہ اس زمانہ میں میں کالج کے خلاف مضمون اخباروں میں لکھنے پر غور کرتا تھا لیکن اس میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے وہ مضامین میری نفسیات پر مبنی تھے میں خوب واقف ہوں کہ میں نے طلباء کو پوشیدہ جلسوں میں جمع کیا اور ان کی نوجوان طبیعتوں کو اپنی طاقت ستانی سے برا بھلا کیا لیکن اس وقت میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے انتقام کا خون کیا۔ احسان کی گردن کاٹی اور حق کو پامال کیا۔ فرض کہ اس وقت اپنے جس فعل پر غور کرتا ہوں وہ مذمت سے خالی نہیں، ہر چند چاہتا ہوں کہ ان افعال کی تلافی کروں لیکن اب وہ میرے قبضہ قدرت سے باہر ہیں میں اس وقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ سے عفو و تغیر چاہوں اور آئندہ مدد سے کی خیر خواہی اور امداد کو اپنا فرض نہیں تو واجب ضرور سمجھوں۔

اے سید والا! جو جوش ایک سال کی گمراہی کے بعد اس وقت پیدا ہوا ہے وہ اس قدم ہے کہ اگر کئی صفحے لکھوں تو تھوڑا سا ہے لیکن آپ کے عزیز وقت کا خیال کر کے بس کرتا ہوں آپ کے کریمانہ اخلاق سے امید ہے کہ آپ میری ان حرکات کو جن کا میں نے خود اقرار کیا ہے معاف فرمائیں گے اور کچھ کو بار غلطی سے سبک دیش کریں گے۔

میری یہ تمنا تھی کہ اپنی پہلی تنخواہ اس کالج کی مذکورین استاد عا کرتا ہوں کہ میری عرض قبول فرمائی جائے۔“

آپ کا نام بعد از عزیز مرزا  
علی گڑھ کیا سکھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی گڑھ

کے متعلق ایک خطبہ میں کہا تھا ۔

"یہاں بہت کچھ سیکھا، اور زیادہ نہ سیکھ سکے پر دیگر ہونا سیکھا، ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا متمم بنانے کا دہرا رہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلافات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے سارے عیب بر ملا دیکھ پر اس کے پکھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اسکی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی میرے اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے بھرک اٹھے، مگر پچھے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کوئیلوں کو نشوونما دے سکے لئے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت مگر سیرت کی تعمیر کے لئے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ دار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہیں فرما نبرہاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب ہمہ پیشوں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعار کی کے ساتھ خود اختیامانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت کی بھی اسی چترہ حیات سے اندازنی ہوئی، باغی بنے، نکلے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادہ علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی بنیاس میں بھی دل اس میں افسانہ حالات بدلے ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمہ دارانہ حیثیت سے اسکی خدمت کا موقع میسر آیا۔ بری بھلی جو بن پڑی خدمت کی اور امید

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

تھی کہ عمر بھر کی سرشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بائیں آسائش نصیب ہو جائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں غل ہوئی رہی، بالآخر محبت فرمادی کے احساس نے قلب پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔ آج کا سہ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے۔ اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گزاردی سے بھرا ہوا ہے اور ان تمام کوتاہیوں پر جو دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے میرے لئے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے، آپ اس پر اس نفع اعلیٰ کا اضافہ کر رہے ہیں۔

من جوئے مست و ساقی پرودہ پیمانہ را

(مسلم یونیورسٹی گزٹ (ذکر نمبر) ۲۴ فروری ۱۹۵۷ء)  
استاد کا ادب ۔ مولوی عنایت اللہ (مولانا ذکار اللہ دہلوی کے بیٹے) مدرسۃ العلوم میں پڑھتے تھے انکی فارسی کی کلاس مولانا شبلی پڑھاتے تھے۔ کلاس میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ مولانا شبلی انکو اکثر ڈانٹا کرتے تھے اور ان کے والد سے بھی شکایت کرتے رہتے تھے۔ مولوی عنایت اللہ کو بھی مولانا شبلی سے ضد ہو گئی تھی۔ ان کی نظموں کو مذاقیہ انداز سے ہوشل کے ہر کمرے کے پاس کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ مولانا شبلی کو جب خبر ہوئی اور زیادہ خفا رہنے لگے۔ لیکن یہ ساری آرزو کی ایک معمولی سی بات پر جاتی رہی۔

"ایک روز وہ (مولانا شبلی) چاندنی چوک دہلی میں کسی دوکان سے جوتے خرید کر لے جا رہے تھے کہ میری نظر ان پر پڑی میں نے ان کو سلام کیا اور بڑھ کر ان کے ہاتھ سے جوتے لے لئے کہ میں قیام گاہ تک پہنچا دوں بس بے حد خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ شریف خاندان کے بچوں سے اسی قسم کے اخلاق کی توقع ہوتی ہے؟

(علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر ج ۲ ص ۱۷)

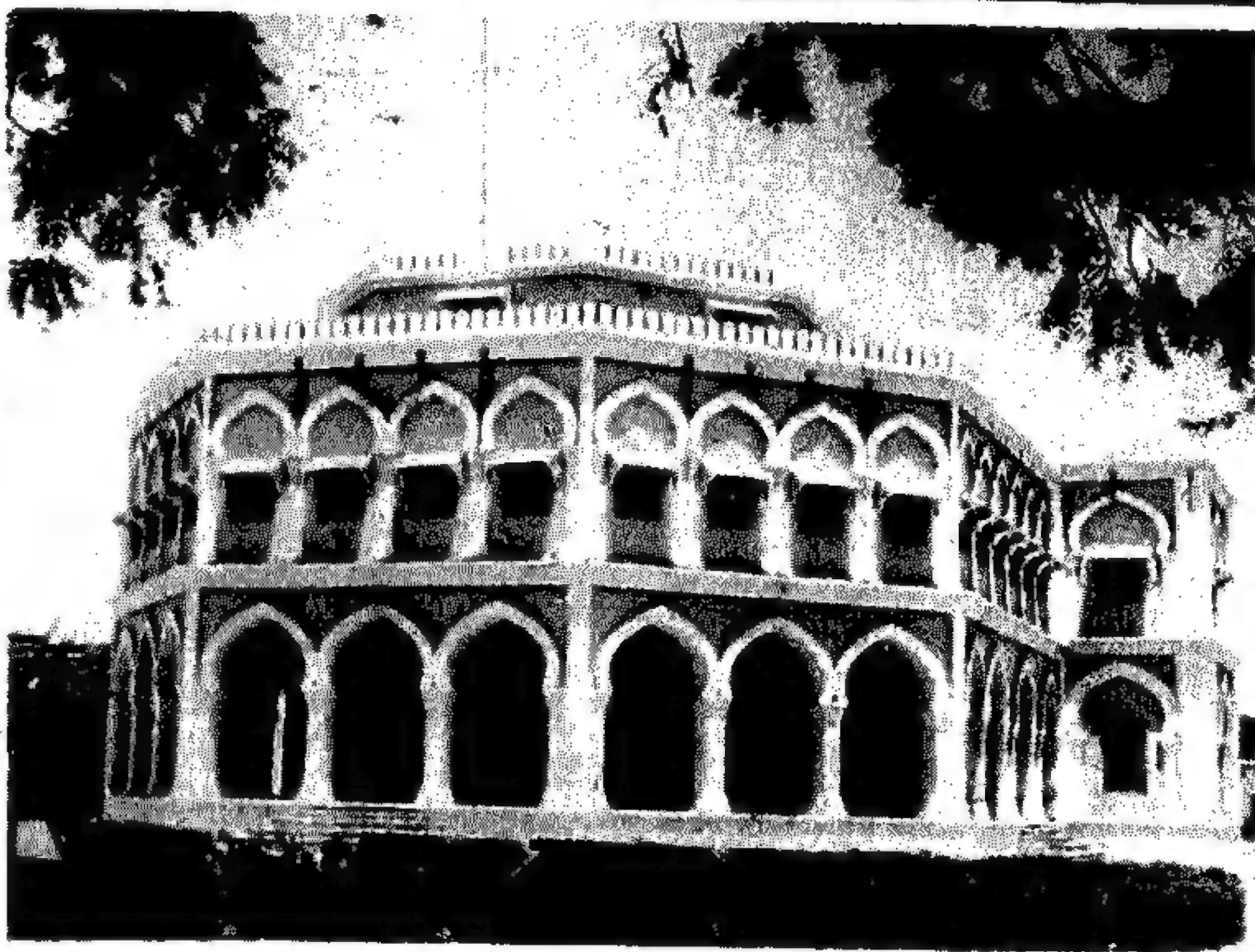
اردو راجسٹ ہماگست ۷۲ء ۸۹



کا ایک فی صد کالج کی امداد کے لئے دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ اسی جماعت نے قدیم طلباء کو باہر سے مدعو کر کے سالانہ ڈیڑھ کی ابتدا کی۔ گویا کہ کالج قائم ہونے کے سترہ سال بعد قدیم طلباء کو مادر در سگاہ میں دعوت دیکر ان کے ساتھ مستقل تعلقات قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ طلباء کی امداد کا صیغہ راز میں رہنا ۱۸۸۱ء میں

یہاں طلباء کیسی انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں اس لئے قائم ہوا کہ طلباء تقریر میں مہارت پیدا کریں اور اخبارات کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ انجمن اخوان الصفا ۱۸۸۹ء میں اس لئے قائم کی گئی تاکہ طلباء کی زندگی میں پاکیزگی پیدا کی جائے۔ ان کی علمی

مسلم یونیورسٹی  
کا  
اسٹوڈنٹس  
یونین ہال



بورڈنگ ہاؤس مدرسہ العلوم کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا۔

”جو رازداری اس امداد کے صیغے میں کمیٹی نے ابتدا سے اختیار کی ہے وہ اب تک قائم ہے اور آئندہ بھی با احتیاط تمام قائم رکھی جاتی ہے۔ ان قابل رحم مسلمان طالب علموں میں جو بورڈ ہیں وہ عام بورڈوں کے ساتھ مساوی

قدیمت بڑھائی جائے اور آپس میں برادرانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

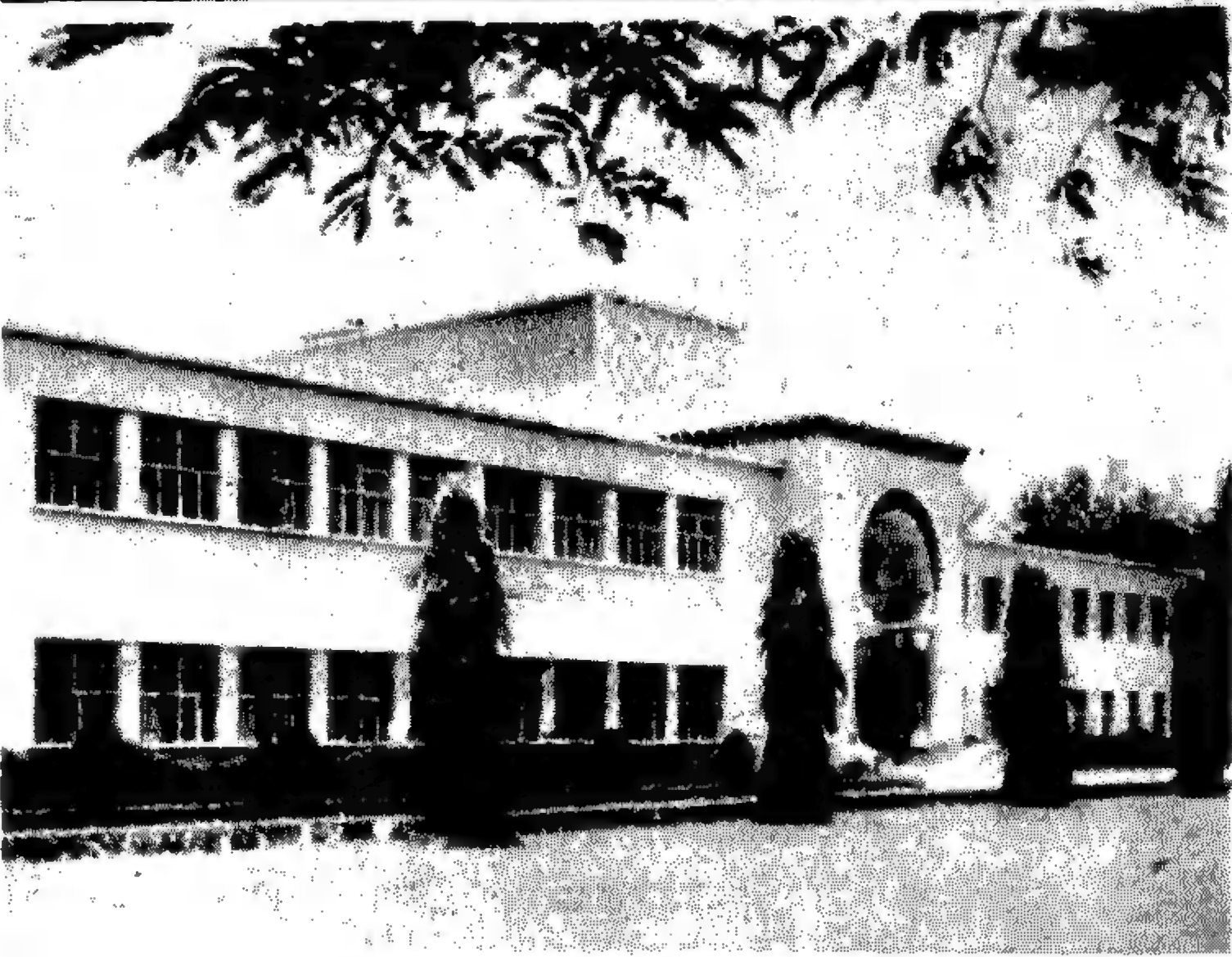
ڈیوٹی سوسائٹی ۱۸۹۰ء میں اس لئے قائم کی گئی تاکہ علی گڑھ کالج کی نسبت ملک میں غلط افواہوں کو دور کیا جائے اور اس کی اصلی خوبیوں کی اشاعت کی جائے۔ بعد کو اسی سوسائٹی نے طلباء کی مالی امداد کے لئے چندے جمع کئے۔ برادر ہٹو ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئی، اس کے ممبر اپنی آمدنی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منیجر

۹۰، اردو بھٹ جماعت ۱۸۹۲ء

روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جس کی سدا  
گر نکل کر اک غذا محلوں سے باہر دیکھتے  
ہے اندھیرا گھپ و ردیوار پر چھایا ہوا  
سرخ رو دریا میں وہ حاجت روبرو نہیں  
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں  
اپنی مدد آپ، مرید کہا کرتے تھے۔

حقوق سے بسر کرتے ہیں، منبر و منبر خاص  
فستکین کے سو کسی شخص کو یہ معلوم نہیں ہے  
کہ امدادی طالب علم ان میں سے کون سے  
ہیں، یہاں تک کہ ہر وقت پاس شہنشاہی  
طالب علموں کو بھی اس کا کچھ علم نہیں ہے۔  
(ریپورٹ سلاٹ ۱۵)



مولانا آزاد  
لائبریری  
کا  
ایک  
منظر

”انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں  
کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خفیہ طے، گورنمنٹ  
فیاض ہوا اور ہمارے سب کام کر دے۔  
اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے  
کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔“

ان کی اس تہنید سے متاثر ہو کر ایک مرتب پانی  
کی کمی کو دور کرنے کے لئے طلباء نے خود ایک کنواں کھودا تھا

خدمتِ خلق کا جذبہ بد حالی نے علی گڑھ کو ایک بڑھیا  
کے چرخ سے تشبیہ دی ہے اور لکھا ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا  
ایک بڑھیا نے سربہ لاکے روشن کر دیا  
تاکہ وہ گہرا پردہ میں کہیں ٹھوکر نہ کھائیں  
ماہ سے آسائے گند جائے ہر لک چھوٹا بڑا  
یہ دیا بہتر ہے ان جھٹوں سے اور اس لمپے

استادوں کی طلباء سے محبت و سٹریک پرنسپل ایم اے ارکلیج اپنے طلباء سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے ایک عزیز شاگرد احمد حسین خاں بی اے (مراد آبادی) کا ستمبر ۱۹۸۸ء میں عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ بیک صاحب کو بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے اپنے شاگرد کی مستقل یادگار کے واسطے پانچ سو روپیہ دیا اور احمد حسین کا نا اٹریجی ہال میں کندہ کرایا۔

ڈپٹی جیب اللہ خاں کا خیال تھا کہ ہندوستان کے کسی کالج کے پرنسپل نے اپنے شاگرد کی کوئی یادگار اس طرح قائم نہیں کرائی ہے۔

اختلاف رائے میں بھی احترام کا پہلو۔ نواب جیب الرحمن خاں شیروانی لکھتے ہیں:-

"میرا مشاہدہ ہے کہ (نواب وقار الملک) آخر وقت تک تنہائی میں بھی سرسید کا ذکر اس ادب اور عقیدت سے کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیلہ اپنے گرو کا ذکر کرتا ہے ایک واقعہ سنو۔۔۔ حیدر آباد سرسید ڈیپوٹیشن میکر گئے ہیں وہاں سے یہ مشورہ ہوتا ہے کہ ڈیپوٹیشن کی کامیابی کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ ہزہائینس میر محبوب علی خاں بہاول کا عہد تھا۔ طریقہ کار میں محسن الملک اور وقار الملک کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف رائے ان دونوں ناموروں کے درمیان عام تھا۔ سرسید محسن الملک کی رائے اختیار فرماتے ہیں اسی رائے پر عمل ہوتا ہے۔ باریابی ہوتی ہے۔ گرانٹ ایک ہزار روپیہ ماہوار سے دو ہزار ہو جاتی ہے۔ سرسید واپس آکر اپنے قیام گاہ کے کمرہ میں ہیں۔ عمائد حیدر آباد کا مجمع ہے کامیابی پر مسرت و مبارکباد ہے۔ سرسید نے کہا کہ مشتاق حسین نے ہمدی غلی کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ کامیابی انہی کی رائے سے ہوئی۔ مولوی شبلی کی شہادت ہے کہ بھرے مجمع میں وقار الملک اٹھے، گھٹے ہوئے سر پر سے ترکی ٹوپی اتاری، سرسید

کے سامنے سر جھکایا اور کہا کہ آپ بزرگ ہیں، اس چاند پر جوتے ماریں، مگر عرض یہی کروں گا کہ وہ راتے غلط تھی۔ اگر میری راتے اختیار فرمائی جاتی تو اس سے زیادہ کامیابی ہوتی۔" علی گڑھ کے مردکان کار۔

علی گڑھ میگزین، جنوری ۱۹۲۹ء ص ۲۹  
درس گاہ کا پرنسپل تاثیر ماحول:- جالی جب پٹی بار علی گڑھ آئے تو ان کا دل اس درس گاہ سے جس قدر متاثر ہوا، اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ہفتہ گزشتہ میں حسن اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے کا موقع ملا، ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے مدرسہ العلوم کا احاطہ بہت قریب تھا۔ یہ پہلا ہی موقع مدرسہ العلوم کے دیکھنے کا ہم کو ملا تھا۔ اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلباء کی حاضری میں بھی کمی تھی مگر جس قدر مدرسہ کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی اس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اسکو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم بڑے بڑے مقدس و اعظونی مجالس و عہد میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے منبر پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں۔ ہم حال و قال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے پیران ہر رقت کے گرو مریدوں اور طالب علموں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ جو تو کی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھ کر خواہ مخواہ جوش میں آتی ہے اور خالص کر ایک ایسے گنہگار مسلمان کے دل میں جیسے کہ ہم ہیں وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔ بلاشبہ جو شعر نظری نیشاپوری نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا اور بہت دیر تک ہم اس کو اپنے دامن میں پڑھ کر گنگنااتے رہے۔"

رس کعبہ و ابنا نہ بساطل نہ سادہ اند



صد معنی و جمال دیں گل نہادہ اند

(علی گڑھ میگزین ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۲۱)

تحقیق کا جذبہ :- آثار انصاریہ کی ترتیب میں جودہلی کی تاریخی حراتوں کا مستند تذکرہ ہے، سرسید نے جو رحمتیں کتبات کو پڑھنے کے سلسلہ میں اٹھائی تھیں، ان کے متعلق خود ان کا بیان ہے۔

”قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کہتے

جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاتے

تھے ان کے پڑھنے کو — ایک چھینکا

دو تیس کے پنج میں ہر ایک کہتے کے محلوں

بندھوایا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر او

چھینے میں بیٹھ کر ہر کہتے کا چر باتا دیتا تھا۔

جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا

صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے

تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر

ہو جاتا تھا۔“ (حیات جاوید ج ۱ ص ۵۵)

ہمدردی خلق برستہ میں سخت قحط پڑا۔ مراد آباد کے

محتاج خانہ کا انتظام سرسید کے سپرد تھا۔ اس کا حال سنئے۔

”سرسید صبح شام دونوں وقت بلانا فہ محتاج خانہ میں

خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے، جن کنگلوں کی صورت

اور حالت آنکھ سے پتہ نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے

تھے، اور کپڑے بول و ہماز میں ستھرے ہوتے ہوتے تھے، انکو

سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر وہ سری جگہ احتیاط سے

یجا کر لٹا دیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے

تھے، ہاتھ منہ دھواتے تھے، دوا پلاتے تھے اور نہایت

شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جے کشن داس

کا بیان ہے کہ — جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت

ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے۔“ (حیات جاوید ج ۱ ص ۱۳)

قومی درد :- نواب محسن الملک کا بیان ہے ۔

”جس تاریخ نگیشی مذکور (خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

ہندوستان) کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا، اس سے

ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا۔ رات کو سرسید نے میرا

ہانگ بھی اپنے ہی کمرے میں پھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک

مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری

آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو

ان کے ہانگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔

دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار قطار روتے

جلتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا نخواستہ کہیں سے کوئی

افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ روتے لگے اور کہہ لے

”اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے او

بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں

آتی پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے، مجھ سید

نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات ایسی اُدھڑ

بن میں گزر گئی ہے کہ دیکھنے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے

اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔“

(بحوالہ حیات جاوید ج ۱ ص ۱۳)

حمیت دینی :- سر ولیم میور نے رسول مقبول صلعم کی سیرت

پر کتاب لکھی اور اس میں تعصب اور تنگ نظری کے علاوہ غلط

بیانی سے کام لیا۔ سرسید نے کتاب کو دیکھا تو تڑپ اٹھے۔ نواب

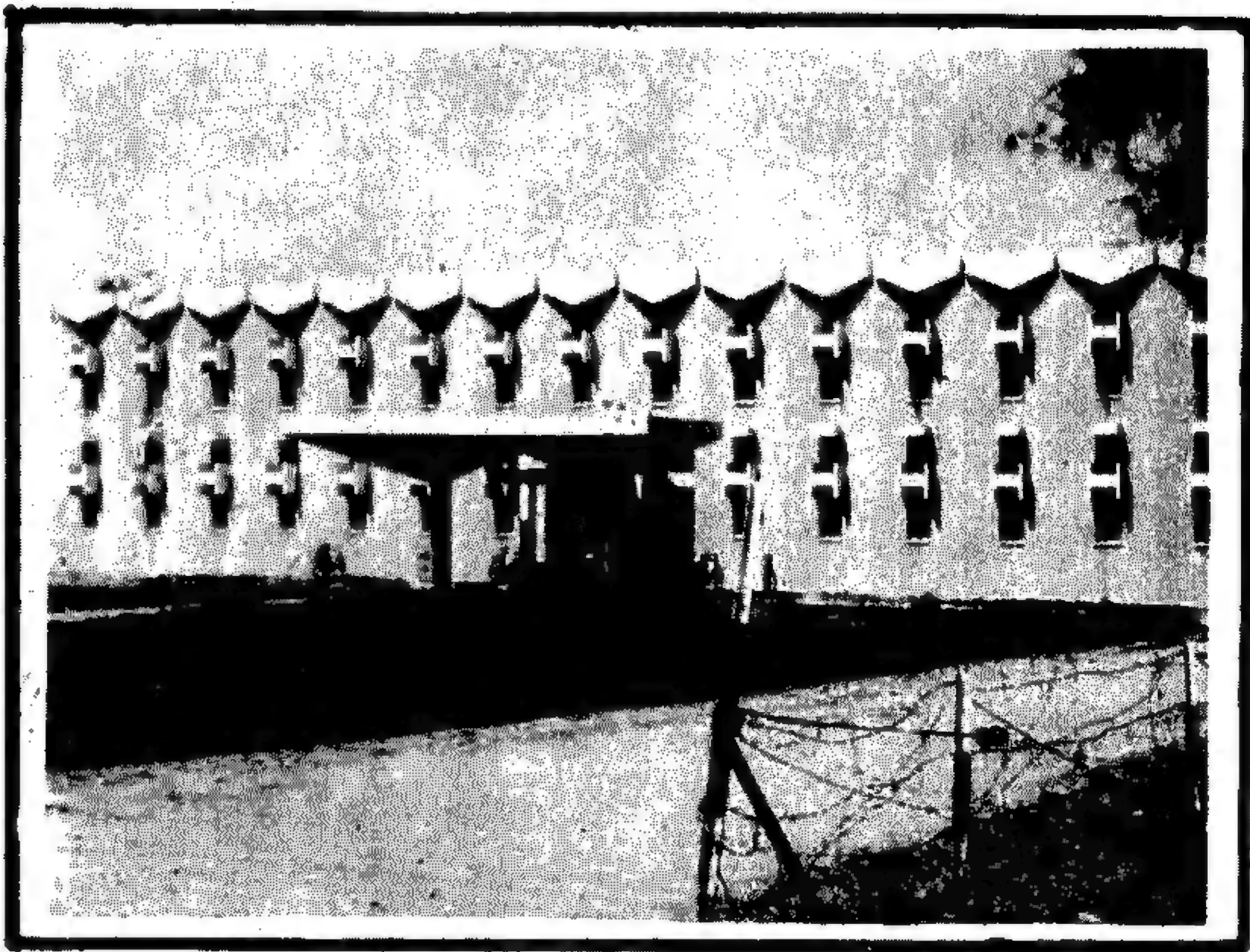
محسن الملک کو خط لکھا۔

”ان دنوں ذرا قندے دل کو شورش ہے ولیم

میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔

اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی نا انصافیاں

اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم



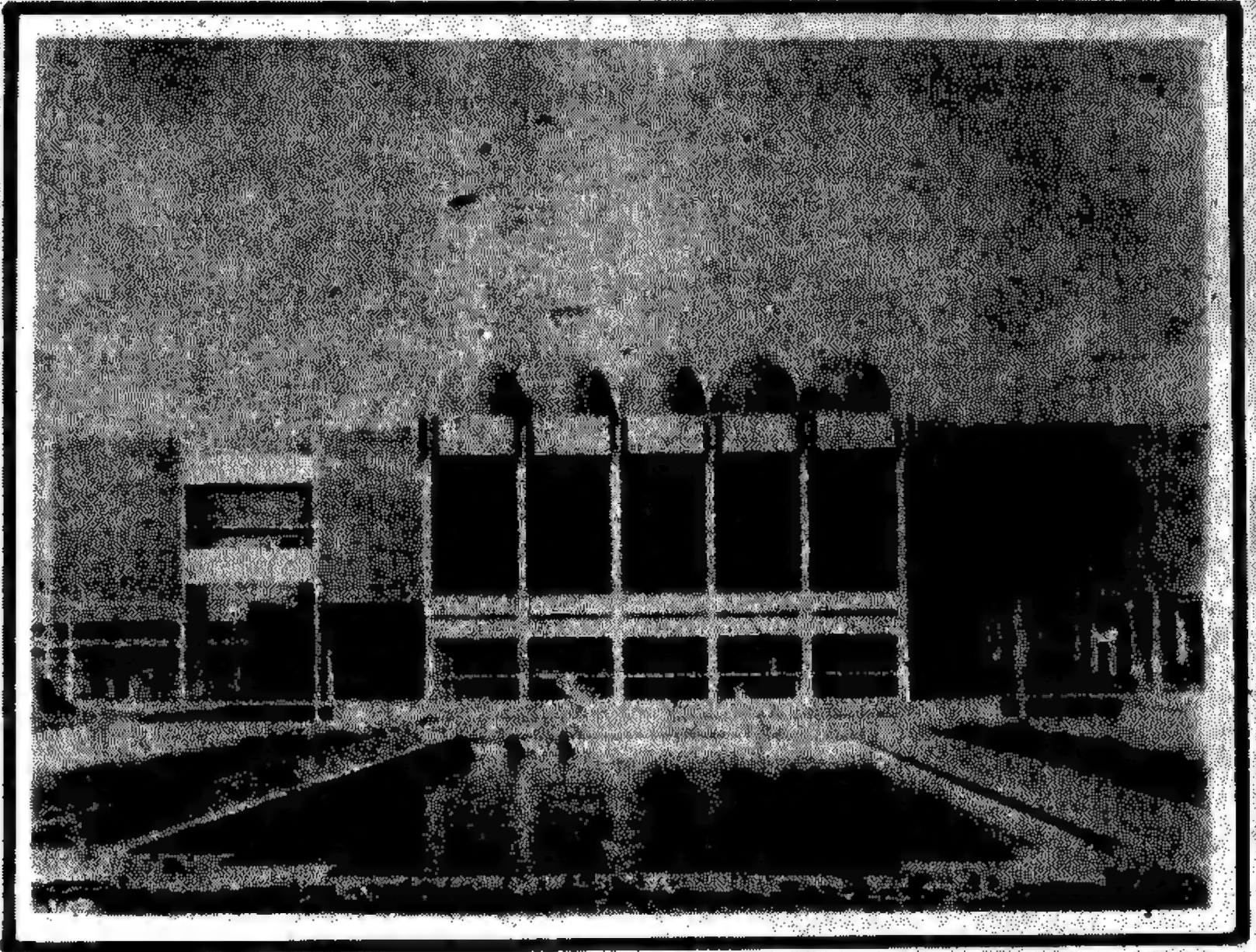
### مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ریاضی کی نئی عمارت

یشن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے۔  
 ”خطبات احمدیہ لکھنے میں شب و روز  
 مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال  
 نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ  
 اس خط کے پہنچنے پر میرا ظہور حسین کے پاس  
 جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے  
 میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور  
 روپیہ میں ادا کر دوں گا۔ ہزار روپیہ  
 بھیننے کے لئے دئی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ  
 کتابیں اور میرا سامان یہاں تک کہ میرے  
 ظروف میں تک فروخت کر کے ہزار روپیہ  
 بھجودے۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و

ارادہ کیا کہ آنحضرت مسلم کی سیر میں جیسا کہ  
 پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر  
 تمام وجہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک  
 مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔  
 انہوں نے نہ احتجاجی چلے گئے، نہ شور مچایا، بلکہ  
 علمی حیثیت سے دیم میور کو وہ جواب دیئے کہ ان کے تعصب  
 نے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ منہدم ہو گئی۔ اس کام کیلئے مرید  
 نے جو اہتمام کئے تھے، ان کا اندازہ خود ان کے بیانات سے  
 کیا جاسکتا ہے۔

”میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے  
 کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں، چھپتیا  
 روانہ ہو گئیں۔ ایک آدمی مقرر کر دیا ہے جو





کینڈی ہاں۔ میڈیکل کالج کی عمارت کے سامنے کا ایک دغریب منظر

خود تزام ہو گیا ہے۔ ضابطہ ذکر ہے۔

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفویٰ میں مسرودت ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ نکھتے نکھتے کمرودہ کرنے لگتی ہے۔"

"میں اپنا حال آپ کو کیا سکھوں؟ سکتا سا ہو گیا ہے۔ دن رات کی تکلیف ہے۔ جو فیروز دل ہی خوب جانتا ہے۔"

غیرت قومی: فردوسی سن ۱۸۶۶ء میں جب کہ فریڈ صاحب اضلاع شمال مغرب میں فیضیت گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کیشی کے ایک ممبر تھے۔ وہ بار کا انتظام سٹیپانک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریں

کے لئے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا، کرسیوں کی ایک لائن تو اس مقام پر نکالی اور اس پر ایستہ میاں بھی جس سے دھوپ لی روک ہو کھڑا دیا، اور وہ سڑی لائن اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیہ دغیرہ کچھ نہ تھا (ادنی جگہ پر انگریزوں اور نیچی جگہ پر ہندوستانیوں کو بٹھانا مقصود تھا) سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے گئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ (حیات جاوید ۲۳ ص ۵۴۵)

عزت نفس اور خود داری: وہ دہلی میں دربار قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کلچر کیشی کی طرف سے سپانامہ دیا گیا، سرسید اس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہ جوتا تانہ کر جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کیشی کے سامنے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔



کام کے لئے چندہ کی ضرورت پیش آگئی، تو پھر ان سے  
چندہ کے طلب گار ہوئے۔ ان کا ذرا سا تامل دیکھا تو فوراً  
یہ شعر پڑھا۔

گر مکرر زبنت بوسہ گر فقیم مرغ  
مُرخِ بعل بست میں کہ چہ زیبا بود دست

مولوی عبدالصمد خزانچی ریاست بھوپال راوی ہیں  
کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر (ضیاء الدین) صاحب کو کلاس لینے میں  
کسی قدر دیر ہو گئی۔ ہم سب انتظار کر رہے تھے مگر ایک شوخ  
طالب علم نے اسی حالت انتظار میں بورڈ پر یہ شعر لکھ دیا۔  
شہرہ بہت سنلے ریاضی میں آپ کا  
طول شب خسراق ذرا ناپ دیجئے  
ڈاکٹر صاحب جب تشریف لائے اور یہ شعر لکھا  
ہوا دیکھا تو بورڈ پر ہی یہ جواب لکھ دیا۔

TO INFINITY (لامتناہی)

اور مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے اور کلاس کو بقیہ  
گھنٹہ کی چھٹی دے دی" (ضیاء حیات محمد امین زبیری ص ۴۲)  
بُنائی کا بدلہ بھلائی۔ سرسید کو ان کی ماں نے ہدایت  
کی تھی کہ بُنائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیں۔ وہ کہا کرتی  
تھیں کہ بُنائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود اپنے  
کو دیا ہی بنا ہے۔ اس تربیت کا اثر تھا کہ مراد آباد میں  
جب سرسید صدر الصدور تھے، ایک کلرک کو ان سے رنجش  
ہو گئی۔ وہ اکثر گناہم غرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسر کو  
کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا  
تھا۔ اس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک عرضی لکھ  
دی بھی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور  
ان کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے، فوراً تلاش لی جائے  
اسی وقت پولیس کا عملہ ان کے مکان پر چڑھا آیا۔ سرسید نے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نہر

بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارمیل سے وہ جوتا پہن کر آنے کی  
شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اتروائے بغیر کسی ہندوستانی  
کو اپنے ہنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر وائسن جب تک علی گڑھ  
میں کلکٹر رہے، ہم نے سنا ہے کہ سرسید بھی ان سے نہیں ملے،  
کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اتار کر ان کے کمرے  
میں جائیں، مگر انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ نواب  
کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کے یہاں صرف چندے  
کی عرض سے وہ اس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بے  
سروسامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت  
تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود پٹناری پر  
بیٹھ رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا، اس کو فرش پر دو زانو  
بیٹھنا پڑتا تھا، ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے جب تک کمری پر  
بیٹھنے اور جوتا پہننے کے لئے اجازت حاصل نہیں کر لی، وہاں  
جانے کا ارادہ نہیں کیا" ("حیات جاوید" ج ۲ ص ۸۲-۸۳)  
ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام۔ ایک  
سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک  
ہو کر ایک گائے قربانی کے لئے خرید لی۔ عین بقرعید کے دن  
نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی  
ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ از خود رفته ہو گئے۔ فوراً سوار  
ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج  
تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ گائے طابعلو  
سے چھین کر اس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں  
کو سخت طامشت کی اور آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کر دی  
کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرے۔

(حیات جاوید ج ۲ ص ۵۵۹-۵۶۰)

حاضر جوانی اور بذلہ سخی۔ سرسید آئے دن دوستوں  
سے قومی کاموں کے لئے چندہ طلب کرتے رہتے تھے۔ ایک  
دن ایک دوست سے چندہ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی اور

مکان میں پردہ کھادیا اور ملاشی لی گئی، مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا۔ مراد آباد کا کوڑاں اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی، برخاست کیا گیا۔ سرسید اور ان کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی بھیجی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک ڈگری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر، جبکہ سرسید کے ایک معزز یوروپین دوست کسی اعلیٰ عہد پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے تھے اور جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے، ان کو ایک لائق انگریزی دانت کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ سرسید اس کلرک کی انگریزی لیت سے واقف تھے، انہوں نے اسی کی سفارش کی اور اس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ "مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ بمائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ مگر اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دوسو کا نوکر رکھو اگر بھیج دیا اس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اس کی جہتوں کی خاک پڑ جائے اس کی نجات ہو جائے۔ (حیات جاوید ج ۲ ص ۵۱۲-۵۱۳)

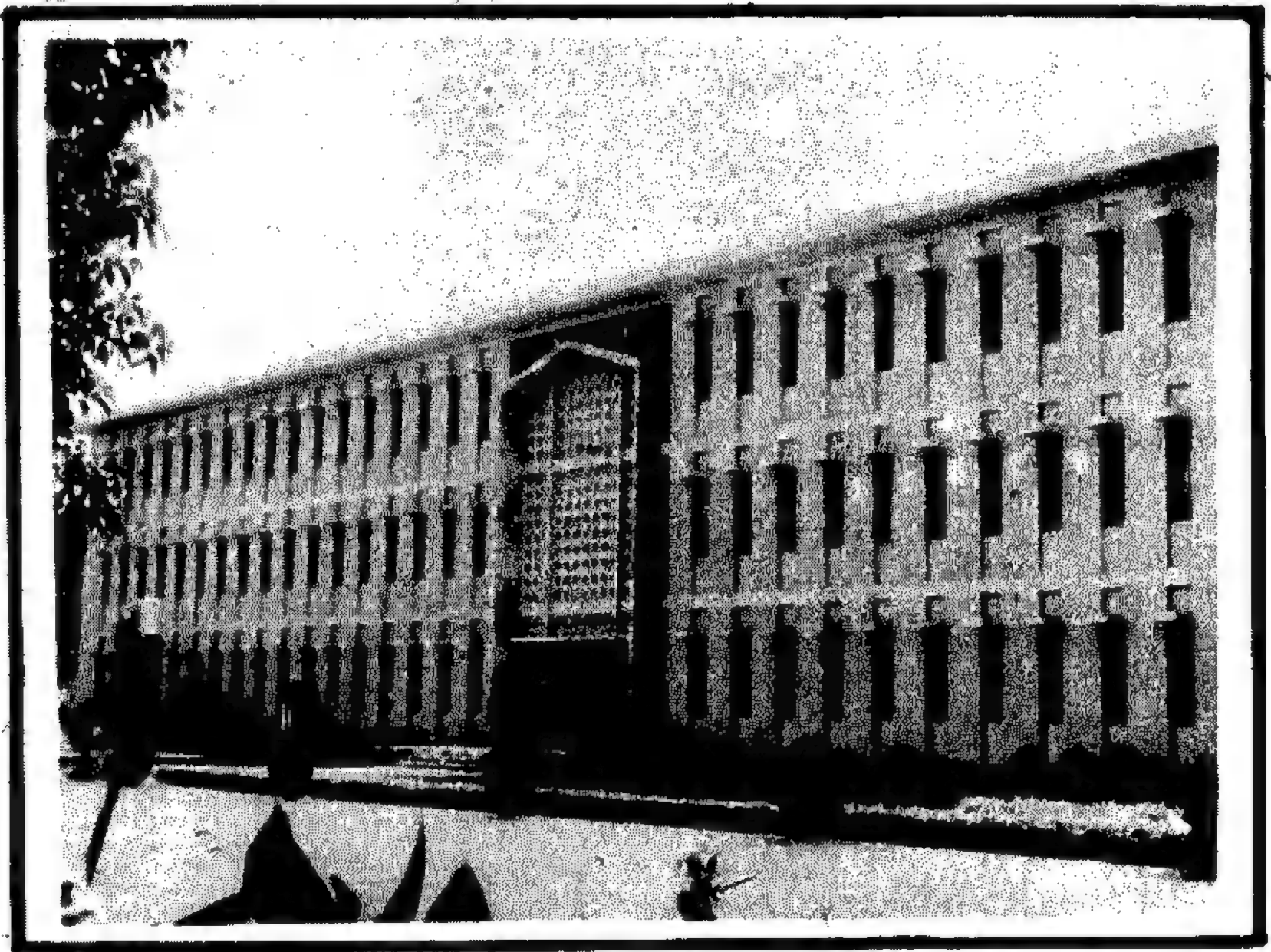
نادار طلباء کی مدد :- میر ولایت حسین اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنے گھر سے صرف دس روپے لایا تھا۔ اس میں سے میں نے بلیم کی انگریزی کی کتابیں خریدیں۔ پھر میں کمرہ میں چٹائی کا فرش اور درمیں ٹین کا فیل سوز خریدا۔ اس طرح سے جو رقم لایا تھا اس کا بیشتر حصہ خرچ ہو چکا تھا اور میرے پاس ریاضی، قدیم تاریخ اور فارسی کی کوئی کتاب نہ تھی میں

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

نے والدہ کو لکھا، انہوں نے جواب دیا کہ یہاں کیا خزانہ گرا ہے تم وہیں چلے آؤ۔ مرزا اکلہ ملی بیگ نے جو میرے ہم جماعت تھے مجھ کو پریشان دیکھ کر کہا۔ مولوی مشتاق حسین صاحب (نواب وقار الملک) سے کہو وہ تم کو پرائیویٹ ٹیوشن دلوادیں گے۔ شام کو پانچ بجے کے قریب مولوی مشتاق حسین صاحب بارک میں گشت کرتے ہوئے آئے اور مجھ کو کمرہ میں بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمانے لگے کہ کرکٹ کھیلنے کیوں نہیں گئے۔ میں نے کہا مجھ کو کرکٹ کھیلنا نہیں آتا۔ فرمایا کہ سیکھنا چاہئے۔ پھر میں چند قدم ان کے ہمراہ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا کچھ فرمانا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو کسی اسکول کے طالب علم کی پرائیویٹ ٹیوشن دلوادیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنا وقت دوسرے کے ہاتھ بیچتے ہو میں نے کہا کہ اگر میں اپنا تھوڑا وقت دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کروں گا تو میرا سارا وقت پڑھنے سے چلا جائے گا۔ فرمایا اکیوں؟ میں نے عرض کیا۔ میرے والد زندہ نہیں ہیں میری والدہ کچھ مالی امداد نہیں کر سکتیں۔ ایک روپیہ آٹھ آنے ماہوار وظیفہ سے بچتے ہیں جو میرے متفرق اخراجات کے لئے کافی ہوں بشرطیکہ وہ ملا کریں۔ انہوں نے فرمایا۔ میں فیجورڈرنگ ہاؤس سے کہہ دوں گا پھر تو تم کو پرائیویٹ ٹیوشن کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں نے کہا میرے پاس کتابیں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ جو کتابیں نہیں ہیں ان کی فہرست میرے پاس بھیج دو، میں انتظام کروں گا۔ (ذاتی ڈائری کے چند اوراق) (علیگڑھ میگزین، علیگڑھ نمبر ۱۱)

طلباء کو نیک چلنی پر انعام :- اس سال (۱۸۹۹ء) جناب مسٹر سٹنس صاحب بہادر پرنسپل کالج نے اپنی ذات خاص سے ایک انعام کتابوں کا بورڈنگ ہاؤس کے طالب علموں میں سے اس شخص کے لئے تجویز کیا تھا جس کی شایستگی اور نیک چلنی سب سے زیادہ عمدہ ثابت ہو اور یہ انعام نیک چلنی کا نواب محمد عبدالحید خاں نے حاصل کیا جو نجیب آباد کے مشہور رئیس



یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کی عمارت جو سب سے زیادہ طلبہ کی تعلیمی ضروریات پوری کرتی ہے

خاندان کی اولاد میں سے ہیں۔ رپورٹ سالانہ کلاسیک بورڈنگ (پس)

(درستہ العلوم بابت مشق)

قومی کام میں دیوانگی۔ مولوی بشیر الدین صاحب کی ایک پارٹی تھی جس کا نام "جہل مرکب" تھا۔ وہ خود اس کے صدر تھے اور ممبران میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، حبیب اللہ خاں، محمد حسین شوق، شام حسین، مولوی طفیل احمد، خان بہادر جعفر حسین، میر ولایت حسین، اور انعامی بدایونی وغیرہ شامل تھے۔ انا وہ کالج کے ہسٹری میوزیم میں ایک تصویر آدیناں ہے جس کے وسط میں مولوی صاحب اپنی مخصوص وضع میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد علمائے دین علی گڑھ کا یہ گروپ ہے، پکڑے کی ایک پٹی پر نہایت نستعلیق الفاظ میں "جہل مرکب" لکھا ہوا ہے جو ہر دیکھنے والے کی حیرت کا باعث ہوتا ہے اور

لے بھانا پڑتا ہے کہ یہ دراصل قومی دیوانوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی ذات کو فراموش کر چکے تھے اور ہمیشہ قومی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اگر ان میں سے ایک دوسرے بھی ایک جگہ مل جاتے تو پھر ان کی گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی یہ تصویر علی گڑھ یونیورسٹی میں جوہلی کے موقع پر لی گئی تھی۔

(نقوش۔ شخصیات نمبر ۱۳۹۵)

نوادار طلباء کے ساتھ برتاؤ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

میں بڑے تردد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا کالج کے ہمسفر طلبہ نے حال پوچھے بغیر میری ہیبت و حالت دیکھ کر میری دلدادہاری نہ کی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

۹۸ اردو اجسٹ ہماگست ۷۲ء



ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے پر اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر خود کہیں اور جا کر ساتھیوں کے جگہ میں تمام رات ہوجتی میں بسر نہ کر دی ہوتی تو میں شہر جا کر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا! ایک درمندانہ اجنبی عالم کے ساتھ علیگڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج بیالیس سال بعد بھی میرے دل کو اس طرح شاداب اور شادماں کرتی ہے۔ جیسے کل کا واقعہ ہوا۔

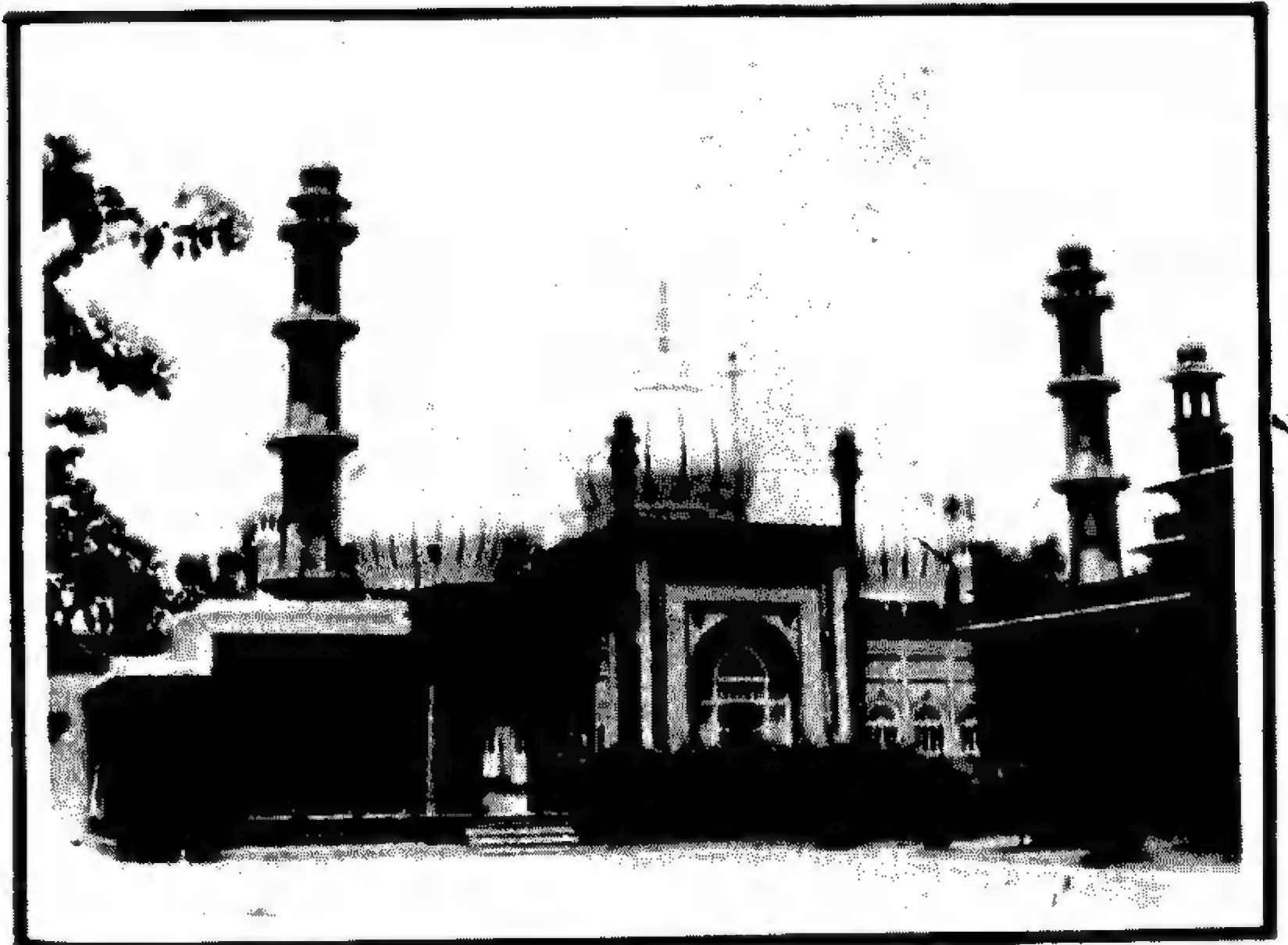
(آشفۃ بیانی میری "میں ۵۲ء)

**درستی اخلاق کے دو طریقے۔** درستگی اخلاق کے دو طریقے ہیں۔ معلمانہ ہدایت یا طنزیہ تنقید۔ علی گڑھ نے دونوں کو آزمایا اور دونوں کی روایات قائم کیں۔ معلمانہ کوششوں کے سلسلہ میں سر تقیہ دور مار سین کا

ایک بچہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ مار سین ایم۔ اے او کالج میں پہلے پروفیسر بعد کو پرنسپل رہے۔ انہوں نے کالج کی فضا کو سنوائف اور طلباء میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرتے میں بڑی جدوجہد کی ان کی بعض تقریروں کو سر سید نے اسٹریچی ہال کے ستونوں پر کندہ کر دیا تھا۔ درگاہ میں دلچسپی اور بانی درگاہ سے ثقافت کے پیش نظر اس مسجد کی تربیت ان کے سرکردہ گئی تھی۔ مسئلہ میں انہوں نے "اخلاق" (ON MORALS) پر ایک بچہ دیا تھا۔ جو اس زمانہ میں غلطی بھی طبع ہوا تھا۔ یہاں اس کو پورا پیش کیا جاتا ہے۔

درستی اخلاق کے دوسرے طریقہ کا شاہکار "جہانگیر بک" ہے جو مسئلہ میں نافذ کیا گیا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کی دفعات ان ہوں

یونیورسٹی کمپس کی مسجد کی یہ تصویر سامنے سے لی گئی ہے



اور حماقتوں پر محیط تھیں جو اکثر ہم سے وقتاً فوقتاً مرزد ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً نسل یا خاندان پر اترانا، اپنے لباس، ورزشی جسم یا قابلیت کی نمائش کرنا۔ اہم شخصیتوں سے اپنے تعلقات جتانے بڑے آدمیوں کی حضوری میں رہنا یا بڑا آدمی بننے کی کوشش کرنا۔ شہر و ادب یا علم و فن پر سنی سنائی راستے دینا وغیرہ ان سب کے لئے مناسب مزائیں مقرر تھیں۔ یہ ایکٹ یہاں پورا پیش کیا جاتا ہے۔

**اساتذہ کا اخلاق :-** ”مجھے خوب یاد ہے کہ مسٹر مارلین یا مسٹر ارنلڈ نے کبھی بائیں ہاتھ سے سلام کا جواب نہیں دیا۔ چہ جائے کہ سر ہلا دینا، گردن لچکا دینا یا آنکھ ٹٹکا دینا! اگر ایسا اتفاق ہوا کہ داہنے ہاتھ میں ان کے کتاب ہے تو بائیں ہاتھ میں کتاب لے کر داہنے ہاتھ سے جواب دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مسٹر بیک سامنے سے آ رہے ہیں اور خیال ہوا کہ وہ قریب آئیں تو سلام کر دیں لیکن انہوں نے ایسا موقع نہ دیا اور خود ہی سبقت کر گزرے۔ فرمائیے کہ ہندوستان کے کسی دوسرے کالج کے طلباء کو بھی یہ نصیب ہے۔ پھر کیا مسٹر بیک کی کوئی عزت گھٹ گئی یا مسٹر مارلین اور مسٹر ارنلڈ ہم سے ڈرتے تھے، نہیں! بلکہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے عالم باعمل ہو کر ہم کو تعلیم دیتے تھے۔ مادر کسر نفسی، ہمدردی اور العزیز، فرض نشانی اور عظمت دفرہ وغیرہ کے سبق دیتے جانتے تھے۔“

(سید واجد حسین اولڈ بوائے ”فروری ۱۹۱۱ء“ ص ۸)  
**بالآخر اصول ہی کامیاب ہوتا ہے۔**۔۔۔ نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کا بیان ہے،

(نواب وقار الملک نے) کسی واقعہ سے متاثر ہو کر مفسر ہونا تو شاید جانا ہی نہیں۔ کالج کے متعلق شدید سے شدید واقعات میں طبیعت کا سکون بجائے خود قائم رہا۔ سنی شیعہ کی بحث جس وقت پوری قوت پر تھی اور کالج کی بنیاد متزلزل ہونے لگی تھی۔ میں نے مفسر باندہ پوچھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہو گا؟

پورے اطمینان سے فرمایا،

”اصول پر قائم رہنا چاہیے، بالآخر اصول ہی کامیاب ہوتا ہے۔“ (وقار حیات: محمد اکرام اللہ خاں ندوی ص ۸۸-۸۹)  
**استادوں کی یادگار :-** ”مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی ہمیشہ سے خصوصیت کے ساتھ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے خیالات شکر گزاری کو اپنے محسن اور شفیع استادوں کی علیحدگی پر علی شکل میں ظاہر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ارنلڈ کی روانگی کے وقت جو شاندار الوداعی جلسے ہوئے وہ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ کالج کے موجودہ طالب علموں نے کس دردنیکر جوش اور حسرت آمیز محبت سے اپنے عزیز استاد کو رخصت کیا۔“

(حبیب اللہ خاں ارمہ پرج شہلا مسٹرن اینگلز اور نیشنل کالج میگزین مارچ ۱۹۹۸ء ص ۱۰۲)  
اپنے نام کے ساتھ درس گاہ کا نام بھی شامل رہے۔ سر سید، مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”تمہارے نام کے ساتھ مدرسۃ العلوم کا نام رہنا بلاشبہ تمہاری خوشی کا باعث ہو گا لیکن میری سمجھ میں تمہارے نام کے ساتھ کالج کا نام رہنا کالج کی عزت کا باعث ہے۔ اگر کالج کے بچے ایسے ہوں جیسے کہ تم ہو تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ کالج کو اس سے فخر و اعزاز نہ ہو گا۔ پس تم اپنے نام سے کالج کے نام کو علیحدہ مست کرو۔“ (خطوط سر سید، ص ۱۹۱)

**والدین اور اساتذہ کا احترام :-** مرحوم سر سید علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک پتھر میں مدرسۃ العلوم کے بورڈروں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ ”یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ انگریزی خواں طالب علم اپنے استادوں اور اپنے ماں باپ کا ادب نہیں کرتے میں یقین کرتا ہوں کہ تم میں ایسا کوئی نہیں ہے مگر جو انگریزی خواں طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ دنیا کی اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔“

ماں باپ ان کا جسم پیدا کرنے والے ہیں اور استاد ان میں

## ایک لے اد کا بیچ اور مسلم یونیورسٹی کے

### چند قومی رہنما

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خان عبدالغفار  
خان، ڈاکٹر ذاکر حسین، ظفر علی خاں، عبدالمجید خواجہ  
سیف الدین کچلو، ڈاکٹر سید محمود، شیخ محمد عبداللہ، حسرت  
موبانی، راجہ ہندو پرتاپ، شری پالیوال، سردار یابگر  
پی بی موریہ، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، شیخ قریشی  
رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد براہیم، یسین نوری، علی ظہیر،  
پروفیسر حبیب وغیرہ۔

(مشاہدات و تاثرات ص ۱۶)

درس گاہ سے محبت :- ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم لکھتے ہیں:  
کالج سے اس قدر انسیت پیدا ہو گئی تھی کہ کسی کو  
اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی اتنی محبت نہ ہوتی ہوگی۔ ایک  
مرتبہ ایک انگریز کلکٹر نے اس زمانہ میں جب کہ میں وکالت کرتا  
تھا مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے کالج کے مطلق کیا کرنا چاہتے ہو اور  
کیا ایسی بات تمہارے دل میں ہے جس سے تم کو کالج کے متعلق  
خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں  
نے جواب دیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر طالب علم بن کر  
اپنے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں جا کر رہوں۔ اس پر کلکٹر  
نے قہقہہ لگایا کہ بالکل یہی خیال میرا بھی ہے کہ میں کیمبرج  
میں جا کر پھر طالب علم کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس  
سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس زمانے کے طالب علموں کو  
اپنے کالج سے کس درجہ گہری محبت ہو جایا کرتی تھی۔

(مشاہدات و تاثرات ص ۹)

ملازم کی بھی عزت نفس ہے :- سر سید لکھتے ہیں:  
جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں

انسانیت ڈالتے ہیں اس لئے استادوں کا درجہ حقیقت میں  
ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جب خدا نے ماں باپ کی نسبت  
فرمایا ہے کہ لا تقل لہما آفت ولا تنہما و قل  
لہما قولا کریماً تو اس پر خیال کرو کہ تم کو استادوں کا کس  
قدر ادب کرنا واجب ہے؟ پس مرحوم سر سید کی اس بیش بہا  
نعمت اللہ آپ اس سے لکھنے کے قابل الفاظ کہ ہر وقت یاد رکھنا  
اور ان پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔

(ممدن ایٹکوار نیٹل کالج میگزین و علی گڑھ

انسٹیٹوٹ گزٹ یکم جولائی ۱۸۹۹ء ص ۲۱۱)

جرات مندانہ اظہار رائے ضروری ہے ڈاکٹر شیخ  
محمد عبداللہ مرحوم لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ کسی موضوع پر سر سید نے ایک مضمون لکھا  
اور مجھے ان کی رائے سے سخت اختلاف تھا میں نے اپنے نام  
سے تو مضمون کے مضمون کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک گم نام خط  
ان کے مضمون کے جواب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد سر سید نے انجا  
میں لکھا کہ کسی دوست نے میرے مضمون کا جواب لکھا ہے لیکن  
اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ انہوں نے اپنا نام کیوں نہیں  
لکھا۔ ہم کو اس مضمون میں راستی اور معقولیت معلوم ہوتی ہے۔  
میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ میرے مضمون کی بہت قدر  
ہوئی اور اگر سر سید سے جا کر اقرار کروں گا کہ وہ خط میں نے  
لکھا تھا تو وہ مجھ سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض  
کیا کہ وہ مضمون میں نے لکھا تھا اپنا نام اس لئے نہیں لکھا کہ  
یہ بات میری گستاخی سمجھی جائے گی کہ میں حضور اللہ کے مضامین  
سے مخالفت کرتا ہوں۔ فرمایا کہ اچھا تم نے یہ گناہ خط لکھا  
تھا یہ سخت بد اخلاقی میں شامل ہے کہ گناہ خط لکھے جائیں۔  
ابھی اسی وقت جبکہ وہ آئندہ گناہ مضامین نہیں لکھو گے۔  
میں نے توبہ کر لی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی گناہ مضامین نہیں  
لکھوں گا اور میں نے آج تک اس عہد کی پاس داری کی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



تب قصور محاط ہوا (حیات جاوید ج ۱ ص ۲۷)

اسی تربیت کا اثر تھا کہ مرید نے بورڈنگ ہاؤس میں یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ جو طالب علم کسی ملازم کو مارے پیٹے گا اس کا نام ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا۔ سید حسین نے ذکر ہے کہ ایک طالب علم سید حسین سے بیرے کو مارا۔ مرید نے حکم دیا کہ سید حسین کا نام بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا جائے۔ طلباء جمع ہوئے اور مرید کو عرضی نکلی کہ اس طرح اگر لوگ کے مارنے پر طلباء بورڈنگ ہاؤس سے خارج کئے گئے تو نوکر بہت خود مر ہو جائیں گے۔ مرید کا جواب آیا کہ تمہاری خود مری حد سے بڑھ گئی ہے۔ میرا حکم نہیں بدل سکتا۔ سید حسین کو خلافت قاعدہ نوکر کا منسلک پر بورڈنگ ہاؤس چھوڑنا پڑے گا۔

عادت ایسی رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔  
مرید کا بیان ہے:

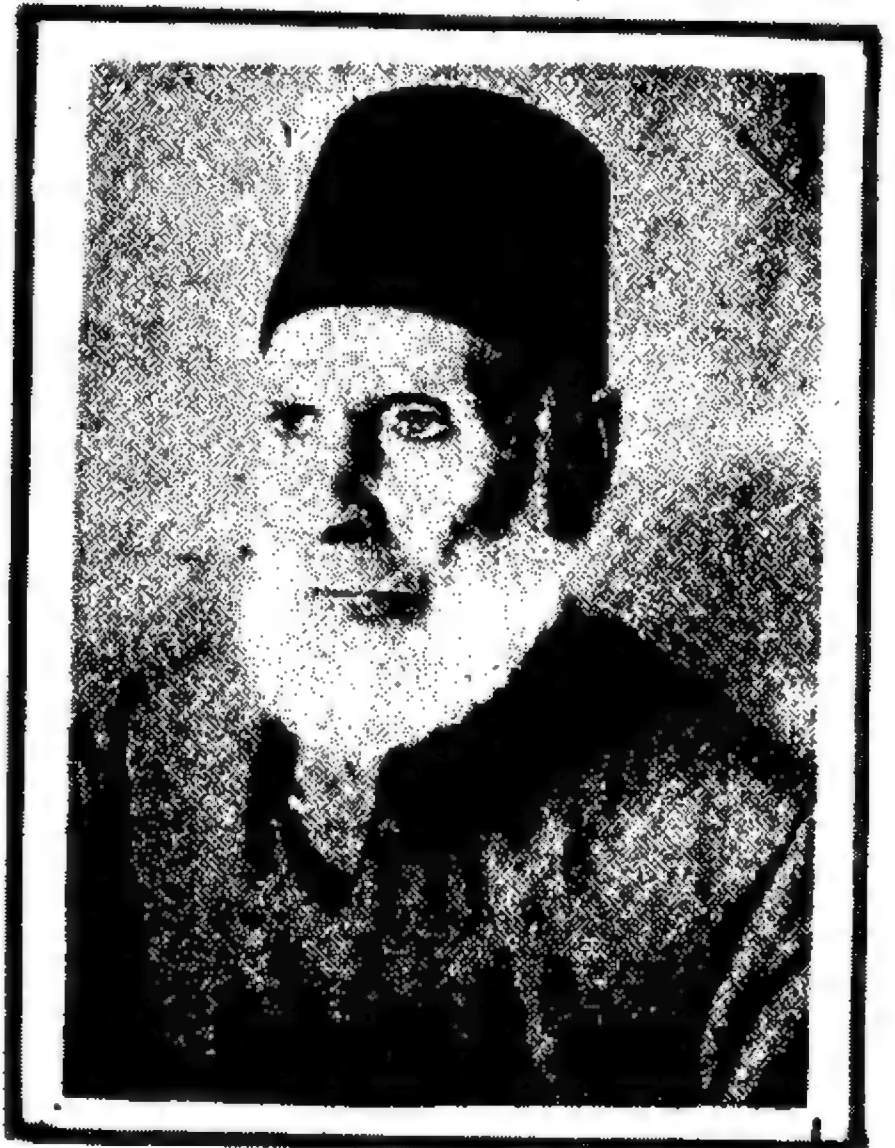
قب میں دتی میں منصف تھا تو میری والدہ کی نصیحت تھی کہ جہاں تم کو جانا ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اہ کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ نہیں۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جلنے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اہ کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔

(حیات جاوید جلد ۱ ص ۳۰)

اختلاف رائے کو ذاتی مخالفت میں تبدیل نہ ہونے دو۔  
طلباء کی ہر ادب کے پہلے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سرسٹار میں نے کہا تھا:

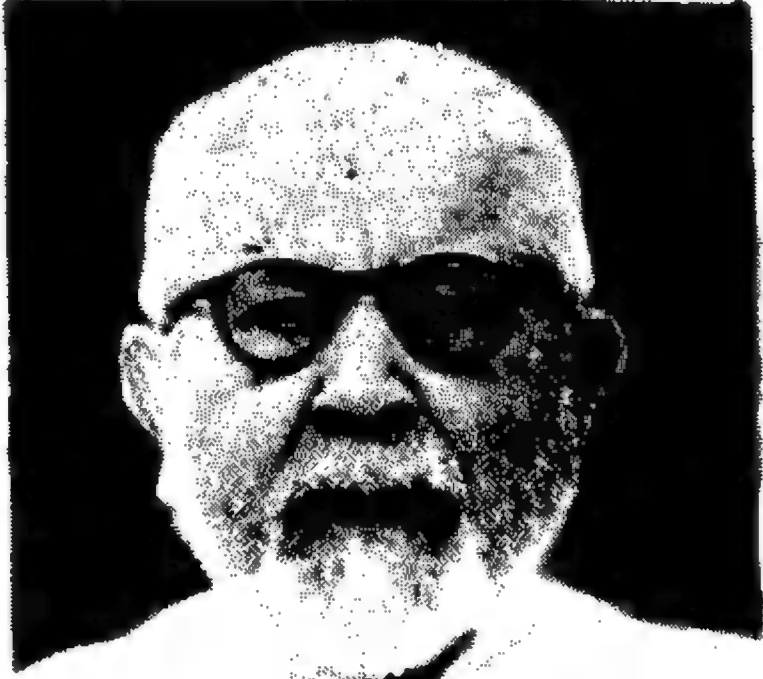
آخر میں میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ تم اس بھائی کے غلط کو جس سے ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ ہمیشہ دل سے یاد رکھو جب تمہاری عمریں زیادہ ہونگی اور جب معاملات کو فیصل کرنا خاص کر ایسے کاموں میں جو قومی بہبود کے لئے

ملک محمد حسین یونیورسٹی نمبر



مولانا حبیب اللہ خاں شیرانی

نے ایک نوکر کو جو بہت چرانا اور بڑھا تھا کسی بات پر پتھر مارا والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا۔ تو انہوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماں میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور مرگ پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماں نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی انہوں نے کہا: دیکھو! آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرایں۔ انہوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے



### خواجہ عبدالحمید مرحوم

جو کچھ حالت تمہاری ہے وہ ہی کل ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے۔ ہم اپنے ذاتی خیالات کو قومی فلاح کے خیالات کا مطیع نہیں کرتے۔ (اسپیج مسٹر مارسلین پھیلپس سالانہ اجلاس مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علموں کے برادر ہیں۔)

(مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۱۷ھ ص ۱۱-۱۲)  
کمرؤں کی صفائی اور ترتیب۔ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر  
صدائے کیشن کیشن نے جب علی گڑھ کا معائنہ کیا اور طالب علموں کے کمرؤں کو دیکھا تو کہا:

طالب علموں کے کمرؤں کے معائنہ کے وقت مجھ کو وہ طریقہ نہایت پسند آیا جس میں یہ کمرے مرتب کئے گئے تھے۔ ہر ایک طالب علم اپنے کمرہ کی آرائش اپنے مزاج کے موافق کرتا ہے اور ہر ایک کمرہ میں اسی قسم کی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ائین کالج کے ایک رٹ کے کمرہ میں دکھائی دیتی ہے۔

(ایڈریس ادا پیپس ص ۶۱)

ہمارے ڈائریکٹ آگست ۱۹۳۰ء

تم کو مل کر کر سکتے ہیں گے ہمارے اختیار میں ہو گا تو یاد رکھو مزید تمہاری رائے میں اختلاف پیش آئیں گے۔ ایسے کاموں میں اختلاف اگر کسی طرح بند نہیں ہو سکتا۔ اور نہ میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو کیونکہ یہ اختلاف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خیالات عمدہ اور اصل ہیں۔ فرض ان اختلافات کی وجہ سے یہ ہو گا کہ تم ایسے مخالفت فریق قائم کرو گے جن سے رائے کے اختلافات ذاتی غمختوں میں تبدیل ہو جائیں گے جس کا بڑا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم اپنی ذاتی عداوتوں کی پیروی میں ایک مفید کل کے پرزے جدا جدا کر کے رکھ دو گے۔

میں تم کو اس بات کی اس لئے نصیحت کرتا ہوں کہ میں تمہاری طبیعتوں سے خوب واقف ہوں۔ میں نوع انسانی کے متعلق ایسے کلیات جو اس کی جامع تواریخ سے نکلنے والے بیان نہیں کرتا بلکہ وہ خوب بتاتا ہوں جو ایک بھائی دوسرے بھائیوں کے ایک گھر میں رہ کر معلوم کر سکتا ہے۔ تم کو اپنی تمام زندگی میں یہ بات پیش آنے لگی کہ جب کوئی تمہاری مخالفت کرے گا تو تم کو اس سے دشمن کا خیال پیدا ہو گا۔ لیکن یاد رکھو کہ ہر انسان کو خواہ وہ کتنا ہی نیکیا اور اچھا ہو ایسی مخالفتیں پیش آتی ہیں۔ تم کو ایسی حالت میں ترفیب ہو گی کہ جس شخص نے تمہاری رائے کو ہٹا کر تم کو شکست دی ہے تم اس سے سخت عداوت رکھو۔ اس خیال سے تم اپنے دوستوں کو شریک کر کے اس کام سے جس میں تم مل کر کام کرتے تھے علیحدہ ہو جاؤ گے اور اگر ممکن ہو گا تو اس کام کو بالکل ہی غارت کر دو گے۔ حالانکہ تم اس بات کے مقرر ہو گے کہ وہ کام اچھا تھا لیکن اس وجہ سے کہ تمہاری رائے کے موافق نہیں ہوا۔ تم نے اس کو تباہ کر دیا۔ تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ یہاں تم نے فریق بننا رکھے ہیں جو ایک دوسرے کی اس قدر سخت مخالفت کر رہے ہیں جس کی مثال انگلستان میں بھی میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



رودنی پھیلنے کے اندر بڑھتا جا رہا ہے۔ فضا میں ادا  
ہیں اور ہر درد و غم اور مایوسی ٹپک رہی ہے۔ ابھی  
کچھ گھنٹے پہلے وہ آفتاب علم غروب ہو چکا ہے جس کی فضا پاشیل  
سے کالج کے باغ و دریاؤں تک جاگمگاتے رہے تھے۔ اپنے  
مکان سے کچھ فاصلہ پر ایک دوست کی کوٹھی میں سرسید علیہ الرحمہ  
نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا نے ایسا محسوس کیا کہ

دھوپ تھی، گئی آفتاب کے ساتھ

پچاس سال تک کوئی سورج ایسا طلوع نہیں ہوا تھا  
جس نے اس انسان کو اپنی قوم کی فکر میں مبتلا کر پایا ہو۔ آسمان  
پر بکھرے ہوئے بے شمار ستاروں نے اس کی آہ و فغانِ نیم  
شبی سنی تھی۔ وہ سوتا تھا تو قوم کے غم میں اور جاگتا تھا تو قوم  
کی فکر میں۔ اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ایک ہی غم میں بسر کیا تھا  
اور وہ یہ کہ قوم کسی طرح خواب گراں سے بیدار ہو، تعصب اور  
تنگ نظری کی دلدل سے باہر نکلے اور عزم و ہمت کے ساتھ  
وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا سیکھے۔ اس کی موت کا یقین  
نہیں آتا۔ ہر سنند و الاحوال ہے اور جو کہہ اس اولوالعزم  
انسان کو موت نے کس طرح زیر کیا ہوگا۔ اور خود موت پر کیا  
گزری ہوگی۔



## سید جازو سے

سرسید کے جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال: کرکٹ  
لاں پر سرسید کا جنازہ رکھا ہے۔ بے شمار خلقت جمع ہے ہزاروں  
انسان جن کے دل صدمہ سے بے چین اور آنکھیں آنسوؤں  
سے بھری ہوئی ہیں، صفا بستہ کھڑے ہیں۔ ان میں مسلمان  
ملیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر

۱۹۹۸ء ہے اور مارچ کی ۲۸ تاریخ۔ سورج  
آہستہ آہستہ مشرق سے ابھر رہا ہے اور اس کی کرنیں و گنبد  
گیت کے سر پہ لگ کس اور اسٹریچی ہال کی وسیع پیشانی سے  
نکرا نکرا کر ہر طرف پھیلنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بجائے



ماہنامہ

# ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ انتقال

بھی ہیں، ہندو بھی اور عیسائی بھی۔ یوں تو سب ہی غمگین نظر آتے ہیں لیکن دو طرف سے زار و قطار رونے اور دل کو ہلا دینے والی آہوں کی آواز آرہی ہے۔ ایک طرف کالج کے وہ طلباء ہیں جن کے مستقبل کی فکر نے مرنے والے کو عمر بھر خواب راحت سے محروم رکھا تھا اور اب ایسا سو گیا ہے کہ دسویں صدائیں بھی اس کو بیدار نہیں کر سکتیں۔ اس کی گہری نیند دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید یہ

عمر بھر کی بیکاری کو قرار آ ہی گیا

دوسری طرف وہ راج غزدر و زبیر بھی اور سنگ تراش ہیں جن کے ساتھ ۲۵-۲۶ سال تک اس نے علی گڑھ کی تہیتی ہوئی دوپہر میں گزار لی تھیں۔ اس کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ جانکاہ خبر سن کر آگے ہیں اپنے محبوب آقا کو آخری سلام کر رہے ہیں۔

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت

مرگے کہ زندگیاں بدعا آرزو کنند

تھوڑی سی دیر میں سرسید کا قوی ہیکل جسم مسجد کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کر دیا گیا اور تاریخ کا ایک دور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے عرش کے نوری زمیں کے فرش پر آنے کو ہیں اور اک خاکی کو سیر خلد دکھلانے کو ہیں

بارغ جنت کو سدھار اسید عالی مقام

ساہ میں اس کی ملائک نود برسانے کو ہیں

بوسہ گاہ قوم ہو گا تیرا سنگ آستان

نقش پا پر تیرے لاکھوں قافلے آنے کو ہیں سرسید کے انتقال پر تعزیتی جلسہ :- اسٹریجی ہال میں جلسہ میں محسن الملک کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں ہزاروں فنکار آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ خوشی محمدناظر کا دل یہ دیکھ کر بھر آتا ہے۔ ڈانس پر جا کر یہ شعر پڑھتے ہیں اور دل

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم



حضرات! اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا  
تعلیمی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز اس کی  
نشوونما اس کی نمونہ اس کا جو کچھ ہوا اس  
کا لچ سے ہوا اور یہ کا لچ جلوہ ہے اسی  
بڑے شخص کا لچ

جادو دیکھتا ہوں اور تو ہی تو ہے  
اس کی شخصیت میں کیا جادو تھا۔ اس کی نظر میں  
کیا تاثیر تھی اس کی آوازیں کیا کشش تھی۔  
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی  
جادو تھی، فسوں تھی جانے کیا تھی

ذہنی ہمہ تن جو تھی اثر میں  
نشر سی از رنگی جگر میں

صورت سے عیاں جلال شاہی  
چہرے پہ فردغ صبح گاہی  
لب پر ہے فغاں کہ اب بھی جاگو  
اے خواب گراں کے سونے والو

تا چند رہو گے مست و سرشار  
انکھو کہ سحر ہوئی نمودار  
شبلی فرط غم سے کچھ ایسے مغنوب ہوئے کہ گگے کچھ  
نکہہ سکے اور بیٹھ گئے۔

محسن الملک نے حالی کی طرف دیکھا اور کہا۔  
"آپ بھی کچھ کہیں گے؟"  
یہ جلد کیا تھا! ایک تیر تھا جو حالی کے دل میں اتر گیا۔  
اک آہ بھری شن کے یہ حالی نے کہ میں سے  
دل ہل گئے اور سب کے لبوں ہو گئے پانی  
آنسوؤں کی جھری ان کی آنکھوں سے چل رہی تھی۔  
چند منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ مگر دن سے دو سال  
کھولا اسی آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر اپنے پر کچھ قابو پا کر بولے۔

ملیگرہ مسلمانین کی نمونہ



سرسید کے صاحبزادے جسٹس سید محمود مرحوم

پڑا کر وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔  
ہائے بزم توڑ میں اب جلوہ فرمائے گا کون؟  
ماہ کی مانند ہائے میں نظر آئے گا کون؟  
یوں تو لا کھوں آئیں گے اس پنج میں اور جائیں گے  
سید احمد صاحبزادوں سا مال مگر آئے گا کون؟  
خاموش مجمع سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر  
شخص ایک دوسرے کی طرف دیکھتا تھا اور خاموش تھا۔ شبلی  
اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ لائٹس کی طرف بڑھے مجمع  
پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔

"سید احمد خاں اپنے پردہ دار کے جبر و رحمت  
میں چلے گئے۔ دیکھو ہماری قومی عمارت کے  
ستون ہل رہے ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں  
لیکن اسوقت طاقت گویائی کہاں سے لائے۔"



ایم اے او کالج کے پہلے نمبریں مولوی سید الشہ خاں مرحوم

خدا تعالیٰ نے ایک جسم اور شکل دینی چاہی تو  
سید احمد اس کا نام رکھ دیا۔ خلوت و جلوت  
تنہائی و یکجائی، دن رات، صبح شام سب  
میں نے انکو دیکھا اسی حال میں دیکھا، ہم  
لوگ ان کے پیرو اور دوست کہلاتے تھے  
مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی  
محبت سرسید میں تھی اور وہ آگ جوان کے دل  
میں لگی ہوئی تھی اور وہ درد جس سے ان کا  
دل بھرا ہوا تھا ہم میں اس کا نشان بھی نہیں  
ہے۔ ان میں یہ سب باتیں فطری تھیں اور  
ہم میں مصنوعی۔ سرنگیں آنکھ اور چہرے اور  
سر نہ لگانا اور بات ہے۔

اتنا کہ اور محسن الملک کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر

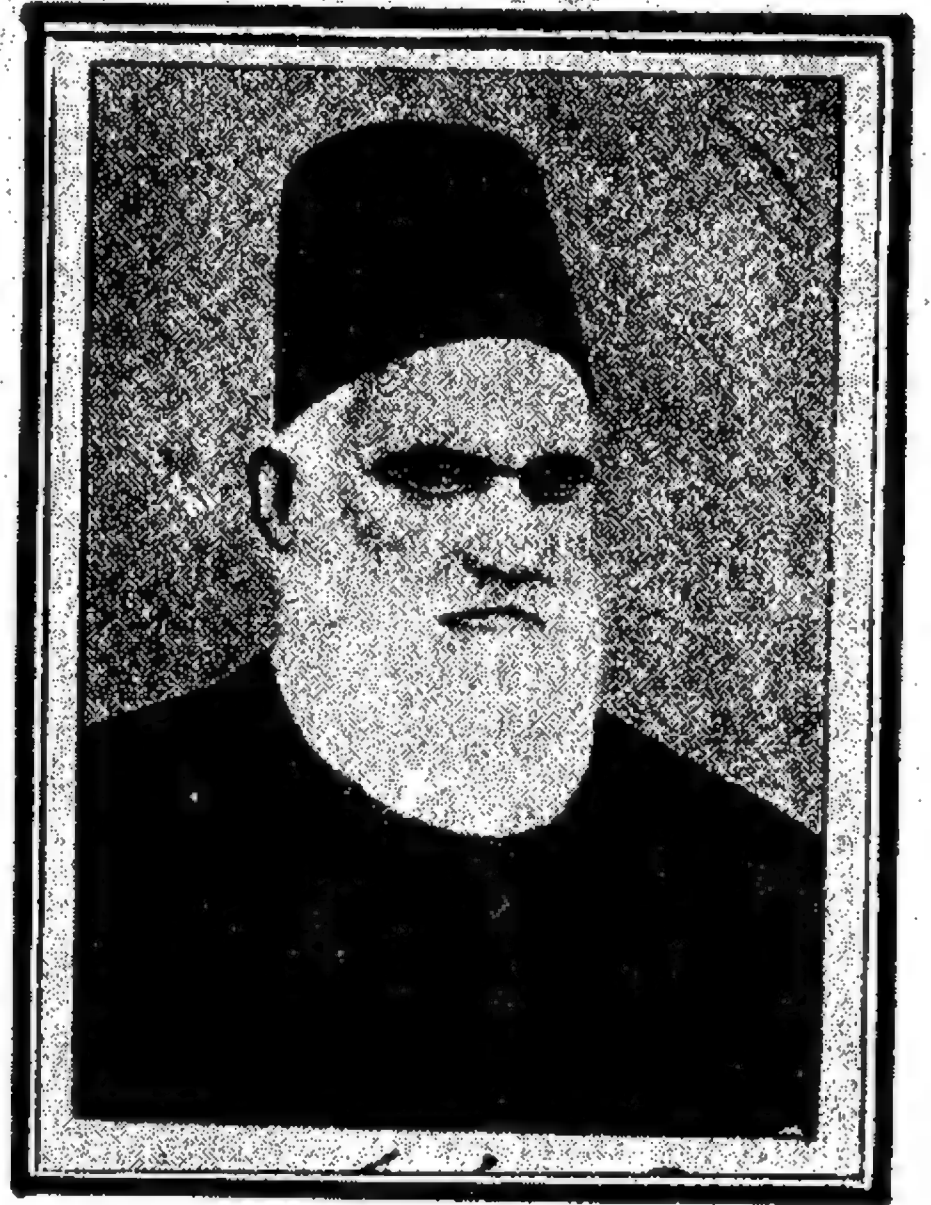
”حضرات! دل کی کسک کون دکھا سکا ہے  
جو میں دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سرسید  
کیا گئے ایک برگشتہ قسمت قوم کا سربراہ ایک  
نادر ملک کا گنج بے بہا اور میرا رشدا رہبر  
اور دوست جاتا رہا۔ ہم نے اس سے قومی  
خدمت کا مفہوم سیکھا۔ دوسروں کے لئے  
اپنی زندگی کے عیش و آرام کو قربان کر دینے  
کا سبق پڑھا۔ جب وہ قومی خدمت کے دشوار  
مزار راستہ پر آگے بڑھا تو بہت سے لوگ  
جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے  
رہ گئے، بہت سے اقبال و خیراں آگے  
بڑھے لیکن ہونٹوں پر پیریاں جم گئیں اور  
پیروں پر چھالے پڑ گئے، دم چڑھ گیا اور  
چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن وہ ادوا العزم  
انسان اسی طرح تازہ دم رہا۔ نہ اسے رستے  
کی ٹکائن نے مضمحل کیا نہ ساتھیوں کے چھوٹ  
جانے سے اس کی ہمت ٹوٹی نہ منزل کی دوری  
نے اس میں ہراس پیدا کیا۔ اب یہ لیل و نہار  
دور سید احمد میدان کر سکیں گے۔“

محسن الملک کی چمکیاں بندھی ہوئی ہیں۔ بڑی مشکل سے  
سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور کہا۔

”جس جگہ آج میں تقریر کرنے کھڑا ہوا ہوں  
اتنا کہا اور رونے لگے۔ اس جگہ سے فدا ہٹ گئے اور  
پھر بولے۔“

”یہاں سرسید مرحوم کھڑا کرتے تھے۔  
مجھے صرف ان کی ذات سے ہی محبت نہ تھی بلکہ  
پچاس سالہ تجربہ نے یہ بات میرے دل پر نقش  
کر دی تھی کہ قومی درد اور یہی خواہی کو جب



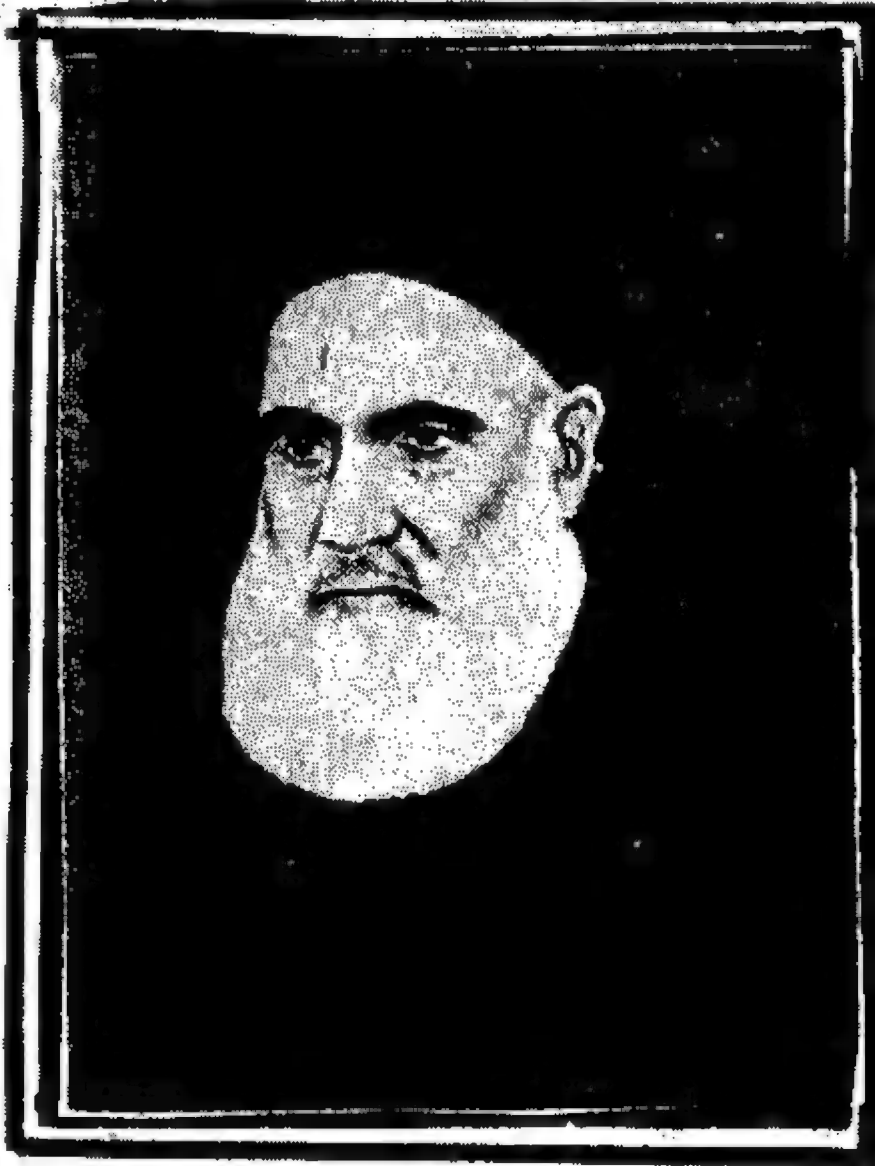


محسن الملک نواب مولوی سید مہدی علی خاں میر نواز جنگ مرحوم

ایک دم کھڑے ہو گئے جیسے سرسید کی روح نے خاموشی سے  
کان میں کہہ دیا ہو کہ میرا ماتم بھی کسی تعمیری کام کی بنیاد بننا  
چاہیے۔ بولے:-

حضرات جب کوئی بڑا شخص دنیا سے گزرتا  
ہے تو اس کو امتحان کی نظر سے دیکھنے والے  
اپنی شکر گزاری اور دلدادگی کے ثبوت میں  
کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ان کے محبوب  
اور مقصد کی شان کے لائق ہو۔ ان کے لئے  
عالی شان مقبرے بنواتے ہیں۔ سنہرے گنبد  
تعمیر کرتے ہیں، ان کے نام کے لشکر خانے  
جاری کرتے ہیں، سالانہ عرس کرتے ہیں۔  
چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور ان کے پس  
ماندوں کے لئے بڑے بڑے ذخیرے

مال و دولت جمع کرتے ہیں، تم جسکو چاہتے  
تھے اور جس کو اپنا مصلح اور پیشوا سمجھتے تھے  
وہ نہ زندگی میں اپنے لئے نذر دنیا ز کا  
طالب ہوا نہ اپنی ذات کے واسطے تم سے  
کسی چیز کا کبھی خواہاں ہوا بلکہ خود اپنا مال  
تم پر قربان کیا اور اپنی کمائی تمہارے  
کاموں میں لگائی۔ یہاں تک کہ نہ اپنے مرنے  
کے لئے ایک جھونپڑا چھوڑا اور نہ اپنے کفن  
کے واسطے ایک گز ٹکڑا، جو کچھ تم سے لیا  
تمہیں پر خرچ کیا اور تمہارے ہی کاموں  
میں لگایا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی یہ تمنا  
نہ تھی کہ اس کی یاد گار میں مقبرہ بنایا جائے  
یا اس کی قبر پر لشکر جاری ہو یا اس کے نام  
کی کوئی خانقاہ بنائی جائے بلکہ یہی آرزو تھی  
کہ مرنے کے بعد بھی جو کام تمہاری بھلائی کا  
اس نے شروع کیا تھا وہ پورا ہوا اور قومی ترقی  
کے اہلی وسائل یعنی تعلیم و تربیت کے سامان  
پورے پورے جمع کئے جاویں اور ایم۔ اے۔  
او کا لچ کو مسلم یونیورسٹی کے دیہہ پر بنایا  
جاوے۔ سرسید آپ میں نہیں ہیں لیکن ان کا  
بتایا ہوا راستہ سامنے ہے اور اب بھی پکارا جا رہا ہے  
تو اسے مسافر شب خود چراغ بن اپنا  
کر اپنی رات کو چراغ جگر سے نورانی  
محسن الملک۔ جو آگ مرید نے اپنے رفقاء کے دل میں  
لگا دی تھی اس کے شعلے ان کے بعد تیز تر ہو گئے اور ان کے  
ماتمی جلسوں سے مدرسہ العلوم کو یونیورسٹی بنانے کی  
تحریک کا آغاز ہوا۔ محسن الملک نے ہاتھ میں کاسہ لگائی  
لیا۔ ان کے ساتھیوں نے گلے میں جھولیاں ڈالیں اور گھر گھر



نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم

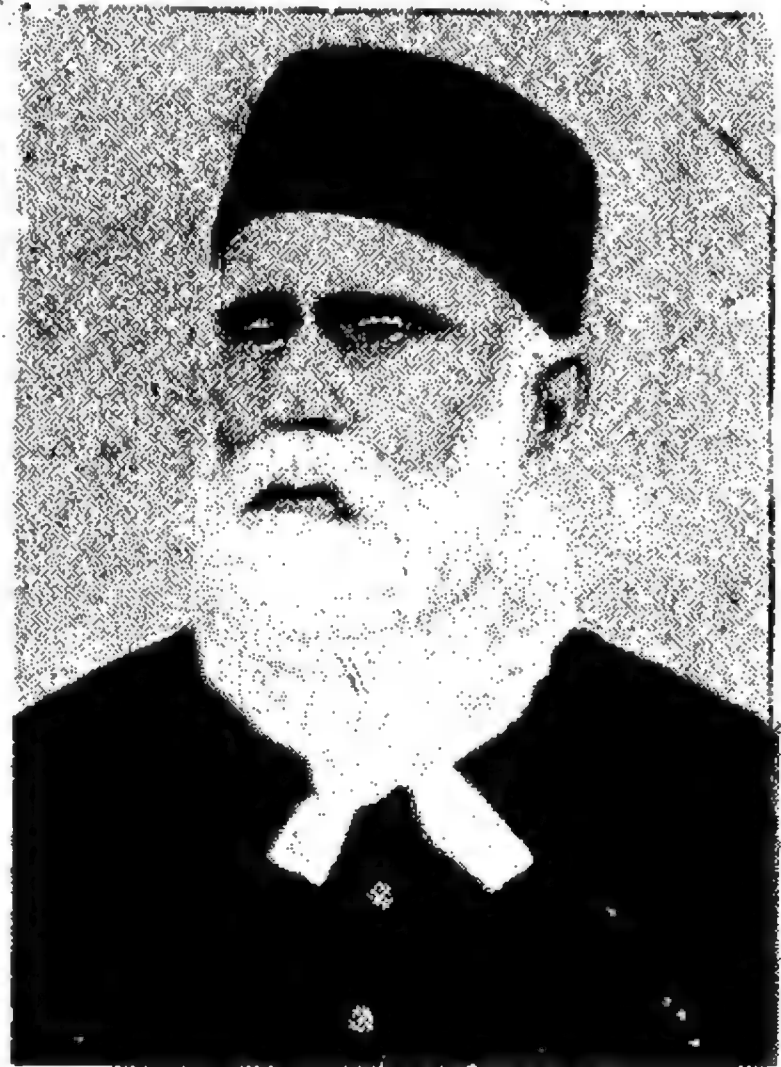
رکھتے ہوئے ہر ذاتی ذلت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ایک بار سید محمود خفا ہو گئے۔ بھرے جلسے میں گلوگیر آواز میں تیس سالہ تعلقات کا واسطہ دیا اور ان کے قدروں پر گر گئے۔

ملک کی عام فضا اب بدلنے لگی تھی اور سیاسی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ کالج کے طلباء بھی ان سے متاثر تھے اور ان میں کالج کے انگریز اساتذہ کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ طلباء و سرسید کی تعلیمی تحریک ہی کو اس بیداری کا سبب بناتے تھے اور کہتے تھے کہ نئے حالات میں ان کی تعلیمی جدوجہد کا تقاضہ ہے کہ سیاسی جوہر کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے سرسید کی روح سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا

جا کر دستک دی کہ  
تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا  
اس لئے ڈالے گئے میں جھولیاں آئے ہیں ہم  
خود غرض نظر میں یا کار ہم کو۔ یا گدا  
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشان آئے ہیں ہم  
غور سب بچا ہیں ان کے قوم ہے جن کی ذلیل  
خود عزت کے شا کر سب نشان آئے ہیں ہم  
راستہ دشوار گزار تھا اور منزل دور لیکن محسن الملک  
نے ہمت نہ ہاری اور فیصلہ کیا کہ چاہے کتنے ہی مصائب کا سامنا  
کرنا پڑے وہ اپنے نصب العین کو نہ چھوڑیں گے اور اپنی  
جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔

نیکم فروری ۱۹۱۹ء کو محسن الملک کالج کے سیکریٹری  
منتخب ہوئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء تک جب انہوں  
نے داعی اجل کو لبیک کہا، سلسلہ کالج کے کام کو آگے  
بڑھاتے رہے۔ جب سرسید کا انتقال ہوا تھا تو کالج کی  
سالانہ آمدنی ۷۷ ہزار تھی۔ محسن الملک نے اپنی کوشش  
سے اس کو لڑیڑھلا کر تھک پہنچا دیا اور ۶۰۵ سال میں  
کالج کے لئے چھ لاکھ چہرہ جمع کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فصاحت  
اور خوش بیانی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ تقریر کرتے  
تو منہ سے پھول جھڑتے اور سینے والوں پر کیفیت طاری  
ہو جاتی۔ انہوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو کالج کے  
کام میں لگا دیا۔ ان کی کوشش سے عوام کی کالج سے غلط فہمیاں  
دور ہوئیں۔ شاہ افغانستان میر حبیب اللہ خاں نے جب  
علی گڑھ میں قدم رکھا تو طرح طرح کی بدگمانیاں دل میں  
تھیں لیکن جب ایک دن رہ کر یہاں کے حالات کا جائزہ  
لیا تو انداز ہی بدل گیا اور اس دریں گاہ سے ایک گہرا  
تعلق پیدا ہو گیا۔ ٹرسٹیوں میں اختلافات شروع ہوئے  
تو محسن الملک نے درس گاہ کے مفاد کو سب سے مقدم



مولانا سید الطاف حسین حالیؒ

جو اس کی اتہا ہم میں تو اس کی ابتدا ہم ہو  
علی گڑھ کے طلباء کی ایک بڑی تعداد نے آزادی کے  
نئے رجحانات سے سرشار ہو کر سیاست کے میدان میں قدم  
رکھا۔ محسن الملک نے ان کے جذبات کا پورا احترام کیا لیکن  
اتہا پسندی کے خطروں سے بھی آگاہ کر دیا۔  
”وہ ابھی جوان اور پرجوش ہیں اس لئے  
بڑھوں کے اعتدال یا مصلحت یا دھیمی چال  
کو وہ کمزوری بلکہ بزدلی اور خوشامد سمجھتے  
ہیں۔ دس برس کے بعد وہ ایسے بڑھوں کو  
بھی نہ پائیں گے اور نہ تعلیم یافتہ بہادر  
اور قوی دل اور قوم کے شیدائی اور غلامی  
ان کو بہت پسندیں گے اور اپنے پروردگار اہل  
سے قوم کی رسی کو ایسے زور سے کھینچیں گے

کہ سب لوگ ان کے دست و بازو کی قوت  
دیکھ کر آفریں کریں گے، مگر اندیشہ ہے کہ  
رسی ٹوٹ جائیگی اور شیرازہ بکھر جائے گا۔“  
شملہ میں طلباء کا اسٹرائیک ہو جس نے بدنامی  
اقتدار کر لی محسن الملک بڑھاپے اور بیماری میں یہ صدمہ برداشت  
نہ کر سکے اور سیکریٹری کے عہدہ سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔  
دامن ناس کا تو بھلا دوسرا ہے اسے دست جنوں  
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مراد وہ نہیں  
طلباء نے سنا تو ندامت سے ان کے سر جھک گئے اور  
ایک معافی نامہ لکھ کر اپنی خطاؤں سے درگزر کرنے کی درخواست  
کی۔ محسن الملک کا دل بھرا آیا اور جواب دیا:-

”خدا میرے عزیز طالب علموں کی عمر دراز کرے  
اور ان کو باقبال کرے وہ قوم کے فخر ہوں،  
وہ میرے مرتے وقت اپنے سعادتمندانہ عمل  
سے تسلی دیں، میرا جنازہ اٹھائیں اور اپنے  
ہاتھوں سے مجھے دفن بھی کریں۔ میرے  
کوئی اولاد نہیں ہے، میرے کوئی بچہ نہیں،  
مگر جتنے لڑکے یہاں ہیں وہ میرے بچے ہیں  
گو وہ مجھے اپنا نہ سمجھیں مگر میں ان کو اپنا جگر گوشہ  
اور پارہ دل سمجھتا ہوں اور یہ بھی امید  
رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی  
سرزمین میں دفن کریں اور مٹی کے ڈھیلے میری  
قبر پر اپنے پیارے ہاتھ سے رکھیں۔“

محسن الملک کا جنازہ شملہ سے علی گڑھ میں  
آٹھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ وقت آپہنچا  
جس کا دھڑکا تھا۔ محسن الملک نے شملہ میں جان جان آفریں  
کے سپرد کی۔





ڈاکٹر ذبیحہ نذیر احمد

کی خاطر ہر تکلیف کو برداشت کر لینے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ وہ دل کے صاف لڑہان کے کھرے اور لڑاؤ کے پکے تھے۔ جو بات دل میں ہوتی وہی اسے بلا خوف اور بلا مروت کہہ دیتے تھے۔ ان کے انتخاب پر مبارکباد کا جلسہ ہوا اس میں انہوں نے نہایت صفائی لیکن دلسوزی کے ساتھ فرمایا۔

”میں اس وقت وعدہ نہیں کرتا کہ میں کیا کروں گا اور کیا نہ کروں گا اور میرے کام کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ البتہ مجھ کو اپنے احباب، فریضوں اور کالج اسٹاٹن سے امید ہے کہ وہ اور میں مل جل کر کام کریں گے اور وہ مجھے پوری طرح مدد دیں گے اور اس طرح قوم کی جو خدمت مجھ سے بن آئے اس

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غم خوار سر کر کے ہم، قوم کے کام آگیا آخر جنازہ مانا وہ لے جانے کے لئے گاڑی کے ذریعہ جب علی گڑھ سے گزرا تو طلباء نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے رنچس کو علی گڑھ میں اتار لیا اور سرسید کے قریب ان کو ان الفاظ کے ساتھ سپرد خاک کیا۔

۱۰۔ کالج کی مہارک زمین، دیکھ آج قوم کا جگر گوشہ اپنی زندگی کے مرحلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھ تیرے پاس ہماری قوم کے دو نعل بے بہا اور بھی دفن ہیں آج ایک تیسرا گورہ شہر چرخا اور آتا ہے یہاں خفتہ بخت، حراماں نصیب قوم کی تین امانتیں ہیں جو تجھے رادرجہ کے سامنے پیش کرنی ہونگی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تارے تھے جو آج تجھ میں مدفون ہیں لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی بددشمنی چھوڑ گئے ہیں اور حشر میں پھر چکیں گے، اے روشنی جا، اے قوم کے نامے جا اور وہاں جا کے سوجا جہاں قوم کے آفتاب دھتک بڑے مور ہے ہیں، شاہ قلمت آہ بونچی ہے، تاریکی چھا رہی ہے اب اور تارے نکلیں گے مگر تیری چمک کسی میں نہ ہوگی جا! اب عالم بھلا میں جا۔ تیرا آنا مبارک ہوا، خدا تیرا جانا بھی مبارک کرے، تجھ پر ہزاروں درود اور سلام ہوں اور تجھ پر تاقیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں۔

نواب وقار الملک، ۱۵ دسمبر ۱۹۰۲ء کو نواب وقار الملک ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ساڑھے چار سال تک کالج کی باگ ڈور ان کے ہونے کے مضبوط ہاتھوں میں رہی ماحول

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

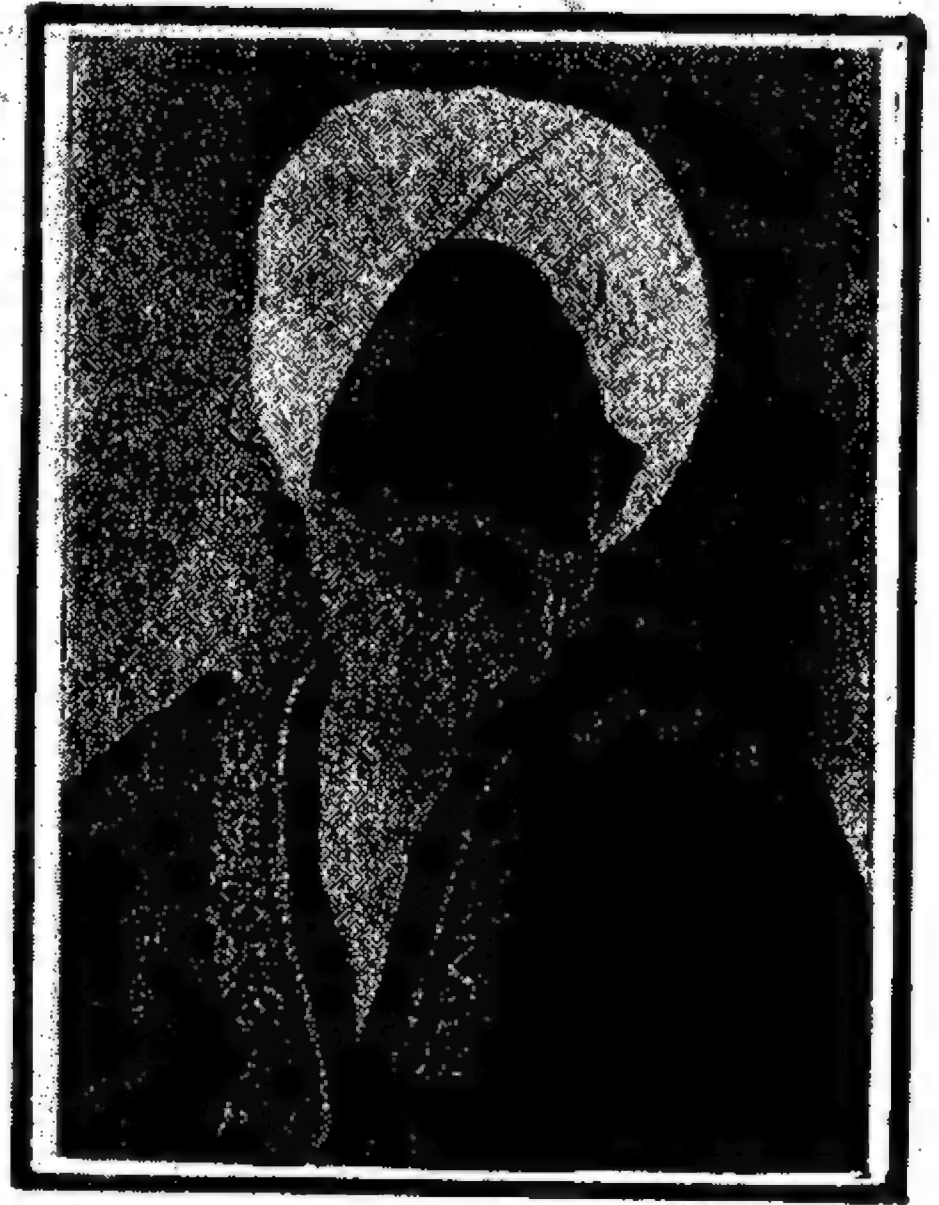
اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے  
واسطے جوڑ سپن قائم رکھنے کی غرض سے  
عائد ہویم کو تیار رہنا چاہئے، عام ازیں  
کہ طلباء کی طرف سے کوئی ایسی دھمکی ہو  
یا اسٹاف کی طرف سے۔ میں انتظام کو ضعیف  
اور کمزور دیکھنے کی بہ نسبت کالج اور بورڈنگ  
ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا مناسب  
سمجھتا ہوں۔

اس بوڑھی آواز میں یقین و اعتماد کی بے پناہ قوت  
تھی۔ محسن الملک ہیں اگر شان جمال جلوہ گر تھی تو دربار الملک  
کی ذات شانِ جلال کی منظر تھی۔ لیکن ان کی ضابط کی باندی  
کے پیچھے ایک حساس، فرفش شناس اور قومی لگن سے  
بھر پور دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں۔ ان کی دل نوازی  
کا یہ عالم تھا کہ جو طالب علم ملنے کے لئے آتا، کھڑے ہو کر اسکا  
استقبال کرتے اور انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ بٹھا  
کر بات کرتے۔ اگر ان کے مطالبے پورے نہ کر پاتے تو اقبال  
کے اس شعر کی مجسم تصویر بن جاتے۔

مری دے ہے کہ ہو تیری آرزو پوری

مری دے ہے تری آرزو بدل جائے  
وہ طلباء میں عزت نفس، خودداری اور احساس  
خودی پیدا کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ انکا عقیدہ تھا  
خودی کے سائیں ہے عمر جادو ال کا سراغ  
خودی کے سوز سے روشن ہیں اتوں کے چراغ  
ایک دفعہ کسی شخص نے طنزاً ان کے سامنے کہا کہ بعض  
ایسے طلباء بھی وظیفہ مانگنے آتے ہیں جو سوٹ اور بوٹ سے  
آراستہ ہوتے ہیں ان کو مدد نہ دی جائے۔ یہ گفتگو ان کو  
ناگوار ہوئی فرمایا۔

”کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے طالب علم ہم



علامہ شبلی نعمانی

کے لئے میں ہمہ تن حاضر ہوں۔

پھر فرمایا۔

”مجھ کو یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ بہت  
عرصہ سے ہم سنتے چلے آتے ہیں کہ فلاں معاملہ  
پر اس لئے زور دینا مناسب نہیں ہے کہ  
کہیں یورپین اسٹاف بد دل ہو کر کالج نہ  
چھوڑ دے اور اب طلباء کی اس حال کی  
شورش سے ہمارے لئے ایک تازہ دھمکی  
یہ پیدا ہوئی ہے کہ کہیں طلباء اسٹراٹک  
نہ کر دیں۔ اس قسم کے حالات کے لحاظ سے  
میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا  
انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ  
منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہئے

سانے تنگے سر یا جھوٹے لگائے ہوئے  
اگر مدد مانگیں۔

ان کا دروازہ طلباء کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا  
بیماری کے زمانہ میں معالج اور تیماردار کام کرنے کو منع کرتے  
اور لوگوں سے ملاقات پر پابندی لگاتے تو وہ یہ کہہ کر ماری  
پابندیاں توڑ دیتے۔

”کام ہی تو میری زندگی کا باعث ہے۔ جس  
وقت مجھ سے کام چھوٹ جائے اس وقت  
مجھ لینا میرا آخری وقت آپہنچا۔“

درنگاہ کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلے اور  
پیرانہ سالی کے باوجود شہر شہر پہنچے۔ ایک جگہ کہہ کر  
”میں نہ کوئی عالم ہوں جو اپنے مؤخر و عطر سے  
جماعت کے دلوں کو ہلا دوں، اور نہ کوئی  
مکچر ہوں جو اپنی فصیح و بلیغ اور جادو بھری  
تقریر سے دوسروں کے دلوں کو تسخیر کر لوں۔“

نہ میں بہت بڑی بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں  
دلانے والا آدمی ہوں۔ البتہ اپنی زندگی میں  
جہاں بھی آب و دانہ مجھ کو ملے گیا اپنے ملک  
اور قوم کے تعلیمی مسائل کے ساتھ مجھ کو  
دلچسپی رہی اور شاید یہی ردشہی مجھ کو  
کشال کشال یہاں تک لائی ہے۔“

اس کے بعد نہایت درد بھرے لہجہ میں کہا کہ  
فقیرانہ آئے صدا کر چلے

میاں خوش رہو مہم رہا کر چلے

ایک فقیر جمع سے اکٹھا اور پوچھا کتنی رقم چاہتے

ہو، جواب دیا ”چھ لاکھ کی ضرورت ہے۔“

فقیر نے چھ پیسے ہاتھ میں دیئے اور کہا چھ لاکھ  
میں گے۔ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا اور وقار الملک نے اپنے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ مبر



مولوی ذکار اللہ

زمانہ میں چھ لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا۔

وقار الملک کی صحت اب جواب دے چکی تھی۔ احساس

فرض کے باعث ان کو آرام نہیں ملتا تھا۔ بالآخر میکریری کے

عہدہ سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ طلباء کو معلوم

ہوا تو ۲۸ فروری ۱۹۱۲ء کو ان کی خدمت میں ایک ایڈریس

پیش کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنی رہبری سے محروم نہ

آخر میں یہ شعر لکھا کہ

میکشوں کے سر پہ یارب پریمیاں رہے

دور میں ساغر رہے گردش میں چیمانہ رہے

۲۸ فروری ۱۹۱۲ء کو اپنے وطن امرتسر میں نواب

وقار الملک نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اعظم گڑھ سے

آواز آئی۔

”نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر





نواب محمد اسحاق خاں مرحوم

سیاست کا ماتم کیا، مولانا ندیر احمد کے مرنے پر محنگاری اور نرم آرائی کا مشیم پڑھا۔ مولانا ششٹی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوہ کیا۔ مولانا خاں کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن درسی اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا لیکن وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور ادب و العزائم اخلاق کی گمشدگی پر فریاد۔۔۔ وہ ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔

نواب وقار الملک کے بعد نواب محمد اسحاق خاں اور سید محمد علی سیکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۹۲۰ء

۱۱۴۰ ہجری ۱۱۴۰

میں جب ایم۔ اے۔ اور کالج کو یونیورسٹی کا پلڑا مل گیا تو رام محمد آباد پہلے وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۱۲ء میں کچھ مہینوں نواب مزل اللہ خاں نے کام کیا۔ یکم جنوری ۱۹۱۳ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے وائس چانسلر کے عہدہ کا چارج لیا۔ اور تین سال بعد یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو بیماری کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کالج کے پرانے طالب علموں میں تھے دس گیارہ برس کی عمر میں ان کے والد نے جو کچھ پورہ ضلع کرنال کے رئیس تھے انہیں علی گڑھ سرسید کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا تھا ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ دکنور یہ گیت کے سامنے احاطہ کی جالیوں کے قریب ایک بچہ نالی تھی جس سے باغوں کو پانی دیا جاتا تھا نئی نئی سرخ اینٹوں کی یہ نالی دور تک سبزے میں چلی جاتی تھی اور بہت خوب صورت معلوم ہوتی تھی۔ آفتاب احمد خاں نے جو تیاں اتاریں اور اس نالی میں دوڑنے لگے جالیوں کے پیچھے سے سرسید اپنی گاڑی پر آ رہے تھے۔ انہوں نے آفتاب احمد خاں کو بلایا اور طمانچہ رسید کیا۔ صاحبزادہ صاحب عمر بھروسہ طمانچہ پر فخر کرتے تھے اور جب یکم جنوری ۱۹۱۳ء کو وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہوئے تو ان کا دل سرسید کی یاد سے بھر آیا۔

”یہ منظر کتنا روم فرمایا کہ سرسید کی خدمات اور کارگزاریوں کو فراموش کرنے والے وہ افراد ہیں جن کے لئے مرحوم نے اپنی حیات اور مساکمی کا پورا سرمایہ وقف کر دیا تھا۔ اور جن کی بصیرت اور اور انشراح قلب کے لئے انہوں نے ہمت بالشان اسوہ حسنہ اور غیر فانی کامیابیوں



نواب سید محمد علی مرحوم

کا پہلا سبب مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں  
کا بہ حیثیت رکن موجود نہ ہونا قرار دیا۔  
صاحب زادہ صاحب نے یونیورسٹی کے خاکے میں  
رنگ بھرے۔ مختلف شعبوں کی از سر نو تنظیم کی رہنمائی  
زندگی کو بہتر بنانے کی تجویز پر سرگرمی سے عمل کیا۔ طلباء  
میں علم کی لگن پیدا کرنے کی جدوجہد کی، عمارتوں کی تعمیر کا  
پروگرام بنایا۔ حد یہ ہے کہ ان کی نظر ناقص القوی بچوں  
کی طرف بھی گئی۔

”حضرات اب میں چند الفاظ ایک ایسے بحث  
کی نسبت کہنا چاہتا ہوں جسکو اس ملک  
کی گورنمنٹ اور رعایا دونوں نے نظر انداز  
کر رکھا ہے۔ میرا مقصد ان بچوں کی تعلیم و  
تربیت سے جو رمانی یا جسمانی حیثیت

کا بے پایاں ترکہ چھوڑا ہے۔  
سر سید کی یادوں سے کچھ محو ہونے لگی تھی اور  
بعض لوگوں کو سر سید کے سیاسی طریقہ کار کے متعلق کچھ غلط  
نہیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ آفتاب احمد خاں نے کہا:۔  
”آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جس نے ہندوستان  
میں سب سے پہلے سوراخ کی حقیقت کو  
محسوس کیا وہ ہمارے رہبر سر سید تھے  
وہ ذات سر سید ہی کی تھی جس نے اس حق  
کا مطالبہ کیا اور سوراخ کے اولین نقوش  
اس ملک کے صفحات پر بچائے۔ سر سید ہی  
نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت  
سب سے پہلے محسوس کی اور اس کی تبلیغ ایسے  
وقت ایسے طریقے اور ایسی زبان میں کی جو  
آج تک قابل یادگار ہے۔ حصول سوراخ  
کی آخری مترلوں کو طے کرنے کی سعادت  
خواہ کسی کو نصیب ہو، لیکن اس حقیقت کا  
اعتراف قرن انصاف ہے کہ ایک ایسے وقت  
میں جبکہ ہر اس شخص کے لئے جو ارباب  
حکومت کے اشتباہ اور عتاب کا مورد تھا  
مارشل لا اور دار در سن پذیرائی کے لئے  
موجود تھے۔ صرف سر سید کی وہ ذات تھی  
جو قوم و ملک کے لئے سب سے پہلے سینہ  
سپر ہوئی اور اس نے

REPRESENTATIVE

GOVERNMENT

کی اولین علم برداری کا طرہ امتیاز حاصل  
کیا۔ شہداء کے فوراً بعد ہی انہوں نے  
رسالہ اسباب بغاوت ہند، لکھا اور بغاوت



### سرسید کے اخلاقی تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ کا سرورق

سے ناقص بقول ہیں۔

اس احساس نے احمدی اسکول کی شکل اختیار کر لی  
۱۸ جنوری ۱۹۰۳ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں  
نے انتقال کیا۔ ان کے ایک اسکول کے ساتھی اور دوست  
نے مرثیہ میں لکھا ہے

ہو گا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر

کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

سر شاہ محمد سلیمان:۔ اعظم گڑھ کے ایک عالم  
خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سرسید کا جب انتقال ہوا تو  
ان کی عمر ۱۲ سال تھی۔ انہوں نے کیمبرج سے

MATHEMATICS میں TRIPOS

لیا اور ۳۴ برس کی عمر میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر

ہوئے۔ ۹ سال بعد CHIEF JUSTICE کے

عہدہ پر فائز ہوئے۔ ہندوستان کی جوڈیشل سسٹری

میں اس عمر میں اتنے بڑے اعزاز کی مثال دوسری نہیں ملتی۔

انکی THEORY OF EXPANDING UNIVERSE

کا دور دورہ شہرہ تھا۔ وہ تین بار یونیورسٹی کے وائس چانسلر

ہوئے اس طرح کہ عجیب کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور

وائس چانسلری کا کام بھی کرتے تھے۔ دہلی سے علی گڑھ

آئے اور طالب علموں کی طرح کمرہ میں رہتے اور کام ختم کر کے

دہلی واپس چلے جاتے۔ آخری بار وہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۰ء سے

۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء تک وائس چانسلر رہے۔

سر شاہ سلیمان نے سائنس کی طرف رغبت دلانے

کی کوشش کی اور وقت کی اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلائی

”سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فطرت

کو سمجھا جائے اور اس پر قبضہ حاصل کیا جائے

اور یہ بھی کہ آدمی حقیقتوں کو جانے اور توہمات

کی بندشوں سے رہائی حاصل کرے۔



خیالات اور طبیعت میں آزادی پیدا کرے  
اور محض اختیار و حکم کا حلام بن کر نہ رہ جائے  
سائنس نے انسانی آزادی کا اعلان عام کیا  
ہے اور انسانی خیالات کی وسعتوں کو ترقی  
دے دی ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ فطرت  
میں سائنس کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔  
تورڈا میں فطرت السامان نے زنجیریں تمام  
دور سے جنت سے روتی چشم آدم کب تلک  
انہوں نے بتایا کہ ماضی کی مستقل اور لایعنی یاد حال  
کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس لئے ضرورت ہے  
کہ لوگ جوئے تاروں کے ماتم کرنے کے بجائے بھرتے  
جوئے سورج کو دیکھا جائے اور خرد کو غلامی سے آزاد کر کے  
علم و عمل کی نئی روایات قائم کی جائیں۔

”بغداد اور قرطبہ کے قدیم درس گاہوں کے تذکرے  
سے اپنی گزشتہ عظمتوں پر فخر کرنا بیکار ہے  
گو تاریخ کے صفحات پر وہ نہایت بہتم بشارت  
نظارتی ہیں۔ لیکن نہ تو اس امر کا بار بار ذکر  
کہ قدیم عہد ماضی کیا کیا کیا جا چکا ہے  
اس وقت ہمارے لئے کارآمد ہے اور نہ  
موجودہ پستیوں کی الم انگیز تاریک حالت  
کی تصویر کشی ہی ہمارے لئے مفید ہو  
سکتی ہے بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنے چاروں طرف  
نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ دیگر قومیں ہمارے  
مقابلہ میں کیسی ترقی کر چکی ہیں اور اپنے خدائے  
کا اعلاہ کر کے ہم کو اسی طرح کی ترقی کے  
ماہل کرنے کے وسائل ہم پہنچانے  
چاہئیں۔ ہمارے خیالات اور روایات  
اور ہماری زندگی کے طریقے پر عظمت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی حیدر

ماضی کی یادگار ہیں لیکن جس حد تک  
وہ قدیم ہیں اسی قدر وہ پرانی بھی ہیں اور  
وہ ہرگز اس ترقی کے سلسلے میں رکھی  
جا سکتیں جسے دنیا نے عہد حاضر میں پیدا  
کیا ہے۔ ہم کو اپنی اصلیت محفوظ رکھنی چاہیے  
اور اپنی روایات کے روح و جوہر کو بھی  
محفوظ رکھنا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ  
ہمیں خود کو زمانے کے تغیر پذیر روایات  
کے سانچے میں ڈھالتے رہنا چاہئے۔“

پھر نہایت پر خلوص آواز میں فرمایا:-  
”ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ مدینہ  
سے ہم اسی ملک میں پیدا ہوتے رہے ہیں  
اور یہیں پرورش پائی ہے اور یہی ہمارا  
وطن ہے۔ ہماری قسمیں اسی ملک سے  
جوابدہ ہیں اور اسی کی آئندہ اقبال بندی  
میں ہمارا سورد و بہورد مضمر ہے لہذا ہماری  
تمام قوتیں مادر وطن کی ترقی میں صرف ہونی  
چاہئیں۔ ہم کو تعلیمی حیثیت سے اپنے شہر  
اس قابل بنانا چاہئے کہ ہم اپنے عزیزان  
وطن کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں  
اور محض مال و جہ سے کہ ہم ان کی برابر ترقی  
کے میدان میں گامزن نہیں ہو سکتے۔ ہمیں  
ان کے لئے ہار نہ ثابت ہونا چاہئے۔ ہمیں  
یہ مناسب نہیں کہ جو لوگ آگے نکل گئے ہیں  
ان کو پیچھے نہ چھوڑیں بلکہ ہم کو لازم ہے کہ ہم  
خود اتنی ترقی کریں کہ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔  
علی گڑھ میں ان کی مسلسل جدوجہد اور ہم پر تقریر و تحریر کا  
مقصد صرف یہ تھا کہ۔“

ضمیر لایہ روشن چراغ آرزو کر دے

جہن کے ذرے ذرے کو شہید بن کر دے

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم مدظلہ شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان میں تعلیم نسواں کا جھنڈا اس وقت بلند کیا جب کسی کے حاشیہ خیال میں بھی اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا تین منہ سب کچھ اسی مقصد کے لئے وقف کر دیا۔ حالات کی ناساعدت نے بلکہ ان کا دامن پکڑا اور مخالف قوتوں نے انہیں ہار ہا گیرا لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ ان کے استقلال اور عزم کو دیکھ کر اقبال کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آ جاتا تھا۔  
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انڈیا خروار

تقریباً ۱۰ سال پہلے ایک تہی ہوئی روپہ میں ہم ارہی

سالہ ۱۹۹۱ء کو شیخ محمد عبداللہ فرسٹ ایر میں داخلہ کے لئے

لاہور سے علی گڑھ پہنچے۔

مجھ اس بارک میں کمرہ ملا جس کو کچی بارک

کہتے ہیں۔ میرے کمرے کے آس پاس بہت

ممتاز طالب علم رہتے تھے مثلاً خواجہ غلام اشقلین

مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کالج میں ان دنوں

اسٹریچی ہال کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی اگر

روپیہ ہوتا تھا تو مدد دلگ جاتی تھی ورنہ کام

بند ہو جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد دیکھا کہ سر

سید اپنی فٹن میں بیٹھ کر آئے اور مزدوروں

کے پاس ہونٹ سے پر بیٹھ گئے اور ان کو

ہدایت کرنی شروع کی کہ تم اینٹوں کے

ردے غلط لگا رہے ہو اس طرح لگاؤ۔

اس کو دوبارہ چنو۔ اس میں یہ اصلاح کرو

میں اور دوسرے کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ ان کی

شخصیت میں عجیب وقار اور دل کشی تھی۔

دوسرے تیسرے دن میں کچھ معزین کے

خطوط لے کر حوالہ ہو رہے ساتھ لایا تھا

سر سید کی خدمت میں کوٹھی پر جافر ہوا۔

سر سید نے نہایت شفقت اور مہربانی سے

فرمایا کہ کبھی کبھی ہم سے مل جایا کرو۔

میں کبھی کبھی ان کے پاس جانے لگا۔ کیا

بتاؤں ان سے ملنے کا مجھ پر کیا اثر ہوتا تھا

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کی سعادت یہاں

ہے اور جس نے اس پر حوالہ ہمت کو دیکھ

لیا زندگی میں کچھ اچھا کام کرنے کا جذبہ

اس میں بیدار ہو گیا۔ ان کی زندگی سے

مجھے یہ سبق ملا کہ

بالے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلیاں کہ بہت یاد رہو

شیخ عبداللہ کا دامن دل علی گڑھ کی سرزمین نے ایسا

پکڑا کہ پھر وہ اسی کے ہو گئے اور اپنی پوری عمر سر سید کے

تعلیمی مشن کو مکمل کرنے کے لئے تعلیم نسواں کے وسائل بہم

پہنچانے میں بسر کر دی۔ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ

تعلیم نسواں کے سیکریٹری خود اپنی کوشش سے منتخب ہوئے۔

”جس روز میں سیکریٹری مقرر ہوا اسی روز

سے میں نے اپنا رواج اس شعبہ کے کام کی

طرف لگانا شروع کر دیا اور تیسری سوچنے

لگا۔ عبداللہ بیگم نے اپنے گھر ایک جلسہ

کیا اور اس میں بہت سی عورتوں کو جمع

کیا۔ محل میں ہر جگہ چرچا ہونے لگا کہ اب تو

فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تجویز ہو

رہی ہے ان کیوں کے مدرسے کھلیں گے

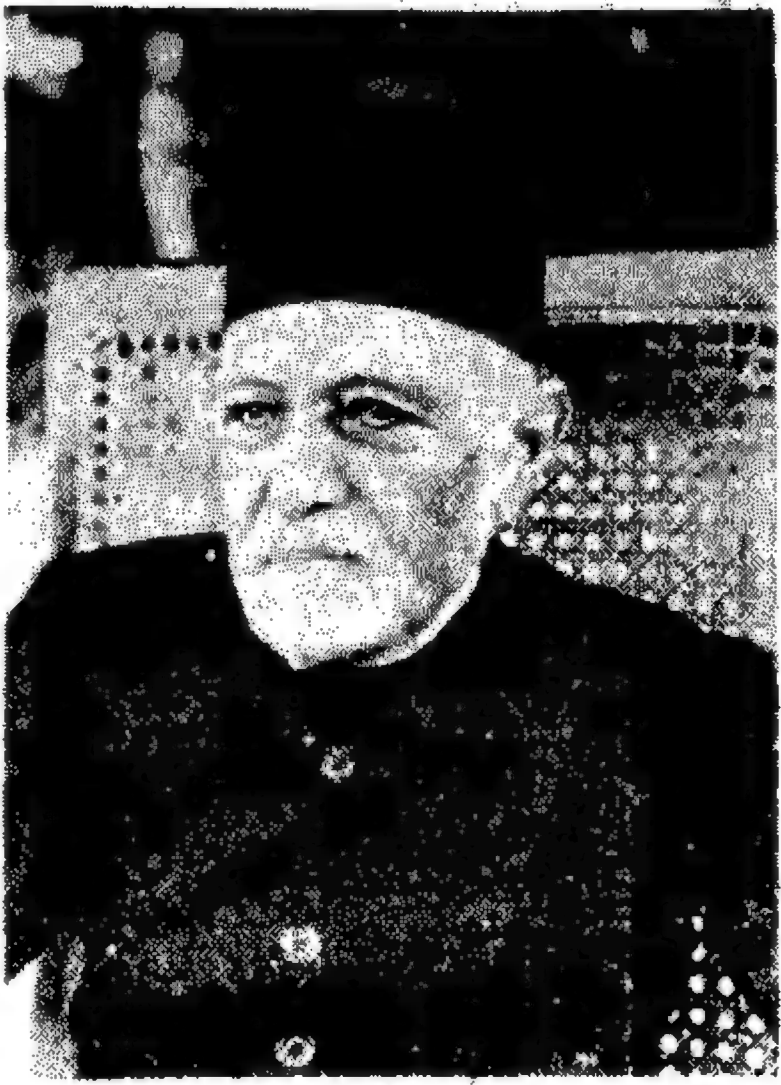
اور لڑکیاں کھیلنے میں سے جایا کریں ؟  
عوام کے خیالات میں تبدیلی لانے کے لئے ضروری تھا  
کہ کوئی رسالہ جاری کیا جائے جس طرح سرسید نے اپنی تعلیمی  
تحریک کا سرچشمہ "تہذیب الاخلاق" کو بنایا تھا شیخ عبداللہ  
نے سلسلہ میں رسالہ "خاتون" کی داغ بیل ڈالی اور  
اعلان کیا۔

"خیالات اور اعتقالات معاشرت اور سوسائٹی  
کی حالت میں انقلاب جس شدت اور سرعت  
کے ساتھ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے  
اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے نظر آئے گا  
اس وقت مسلمان مردوں کی اصلاح بخلاف  
اور ترقی کے لئے منظور بہت سامان موجود  
ہے مگر مسلمان عورتوں کے لئے کوئی مستقل  
اور قابل وقت انتظام نہیں ہے بحیثیت  
انسان وہ ہماری توجہ اور غور کی مستحق ہیں  
بحیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی

حق دار ہیں اور بحیثیت عورتوں کے وہ  
ہماری شریک ہیں اور ان کا اور ہمارا معاملہ  
جدا نہیں ہے۔ ان کی تعلیم کا بھی وہی انتظام  
ہونا چاہیے جو مردوں کا ہے۔ وقت کا قافلہ  
تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر ہم  
نے فوراً عورتوں کی تعلیم کا کوئی معقول  
انتظام نہیں کیا تو ہمارا حال یہ ہو گا کہ  
لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے

بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے ۔  
رسالہ کا نکلنا تھا کہ اعتراضات کی بوجھاؤ شروع ہو  
گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ رسالہ کو بند کر دیا جائے لیکن جس  
نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہو وہ مخالف طاقتوں کے

ملیگزہ مسلم یونیورسٹی نمبر



دین کاغذ کے بانی شیخ محمد عبداللہ مرحوم

آگے سپر کب رکھ سکتا تھا۔ ان کی جدوجہد جاری رہی  
اور جب سلیم صاحب بھوپال نے سورویہ ماہوار کی مدد ان  
کے مدرسہ کے لئے منظور کر دی تو ان کی کوششیں برگ و  
بار لانے لگیں۔ سلسلہ میں وہ تعلیم نسواں کے متعلق ایک  
ڈیوٹیشن نے کرگورنریورپی سے ملے لیکن کوئی امید از صورت  
پیدا نہیں ہوئی انہیں کبھی امید کی کرن دکھائی دیتی تھی اور  
کبھی اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اسی امید ویم کی حالت میں انہوں  
نے اپنا کام جاری رکھا۔ حاتی نے یہ کہہ کر ان کی امید  
بندھائی ۔

اے بے زبانوں کی زباں اے بے لبوں کے بازوؤ  
تعلیم نسواں کی ہم جو تم کو اب پیش آئی ہے  
یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش  
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے





شہر جوا جڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ  
فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی  
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی  
سنگ تربت ہے مرا گر ویدہ تقریر دیکھ  
چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں  
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں  
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان  
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے  
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے  
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھڑ  
رنگ پر جواب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھڑ  
تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا  
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا  
عرض مطلب سے جمک جانا نہیں زیبائے تجھے  
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے  
بندہ مومن کا دل ہم درجہ سے پاک ہے  
قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خاتمہ معجز رقم  
شیشہ دل ہو اگر تیرا مثال جام جسم  
پاک رکھ اپنی زبان، تلمیذ رحمانی ہے تو  
ہونہ جائے دیکھنا تیری صدا ہے آبرو  
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے  
خمن باطل جلا دے شعبدہ آواز سے  
ایک تعارف جو ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۷۹ کو سرسینڈ ہال  
کی سالانہ تقریب کے موقع پر پیش کیا گیا۔ ●●

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

دین کلج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک منظر

ہے رانی بھی بہت اگر دل میں نہیں عزم درست  
پھر ٹھان لی جب جی میں پھر بہت بھی ہو تو رانی ہے  
جو مدرسہ صرف ایک استانی و آخری ہو کو ملازم رکھ کر  
شروع کیا گیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ تعلیم نسواں کا ایک زبردست  
ادارہ بن گیا اور ۶۰ سال کی جدوجہد کے بعد جب شیخ صاحب  
نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کا کمزور و ناتواں جسم کلج  
کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کیا گیا تو ایک طرف دین کلج  
کی وسیع اور خوب صورت عمارتیں ان کے عزم و خلوص اور  
لگن کی شہادت دے رہی تھیں تو دوسری طرف ان کی نقش  
زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

حاصل عمر شاہد رہے یارے کرم  
سلام از زندگی خوشی کہ کدے کرم  
مرسید کی روح نے خاموشی سے اپنے جانشینوں  
کی اس جدوجہد کو دیکھا۔ پھر یکایک ان کی لوح تربت سے آواز  
آنے لگی۔

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے امیر  
اے کہ تیری روح کا طائر نفس میں ہے امیر  
اس جہن کے نغمہ پیراؤں کی آنادی تو دیکھ

میرے زمانے کا

# علی گڑھ کالج

سید المکلف حافظ محمد احمد سعید خاں

(نواب چغتاری) کی ڈائری

بیادہ اقبال

کے چند اوراق

(خاص بہا کے لئے)



قیام باغیت میں میری انگریزی تعلیم پرانے شروع ہو گئی تھی۔ چغتاری آنے کے بعد انگریزی کی تعلیم کا سلسلہ فوراً روک دیا گیا۔ چونکہ میرے دل پر مذہبی رنگ بہت چڑھا ہوا تھا۔ میں نے حفظ قرآن پاک شروع کیا۔ دلا امر حرم انگریزی طرز معاشرت، انگریزی تعلیم اور مغربی کچھ سے بیزار تھے۔ وہ غلہ کے زمانہ میں موجود تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کا قید ہونا خاندان شاہی کا خاک و خون میں ملنا آبروریزی اور خانہ بربادی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ انہوں نے وہ سب کچھ مٹتے دیکھا تھا جس کو وہ اخلاق، تہذیب اور فلسفیت کا حاصل سمجھتے تھے جن کے بغیر زندہ رہنے میں ان کو نہ لطف آتا تھا نہ عزت محسوس ہوتی تھی۔ ان کو گوارا نہ تھا کہ میں انگریزی تعلیم یا انگریزی طرز تفقیر سے کوئی سروکار رکھوں۔ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ بغیر تعلیم انگریزی اب کام نہ چلے گا۔ علی گڑھ کے اراکین کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلی۔ میری تعلیم صرف حفظ قرآن تک محدود تھی

اور طرز بود و ماند کلیتہً مشرقی اور ہندوستانی تھا۔ ایک بار میرے چچا نواب بہادر عبدالعزیز خاں نے مجھے پپ جوٹا لگایا میں پہن کر چلا تو بچہ فرش پر آواز آئی۔ نواب صاحب غلہ آشیاں نے فرمایا کیا کوئی گھوڑا قلعہ کی چھت پر آگیا۔ مجھ ایک چھوٹا گھوڑا اور دین باغی کا بچہ بھی خریدیا تھا۔ ان کی زندگی میں میں نے بندوبست تو کبھی نہیں چلائی مگر غیب علی شکری کو حکم تھا کہ ہر مہفتہ مجھے شکار کرواے جایا کریں۔ باز خانہ بھی میرے واسطے قائم کیا گیا اور باز جڑے اور شکرے پائے جاتے تھے مجھے شکاری جانوروں کا بہت شوق تھا۔

مجھے سویرے اٹھنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی خاصی چاندنی میں جامع مسجد صبح کی نماز کے واسطے جانا پڑے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ اکثر نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ پھسل جاتے اور زمین پر ہاتھ رکھ کر گرنے سے بچتا۔

میں ان کی زندگی ہی میں حافظ ہو گیا تھا جسکی انہیں بہت مسرت ہوئی۔ نواب صاحب غلہ آشیاں جلد تھے کہ میرا

قرآن شریف ختم ہوا۔ تمام حجام میں بیٹھ کر جامع مسجد جمعہ کی نماز کو گئے وہاں مجھ سے مسلمانوں کے مجمع میں ایک رکوع سنا اور نکتی کے بہت بڑے بڑے لفظوں کو تفہیم کرائے۔ دورانِ عیالات میں نواب صاحب میرے چچا سے جو ان کے پاس چھتاری میں رہتے تھے اکثر کہتے تھے کہ تم میں نے کمر سفر کو چھوڑا زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ موت آجائے گی مگر اس سے بڑھ کر اور کون سی سعادت میسر آ سکتی ہے۔

نواب صاحب نے دورانِ عیالات میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا، ایک روز سہ پہر کے قریب نواب صاحب غلہ آشیائیں یکایک بے ہوش ہو گئے۔ مجھے لوگوں کا گھبراہٹ بھرا پھر نایاں یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ کوئی چیز سنگھائی جا رہی تھی۔ جب نواب صاحب کو ہوش آیا تو میرے چچا مرحوم سے فرمانے لگے کہ ہم نے اس وقت ایک عجیب خواب دیکھا یعنی یہ کہ ہمارا انتقال ہو گیا ہے اور ہماری روح کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کیا گیا اور میزان پر ہماری نیکی اور بدی کا موازنہ کیا گیا تو بدی کا پلہ کچھ بھاری تھا۔ یعنی گناہ زیادہ تھے۔ ہم یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے مگر ہمیں یہ اطلاع سنائی دی کہ ایک ہفتہ کی مدت دو۔ تاکہ اتنی ہی نیکیاں کمر لائے اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کے ایک ہفتہ کے بعد رحلت فرمائی۔

نواب صاحب مرحوم نے گومیلاور کلام پاک نہیں سنا مگر چوبیس پارہ تک نوافل میں سنا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جس روز اخیر پارہ پڑھنے کو تھا تو یہ حکم دیا کہ آج تہجد کے وقت سنیں گے۔

سخت سردی کا زمانہ تھا اور نواب صاحب ان کمروں میں مقیم تھے جو دیوانِ خلع کے قریب گرم حمام سے متصل ہیں۔ مجھے تین بجائے اٹھ گیا۔ وضو کیا اور نفل شروع کئے۔ سنا ہے کہ تھوڑی دیر میں مجھ سے تنہا تنہا نیند آئی کہ کھڑے کھڑے

ہی سو گیا۔ نواب صاحب مرحوم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر نیت توڑ کر آگے بڑھے تو امام صاحب آنکھیں بند کئے کھڑے سو رہے تھے۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میرا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر فرمایا کہ کہتے تیند آ رہی ہے جاسو جائے میں چھتاری میں رہتا تھا اور خوش قسمتی سے منشی وزیر خاں مرحوم ایک ایسے شفیق استاد مل گئے کہ جس کی مثال اس زمانہ میں تو ملنا مشکل ہے۔ وہ مجھے فارسی پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا کمال یہ تھا کہ لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔ مجھے انہوں نے فارسی پڑھائی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی سلسلہ کتب فارسی پڑھائیں اور فارسی کی دوسری کتابیں بھی۔ ان کی تعلیم کی خوبی یہ تھی کہ مجھے پانی فارسی پر ایسا اچھا عبور ہو گیا کہ جامی، نظامی، فردوسی کے کلام کو بلا وقت پڑھ لیتا اور معانی و مطالب سمجھ لیتا تھا۔

یہاں مجھے ایک فرمودہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا یاد آگیا۔ خاں صاحب امیر شاہ خاں مرحوم ایک صاحب تھے۔ ان کے بھوپا نواب ولی دار خاں کے ہاں ملازم تھے نواب ولی دار خاں بالآخر ضلع بلند شہر کے نواب تھے اور دہلی کے خاندان شاہی میں ان کی رشتہ داری تھی۔ جب غدر کے بعد دہلی "جزایار" بن گیا اور نواب ولی دار خاں کو بھی اپنی جان بچانے کے واسطے روپوش ہونا پڑا تو میرے دادا نے ان کے اعزاء اقربا کی مدد کی اور یہ بزرگ چھتاری آکر رہے۔ خاں صاحب امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا ارشاد ہے کہ طالب علمی لذت نیست اگر حاصل شود خواندہ نہ خواندہ برابر است اگر حاصل نہ شود خواندہ و ناخواندہ برابر۔ منشی وزیر خاں کی تعلیم میں لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔



کلام پاک کو پہلی ہی ختم ہو گیا تھا مگر میرے استاد حافظ  
حمید اللہ خاں مرحوم کا اسی زمانہ میں انتقال ہو گیا میری عمر اس  
وقت دس گیارہ سال کی ہوئی۔ مجھے اب تک شرمندگی کے  
ساتھ یہ یاد ہے کہ ان کے انتقال کی خبر سے مجھے کتنی مسرت  
ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ وہ مارتے بہت تھے ایک چڑے کا کسر  
گزبون گزلبان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور میں قرآن حفظ  
سناتا تھا وہ پشت کی طرف ٹہکتے رہتے اور جہاں منشاہ  
لگا اگر مہربانی ہوئی تو وہ ہونہہ کی آواز کان میں آئی اور  
میں نے سمجھ لیا کہ عبارت غلط ہے اور صحیح پڑھنا شروع  
کیا لیکن اگر ناخوشی ہوئی تو سڑاک سے چڑا کر پر پڑا اور  
میں بلبلا اٹھا۔ بہر حال یہ تو گزر گیا اب تو میں مرحوم کا شکر  
گزار ہوں کہ کلام پاک مجھے اب تک یاد ہے اور خدا کا شکر  
ہے کہ ۱۹۹۰ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک کوئی محراب ہاتھ  
نہیں ہوئی۔ گو مجھے قرآن پاک اتنا اچھا یاد نہیں جیسا ہونا  
چاہیے لیکن میں تو اس کو کلام پاک کا اعجاز خیال کرتا ہوں  
کہ اس نے اپنا ایک غلام کو بادیہ جو اس کی نااہلی کے  
نہیں چھوڑا۔

عربی اور انگریزی تعلیم کا آغاز:۔ اس دوران میں کچھ  
عربی اور انگریزی شروع کی گئی عربی تو اپنے ہی مدرسہ  
میں شروع کی اور میزان و منشعب کی گردانوں تک چلی  
پھر ختم ہو گئی۔ انگریزی کے اکثر استاد رکھے گئے جن میں  
مولوی انعام الحق مرحوم حکومت ہند کے پولیٹیکل سیف میں  
ڈپٹی سیکریٹری ہوئے اور خدا سلامت رکھے سلام الدین صاحب  
ریاست بھوپال میں وزیر عدالت ہیں لیکن میری تعلیم خیر کے  
ساتھ یونہی سی ہوئی پڑھنے کا شوق مجھے کبھی نہ تھا اور  
جو کوشش اس کی ہوتی تھی کہ استادوں کو بھی کھیل میں لگا دیا  
جائے اور اس کوشش میں اکثر میں کامیاب ہو جاتا تھا۔  
مولوی منشی وزیر خاں مرحوم کے کہ وہ پڑھانے پڑاتے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

عاقہ محمد احمد سعید خاں (اب چھتاری) جب مسلم یونیورسٹی کے  
پہلے وچانلر بنے

مقرر رہے کہ کچھ نہ کچھ فارسی زبردستی آگئی۔ لوگ اکثر کہتے  
ہیں کہ مکتب کی تعلیم جیسی کھوس ہوئی تھی اور لڑکے کے  
کردار پر جو اثر مکتبی تعلیم کا ہوتا ہے وہ اب اسکولوں کالجوں  
میں نہیں ہوتا لیکن جتنا وقت کہ مکتبی استادوں کو اپنے  
شاگردوں پر توجہ کرنے کا ملتا تھا اور جو تعلق قلبی انہیں  
اپنے شاگردوں سے ہوتا تھا وہ بھی تو اب مفقود ہو گیا ہے  
منشی وزیر خاں کو میرے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ اگر میں  
ذرا بھی بیمار ہوتا تو وہ بید پریشان ہو جاتے۔ انتہا یہ

بہارہ وڈ ایڈٹ اگست ۱۹۹۳ء

ہے کہ جب میری منسوبہ کے انتقال کے بعد میرے چھلنے  
اپنی دوسری بیٹی سے میری نسبت کرنی چاہی کہ جو عمر میں  
مجھ سے نو برس چھوٹی تھیں تو منشی جی نے اسے منکھیا  
کہ ہمارا لڑکا اتنا انتظار نہیں کر سکتا اور تجربہ ہوا کہ اسی  
وجہ سے ان کی علیحدگی عمل میں آئی۔

میرے ایک اہلیق ملا محبوب خاں تھے۔ بڑے  
بہمدرد اور نہایت سیدھے آدمی ہزاروں دعائیں انہیں  
از بر یاد تھیں۔ مثلاً دھوک کی دعا، نہانے کی دعا۔ حتیٰ کہ  
بیت الخلا جاتے وقت بھی دعا پڑھتے تھے۔ مجھے سب  
دعائیں یاد کرائیں مگر عملاً ہوتا یہ تھا کہ مثلاً میں غسل خانے  
گیا اور وہ دروازے پر کھڑے ہوئے باجہر اللہم انی  
اعوذ بک من الخبث والنجاست من الشیطان الرجیم  
پڑھ رہے ہیں۔

مجھے شکر کا بہت شوق تھا۔ گھوڑے پر بھی لد لیت  
تھا۔ میں کبھی گھوڑے کا اچھا سوار نہ بن سکا۔ بندوق بھی  
چلانے لگا تھا مگر یہ مشق کو تو براہِ غارتوں تک محدود تھی  
اڑتے اور بھاگتے جانوروں کو مارنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔  
علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخلہ ہوا آخر کھوٹ  
آف وارڈس بنے یہ طے کیا کہ مجھے علی گڑھ کالج کے اسکول  
میں داخل کر دیا جائے میرے چچا نواب بہادر مرحوم کو خصوصیت  
کے ساتھ اس کا صدر تھا لیکن میرے دوسرے چچا نواب  
یوسف علی خاں مرحوم اس کی موافقت میں تھے۔ نواب یوسف  
علی خاں مرحوم اپنے بھائیوں میں نہایت دور اندیش اور دین  
تھے انہیں اس کا احساس تھا کہ انگریزی تعلیم ضروری ہے۔  
چھتری کے اکثر لوگوں کو اس کا صدر ہوا مولوی ممتاز  
علی صاحب مرحوم و مغفور تو آبدیدہ ہو گئے یہ بڑے اچھے  
اور قابل طبیب تھے۔ ان کے صاحبزادے ہنوز ریاست  
میں طبیب ہیں۔ چھوٹے بڑوں میں عزت و محبت کی نظر سے

دیکھ جاتے ہیں۔ میرا شفاق علی مرحوم کو بھی بہت فحش ہوا  
اس زمانہ میں میری چھتری کی زندگی کچھ اچھی نہ تھی ہم وقت  
بلا جڑے بہری اور شاہین کے بلند اداں کی بازیات  
تیار کرنے میں صرف ہوتا اکثر بے کھادر لٹکے لڑکے محبت  
میں رہتے۔ تاشا اور چوسر سے بھی شوق تھا۔ بٹیر بازی میں  
بھی کافی دسترس ہو گئی تھی۔ دو تین مرغ بھی پلے ہوئے تھے  
اس واسے سب بظور یہ تھا کہ ہماری ہر حرکت پر تحسین و تفریح  
ہوتی تھی۔ اس فضا میں میل نہ رہتا ہی اچھا تھا۔ صرف اتنا  
غفیت تھا کہ مجھے شکر اور بھاگ دوڑ کا بہت شوق تھا ہوتا یا  
اس قدر تھا کہ عرضِ مرغ برابر چھلانے میرے لئے ایک گارے  
مخصوص کر دی تھی جس کا دروازہ شاگولتا تھا۔ میں جنوری  
میں لوہی علی گڑھ آیا۔ پرشین ولد زانی ایک بھونس کا بنگلا  
تھا وہاں قیام ہوا۔ کھانے کا انتظام بہادر اپنا تھا۔ مولوی  
فصیح الدین مرحوم بطور تالین ساتھ رہتے اور حافظہ علی صاحب  
مرحوم قرائت سیکھتے تھے۔ حافظہ جی تو کچھ روز بعد چھتری واپس  
ہو گئے اس لئے کہ قرآن سنانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن  
مولوی فصیح الدین عرصہ تک رہے۔ مولوی صاحب نہایت  
مہذب اور دین اور علم مجلس سے واقف تھے اور نہایت درجہ  
فحش نہیں تھے۔ اس کے بعد میکڈنل بورڈنگ ہاؤس میں  
چلا گیا۔ اس کے بعد انگلش ہاؤس میں داخل ہوا اور پولیس  
میں رہنے لگا۔ انگلش ہاؤس اس زمانہ میں سرسید مرحوم کی  
کوٹھی میں تھا کھانے پینے کا انتظام ہر جگہ میرا اپنا ہی رہتا تھا  
بورڈنگ کے مقررہ کھانے سے اکتا کر اکثر بے تکلف دوست  
میرے ہی یہاں آجاتے تھے اور ساتھ کھانے کا جو لطف  
مجھ اس وقت نصیب ہوا وہ مجھ میں ہمیشہ کے لئے راسخ  
ہو گیا اور میرا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے عہدہ مولے اکثر کھانے  
اور اٹھنے بیٹھنے سے طے پا جاتے ہیں۔

میرے زمانے کا علی گڑھ :- استادوں میں مال ذلہ



کے خاص رنگ عمامہ سبز لیں بیڈا ستر کے میر ولایت حسین  
 مسرور الحسن، مسٹر قیام الدین وغیرہ تھے۔ جب میں شروع  
 شروع طلبہ ہوا تو میرا لباس وہی پرانی روش کا تھا سٹا سٹا  
 ستارہ کی کاٹھن لڑی۔ لیکن پرانی کات کی (جیسا بادی  
 شرعانی سے مختلف) اس پر ریشمی یا نعل کا پاجامہ۔ ہالینچ میں  
 بن گئے ہوئے اس لباس پر نہایت موٹا جسم گویا فٹ بال  
 لڑھکتی جا رہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے دربار سے گولے کی  
 گڑیا، کا خطاب عطا ہوا۔ مجھ اس خطاب سے ناگواری غرض  
 ہوئی لیکن لڑکوں کی یہ بے ساختہ پھبتی اپنی جگہ ٹھیک تھی  
 کہیں ہو یا گولے کی گڑیا کی آواز سنائی دیتی۔ یہ حالت تین  
 چار ماہ رہی۔ پھر ہم بھی پرانے ہو گئے لباس کا طرز بھی بدل  
 گیا اور جو نئے لڑکے آئے انہیں پریشان کرنے میں ہم نے  
 خود حصہ لینا شروع کیا۔ میں انگلش ہاؤس میں ایک صبح بیٹھا  
 ہوا تھا۔ میرے اہلحق مولوی فصیح الدین پلنگ پر بیٹھے کلام  
 پاک پڑھ رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک دورہ ہوا۔ اسکے  
 بعد سے مرگی کے دورے ہونے لگے۔ اس نے مولوی عثمان  
 صاحب اسرائیلی ساکن علی گڑھ کو میرا اہلحق مقرر کیا گیا یہ بہت  
 نیک اور عالم شخص تھے مگر ان میں مولوی فصیح الدین صاحب  
 کی ذہانت نہ تھی۔  
 زمانہ طالب علمی کے ساتھی۔ اس زمانہ کے ساتھیوں  
 اور دوستوں میں چند کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔  
 میرا اس مسعودیہ جماعت میں تو مجھ سے ادنیٰ تھے  
 مگر انگلش ہاؤس میں ہی ان کا زمانہ مکان بھی تھا اسلئے اکثر  
 ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بالعموم سلیم پرچہ نہایت ہی موثر اور  
 یہ گاتے ہوئے پوٹیلین (جہاں میں رہتا تھا) کے پاس سے  
 گزرتے تھے۔

”مطرب خوش نوا بگو، تازہ بتازہ نو بنو،  
 بچپن میں تو کچھ غیر معمولی ذہانت کا پتہ نہ چلتا۔  
 علی گڑھ مسٹر غلام حسینی خیر

نوبہ حامی واصل خاں صاحب مرحوم (آداب چھاری کے والد محترم)  
 جنہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی  
 مگر جب بڑے ہوئے تو خوب ترقی کی۔ کے۔ ٹی (سر) ہوئے  
 اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی۔  
 میرے ہم جماعت اور بورڈنگ فیلو مسٹر سکندر حسرت  
 مرحوم بھی تھے۔ انہیں کھیلوں کا شوق بالکل نہ تھا اکثر کتابیں  
 پڑھا کرتے تھے۔ ذہین تھے اور انگریزی اچھی تھی مرحوم نے  
 بڑی ترقی کی اور دو بار پنجاب میں گورنری کا کام بھی کیا میرے  
 ان کے تعلقات میں عمر بھر کوئی کدورت نہیں آئی اور جس مذہب  
 مسیح حیدر آباد میں ان کے انتقال کی خبر سنی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ  
 گویا میرا بھائی ہو گیا۔ بے اختیار آنسو نکل آئے۔ مرزا غلام الدین  
 مرحوم بھی انگلش ہاؤس ہی میں رہتے تھے اور میرے ہم جماعت  
 تھے۔ بڑے شریف اور غلص انسان تھے۔



# سر اس سجاد اور سر عالم الدین

## میرے زمانہ کا تعلیمی کے ساتھی تھے

اس وقت قلب کی عجیب حالت ہے۔ بیسیوں درستیوں کی تصاویر سامنے آ رہی ہیں۔ کچھ تو ان میں سے ہمیشہ کے واسطے بچر گئے۔ کچھ ابھی شاید زندہ ہوں مثلاً مصطفیٰ خاں خوجوی، مسعود الحسن ڈپٹی کلکٹر، واجد حسین ڈپٹی کلکٹر، صاحب زادہ ساجد علی خاں مرحوم، عبدالرشید خاں مرحوم پٹیا، عبدالواحد پٹیا، مسعود انزماں باندہ، میر محمود علی میسور، محمد جان خاں داروں کے رئیس تھے۔ نہایت خدا ترس اور صاحب نسبت تھے۔ خدا اول الذکر حضرات کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جو زندہ ہیں انہیں خوش خرم اور با عزت رکھا جائے۔ میر کی تعلیمی حالت یہ میری حالت تعلیمی ہے نگرانی میں موہن پینتالیس اور پچاس سے زیادہ نمبر بھی نہ ملے حساب کے معاملہ میں بالکل صفر یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمت جتنی انہیں ریاضی سے نسبت تھی اتنی ہی میر سے یہاں اس کی نفی ہے۔ امتحان حساب کا کیونکر پاس ہوتا تھا۔ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ شاید میر سے پرائیویٹ ٹیوٹرز آسانی سے بتا سکتے۔ مجھے تو عرف اتنا یاد ہے کہ ایک بار جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو روزانہ کی مشق میں میں نے دیکھا کہ دو سوال ایسے ہیں کہ جو میر سے پرائیویٹ ٹیوٹرز سے چوستے تھے مجھے نکلنے کو دیتے ہیں۔ جب امتحان کا روز آیا تو دیکھا کہ پورے میں دونوں سوال دھرے ہوئے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کچھ یونہی سرسبز آتا تھا البتہ اردو اور فارسی میں مجھے کلاس میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اور بار بار فارسی اور اردو

کے گھنٹہ میں میں نے کلاس کو خود پڑھایا ہے۔ انہیں کلاس کے ساتھ امتحان میں واجد علی شیدا صاحب مرحوم مقرر تھے اور مجھے ۹ نمبر دیئے اور میری کاپی اپنے پاس دوسرے لڑکوں کو دکھانے کے واسطے رکھ لی۔ میں کلاس میں خست کبھی نہیں آیا اور ایک بار ریل پر دوش بھی ہوا یعنی ششماہی امتحان ہی میں چھٹی جماعت سے ساتویں میں ترقی مل گئی۔ اور سالانہ امتحان میں ساتویں بھی پاس کر لی۔ لیکن پہلے پانچ لڑکوں میں ہمیشہ آجاتا تھا۔

میری شرارتیں :- مجھے شرارت سوچتی تو تھی مگر عمل حصہ لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں نے کبھی کسی شریک شرارت دوست کی شکایت نہ کی نہ ان کے خلاف گواہی دی پہل چھوٹی چھوٹی شرارتیں خود بھی کرتا تھا۔ مثلاً کاغذ کی گولیاں بنا کر میں اور میرے دوست اپنی جیب میں رکھتے اور ایک تو دنیا تار کے مولی صاحب کے گھنٹہ میں اور ایک اور ماسٹر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے ان کے گھنٹہ میں برابر گولی باری ہوتی تھی۔ اگر استاد کا رخ میری طرف ہے تو دوسرے دوست نے گولی پلائی اور اگر رخ دوسری طرف ہے تو اس جانب سے نشانہ بازی ہوتی۔ ایک بار اس حسن خدمت کے صلہ میں پچاس لائن لکھنے کا جہان بھی ہوا۔ ایک یہ شرارت کثرت ہوتی تھی کہ کرسی کی پشت پر چاک سے الٹا "اتو" لکھ دیا اور جب ماسٹر صاحب نے کرسی کی "اتو" سیدھا ہو گیا۔ ایک بار میری کلاس کے چند لڑکوں نے کچھ چمکانہ بیٹیں ہوتی تھیں

جو یہ بٹھری کہ انہیں پڑھنا اس زبانی میں بند کر دیا جائے جس میں حاضری کارڈ بٹھرتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دوسرے پیریڈ میں جب ماسٹر صاحب استادی کی کرسی پر ٹھکن ہوئے اور حاضری لیفٹ کے لئے رجسٹر نکالنا چاہا تو ایک چمکار ڈرڑپ کران کی گود میں جا بیٹھی۔ ماسٹر صاحب کے چہرے کے تغیرات جن میں ڈر، غصہ اور حیرت سب بیک وقت کارفرما تھے میری نظروں میں اب تک محفوظ ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی بچپن کی شرارتوں میں قابل ذکر ہے۔ ہمارے یہاں ایک رائڈنگ اسکول ماسٹر تھے ان کے ایک صاحبزادے مصطفیٰ نامی میرے کلاس فیلو تھے ایک روز انہیں سوچی کہ پٹخ کے واسطے وقفہ ہوا تو چاقو لے کر کے پید کو جس پر بیٹھا جاتا تھا کچھ اس طرح کاٹا کہ بظاہر توجہ نہ رہا مگر قریب قریب کٹ چکا تھا۔ ان کی اس جدت طرازی کا علم پٹخ سے آئے ہی ہمیں بھی ہو گیا۔ دو ایک اور بچوں کو بھی پتہ چل گیا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ ان کی عادت تھی کہ کتاب ڈیسک پر پٹخ کر زور سے کرسی پر بیٹھتے تھے۔ کرسی کا پید تو پہلے ہی مجروح تھا۔ جوں ہی ماسٹر صاحب بیٹھے گلدستہ بن گئے۔ ہاتھ اور ٹانگیں باہر اور ماسٹر صاحب کرسی کے اندر۔ اُدھر ماسٹر صاحب کا ادھر میرا چہرہ سوخ ہو گیا صرف فرق یہ تھا کہ میرا ہنسی کے مارے اور ان کا غصہ ہے۔

سینئر ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی۔ ماسٹر ریس بہت ہی اچھے سینئر ماسٹر تھے۔ انہوں نے فوراً تحقیقات کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ پکڑے گئے اور ریس صاحب نے جسمانی سزا دی۔ زمانہ طالب علمی کے چند دلچسپ واقعات میرے ہی زمانہ میں پرنس آف دینز کی حیثیت سے شہنشاہ بارج پنجم تشریف لائے۔ مجھے وہ نظارے اب تک یاد ہے وہ انگلش اوس آئے سب کے انتظار میں کھڑے تھے کہ یکایک مجھے پکڑا یا اور حوض سے گرا۔ غیر یہ ہوئی کہ پرنس اس وقت تک نہ آئے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



اصلی نواب محمد علی خاں صاحب مرحوم (نواب چھتاری کے دادا)  
جو انگریزی تعلیم کے مخالف تھے

تھے۔ خدا جانے یہ کیوں ہوا۔ مگر تعویذی ہی دیر میں بالکل تندرست ہو گیا اور جب پرنس آئے تو ان کے خیر مقدم میں شریک ہوا۔ اسی موقع پر شہزادہ کی تفریح کے واسطے بالٹھہر کی فیلڈ میں کچھ کھیل کئے گئے تھے وہاں میں بھی موجود تھا اور سر جیمس لائوش لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ میرے چچا نے مجھے لے جا کران کے صحنے پیش کیا ان کی شکل اس وقت تک مجھے یاد ہے بڑے نیک اور رحمدل انسان معلوم ہوتے تھے۔ ہزاروں نس آغا خاں بھی اسی زمانہ میں تشریف فرما ہوئے یہ اس وقت بالکل لا عمر تھے۔ شاید تیسری بتیس کی عمر ہوگی۔ بہت خوب

## دانی، بی، چوہان

پنج پج یہ تاریخ کا یادگار مظاہرہ ہے کہ جہاں آزادی کے وقت ہمارے مسلمان بھائیوں نے ہم سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا وہیں مسلمانوں کی ذہنی قبلہ گاہ مسلسل ہمارا ساتھ دے رہی ہے، اس قبلہ گاہ کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو اسلام کے بہترین جوہروں کو سامنے لانے دیجئے تاکہ فراخ دلی کے ساتھ ہماری مشترکہ جمہوری تہذیب کو ان سے سنوارا جاسکے، وہ جمہوری تہذیب جس کے ثمرات سے آج ہم متمتع ہو رہے ہیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں جن سے قائمہ اٹھائیں گی۔ (۲۳ دسمبر ۱۹۷۹ء کان دیکھیں)

## یو ایس ڈو ہیو

علیگڑھ آنے سے پہلے مجھے یہاں سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں لیکن یہاں آکر وہ سب ختم ہو گئیں، ہندو مسلم اتحاد قومی ترقی کے لئے سب سے بڑا ہتھیار ہے جو علیگڑھ بڑے حسن و خوبی سے بنا رہا ہے۔

صورت جبران تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو بڑی دلکش اور جاذب تھی۔ میں نے اسے بہت محسوس کیا، اسی موقع پر مولانا ندیر احمد دہلوی مرحوم نے ہزرائی نس کو مخاطب کر کے بر محل یہ شعر پڑھا تھا جسکو سب نے بے حد پسند کیا اور ہزرائی نس بھی بہت مسرور ہو گئے اور برسوں زباں زرد عام رہا۔

آغا قباگر دیرہ ۱۵ مہر تال اور زیدہ ۱۵  
بسیار خوباں دیرہ ۱۵، لیکن توجہ دے دیکھیں  
کالج میں شاہ افغانستان کی آمد اور میرا دنیا میں امتحان  
شاہ کابل امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اسی زمانہ میں

آئے۔ ان کی آمد کی بڑی مرحوم دھام رہی۔ مجھے کل کی سی بات یاد ہے کہ نواب محسن الملک بہادر آئے اور مجھ اور چند اور لڑکوں کو جنہیں مذہبی ذوق تھا پکڑ کر آسمان منزل میں لے گئے معلوم یہ ہوا کہ امیر صاحب چند لڑکوں سے مل کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انہیں اسلامی عقائد اور مسائل پر کیسا عبور ہے۔ علی الدین صاحب نے جواب بھی ڈپٹی کلکٹر سے دیتا کر ہوئے ہیں قرآن شریف پڑھ کر سنایا۔ اور خوب پڑھا۔ امیر صاحب مرحوم بہت ہی متاثر معلوم ہوئے پھر مسائل شرعیہ کے متعلق مستفسا ہوا تو قرعہ فال ہمارے نام نکلا اور بچپن کی ملا بد مذہب کی پڑھائی کام آئی۔ انہوں نے دو سوال کئے جن میں سے فقط ایک ہمارے گیا ہے۔ لیکن اتفاق سے دونوں کے جواب بالکل صحیح رہے۔ جو سوال یاد ہے وہ یہ تھا کہ اگر کوئی بے وض ہو گیا غسل کی ضرورت ہو اور وہ بلا ارادہ دریائیل گر جائے یا بغیر نیت پاکی غسل یاد ہو کرے تو اس کا غسل یاد ہو یا نہیں جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا کہ بلانیت کے بھی غسل اور وضو ہو جائے گا تو امیر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اگر ایسے ہی بلانیت تیمم کرے تو کیا وہ پاک ہو جائیگا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس واسطے کہ تیمم میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر صاحب نے فرمایا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ یہاں منشی وزیر خاں کی مکتبی پڑھائی کام آئی اور میں نے جواب دیا کہ پانی طاهر بھی ہے اور مطہر بھی لیکن خاک فقط طاهر ہے مطہر نہیں اسے حکماً ضرور یا مطہر بنا دیا ہے اور اسی واسطے بلانیت کے وہ پاک نہیں کر سکتی۔ امیر صاحب بہت خوش ہوئے اور باہر نکلنے کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے مجھے بہت دلدادی اور کہا کہ تم نے ہماری لالچ رکھ لی۔

میں انہیں جماعت میں تھا کہ سلسلہ تعلیم ختم ہو گیا۔ مجھے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ چھتاری میں رہنا ہو گا۔ وہ زمانہ بھی کیا تھا جبہ سوجنا بھی ایک تفریح تھی۔





علی گڑھ

کی

سکراشی

شاہین ملک۔ ایم اے (علیگ)

جنہوں نے صرف سرسید کے خلاف علماء دین سے فتویٰ لانے کے لئے صفرج کا قصد فرمایا۔ جب وہ فتویٰ سیکرٹریس آئے تو سرسید نے ان کے بارے میں تحریر کیا: "مولوی علی بخش ہمارے کفر کا فتویٰ لینے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے سچا پنچہ ملے کفر کی بدولت ان کو حج نصیب ہوا۔ سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو ہاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے۔"

ہمارے ڈائجسٹ نمبر ۲۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ماحول ایک ایسا ادبی

ماحول ہے جس میں رہ کر خود بخود جس مزاج پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں علماء بات میں بات پیدا کرنا خوب جانتے ہیں۔ اکثر شاعرے لطافت کو جنم دیتے ہیں۔ ادبی مجلسیں دھیمی دھیمی کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ قہقروں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ وہ انسان جس کا ذہن اس بھی تعلق مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے اپنی اس جس کی بنا پر فوجاً پہچان لیا جاتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار ہم لوگ چٹھروں میں گھر جا رہے تھے ہمارے کپارٹمنٹ میں یونیورسٹی کے ایک استاد بھی اپنی بیگم کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے وہ لوگ کپارٹمنٹ سے گزرے اور کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ ایک اسٹیشن پر دوڑ کے ہمارے کپارٹمنٹ کے پاس آئے اور استاد دو بیگم کو دیکھ کر ایک بولا "کیا یہ ڈبہ ہاتھیوں کے بچوں کیلئے مخصوص ہے؟" استاد محترم نے ایک دم جواب دیا "جی نہیں کتے قلعے بھی آسکتے ہیں۔ تشریف لائیے" سارا کپارٹمنٹ قہقروں سے گونج اٹھا اور دونوں لڑکے! فوراً قاتب۔

اگر مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسے بہت سے بیٹھے نظر سے گزریں گے جن کو پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ ہونے پر قہقروں سے بھر جائے گی۔ سرسید احمد خان بخیرہ ماحول کو اپنی لطف باتوں سے لالہ لار بنا دیا کرتے تھے اور یہی حال ان کے رفقاء کا بھی تھا۔

جب سرسید نے اپنی تعلیمی و اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر نکھی توان کے خلاف ایک عظیم طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں کافر، ملعون، پتھر پھینک دینے والے کے خطاب دیئے گئے۔ ان کے معاونوں کا بھی برا حال کیا گیا۔ مولانا مائی کے مقابلے میں خالی اور ڈھالی جیسے حریف سامنے آئے علماء کرام نے ان کے خلاف فتوے دینے شروع کر دیئے۔ انہیں میں ایک بزرگ مولوی علی بخش بھی تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

شخص نماز میں بجاے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لے تو کوئی حرج یا نقصان تو نہیں ہے مرسید نے جواب میں لکھا کہ ہرگز کوئی حرج یا نقصان نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی۔

ایک شخص نے مرسید کو خط میں لکھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ تعریف کر رہے ہیں کہ ان کی ساری عرقوم کی خیر خواہی میں گزری۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہی ہیں۔ پس میری مشکل اگر حل ہوگی تو آپ ہی سے ہوگی۔ مرسید نے جواب میں لکھا: جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جس آدمی کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ شیطان ہوگا۔

مرسید کے ساتھی مولانا حالی ایک مرتبہ مہارون پور تشریف لے گئے وہاں ایک زمیندار کے یہاں ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے حالی کمرے میں بیٹھے تھے۔ زمیندار صاحب نے ایک کسان کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو پنکھا چھلے۔ وہ پنکھا جھلنے لگا کچھ دیر کے بعد اس نے سوال کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ میزبان نے کہا کہ کم بخت تو ان کو نہیں جانتا سارے ہندوستان میں مشہور ہیں یہ مولوی حالی ہیں۔ اس پر غریب کسان حیرت سے بولا: ہاں بھی مولوی ہو سکے ہے؟ (وہ حالی کو ہالی یعنی ہل چلانے والا سمجھا)

مولانا یلٹے تھے سوئے نہ تھے کسان کا جلد سن کر پھر رک گئے اور فرمایا: حضرت! اس شخص کی داد آج ملی ہے۔

مولانا حالی کے دوستوں میں مولوی وحید الدین سکیم (لٹری میعادون مرسید) تھے۔ ایک روز وہ مولانا حالی کے

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی



کرنل بشیر حسین زیدی جو عمر اکتوبر ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک مسلم یونیورسٹی علیگڑہ کے وائس چانسلر رہے

ایک بار مرسید، مولانا شبلی اور مرسید ممتاز علی ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ مرسید کا ایک مزدوری کاغذ کھو گیا۔ وہ اسے تلاش کر رہے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ اتفاقاً شبلی کو وہ کاغذ الگ پڑا ہوا مل گیا انہوں نے یونہی مرسید کو ذرا پریشان کرنے کے لئے کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کہ مرسید کی نظر اس پر نہ پڑے مگر مرسید بھانپ گئے کہ وہ کاغذ شبلی دبائے بیٹھے ہیں۔ مسکرا کر بولے: بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت مولانا! ذرا دیکھئے کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں ہے؟

ایک مرتبہ ایک شخص نے مرسید کو خط لکھا کہ اگر کوئی

۱۳۰ ہمارا دور دست اگست ۲۰۰۶ء

پاس بیٹھتے۔ مولانا نے نئی غزل سنائی تو سلیم پھر کھٹکے اٹھے۔  
 بچے "مولانا! واللہ جادو ہے۔ مولانا کے بالا خانے کے بچے ایک  
 گھڑی تھی وہ ایک مجذوب فقیر کو دے رکھی تھی۔ وہ باہر بیٹھا  
 دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بلافتہ  
 چلا اٹھا "جادو برحق کہنے والا کافر" مولانا نے مسکرا کر کہا "بچے  
 مولوی صاحب سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔"

مولانا حاتی اور مولوی سلیم باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص  
 آیا اللہ مولانا سے پوچھنے لگا کہ حضرت میں نے قصہ میں آکر اپنی  
 بیوی کو طلاق دیدی اب اپنے کئے پر افسوس ہے پیری پیری بھی  
 راضی ہے مگر مولوی صاحب کہنے لگے کہ اب تو طلاق ہو گئی، اب  
 بتائیے کیا کروں۔

ابھی مولانا کچھ کہنے ہی ولے تھے کہ مولوی سلیم بول  
 اٹھے "تم نے "ط" سے طلاق دی تھی یا "ت" سے۔"  
 اس شخص نے کہا "میں تو جاہل ہوں میں کیا جانوں "ط"  
 سے طلاق کیسی ہوتی ہے اور "ت" سے کیسی۔"  
 سلیم نے سمجھایا "یہ تو بتاؤ تم نے کچھ کر قرأت سے طلاق  
 کہا تھا جس میں ط کی پوری آواز نکلتی ہے یا پھر سیدھے سادے  
 طریقے سے کہا تھا جس میں "ط" کی نہیں "ت" کی آواز نکلتی ہے۔"  
 اس نے کہا "مولوی صاحب میں نے معمولی طریقے سے  
 کہا تھا، قرأت سے نہیں۔"

یہ سن کر مولوی سلیم نے اطمینان کا سانس لیکر کہا "ہاں بس  
 معلوم ہو گیا کہ تم نے "ت" سے طلاق دی تھی جس کے معنی ہیں آ  
 محبت کے ساتھ مل بیٹھ "تم بے فکر ہو کر بیوی کو گھر لے آؤ۔ اگر  
 کوئی کچھ کہے تو صاف کہہ دیجو میں نے "ت" سے طلاق دی تھی  
 "ط" سے ہرگز نہیں۔"

مرسید کے رفیق خان بہادر مولانا ذکا راند وقت کے

بہت پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روز دن کے ٹھیک نو بجے  
 اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو گھر سے باہر  
 نکلے تو مرسید کے لڑکے سید محمود ہاتھ میں گھڑی لئے اپنے گھر کے  
 سامنے ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مولانا نے پوچھا "میاں  
 یہاں کیوں کھڑے ہو؟" سید محمود نے جواب دیا: "جی میں اپنی  
 گھڑی کو لوگ دینی بھول گیا تھا اس لئے بند ہو گئی۔ اب آپ  
 کے انتظار میں کھڑا تھا کہ گھڑی کا وقت درست کریں۔"

مسلم یونیورسٹی کے طلباء بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم

بنالہین حبیب جی جمہ، نومبر ۱۹۶۲ء سے ۲۸ فروری  
 ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے





بھائی یہ مونچھیں کیوں رکھ لی ہیں؟ ڈاکٹر رہی نے مسکاکر کہا  
"تاکہ اگر مقدمہ ہار جاؤں تو ان کو مستادہاں اور اگر جیت جاؤں  
تو ان پر تادیبوں۔"

ایک بار مسلم یونیورسٹی کے تین طلباء ٹرین سے کہیں  
جارہے تھے۔ ایک لڑکا اوپر سامان والی برتن پر بیٹھا تھا اور  
دو نیچے بیٹھے تھے۔ ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوا اور ان سے ٹکٹ  
مانگے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے ٹکٹ نکال کر چیکر کو دیدیا  
چیکر نے کہا: "یہ تو نصف ٹکٹ ہے۔" ہم بھی تو نصف ہی ہیں  
لڑکے نے مسکاکر کہا۔ چیکر نے کہا: "کیا مطلب؟" لڑکے نے  
سمجھاتے ہوئے کہا: "دیکھئے ایک اوپر ہے اور دو نیچے یعنی ایک  
ٹکٹ دو ہوئے۔ اسی لئے ٹکٹ بھی ایک۔ ٹکٹ دو یعنی نصف ہے۔"  
اور ٹکٹ چیکر کیا ٹھنٹ میں کو بچنے والے قہقہوں میں ڈوب  
کر رہ گیا۔

ایک ٹرین میں چند طلباء چھٹیوں میں گھر جا رہے تھے  
ٹکٹ چیکر کیا ٹھنٹ میں گھسا اور ان سے ٹکٹ مانگے۔ ٹکٹ  
چاہئے؟" طلباء کے لیڈر نے سخت ہجہ میں کہا: "ابھی دیتے  
ہیں آپ کو؟" اس نے طلباء کو اشارہ کیا وہ سب اپنے جوتوں  
کے بند کھولنے لگے۔ یہ دیکھ کر ٹکٹ چیکر بہت ہنسیا۔ اور گہرا  
کھڑکی کی طرف بھاگا۔ ایک لڑکے نے اسے پکڑ لیا: "ٹھہریئے  
ٹکٹ تو دیکھتے جاتیئے؟ چیکر کا پنے لگا۔ اتنی دیر میں طلباء نے  
اپنے جوتے اتار لئے تھے۔ چیکر کا خوف دیکھ کر سب نے قہقہہ  
لگایا۔ ان کا لیڈر بولا: "قبلہ گھبرائیے نہیں آپ پہلے بزرگ  
ہیں اور ہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء ہیں۔" اہ طلباء کے  
جوتوں میں سے ٹکٹ نکل کر چیکر کے ہاتھ میں آگئے۔ یہ دیکھ کر  
چیکر گھپنی گھپنی ہنسی کے ساتھ ٹکٹ چیکر کرنے لگا اور سر  
سافر کسی طرح اپنے قہقہے نہ روک سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شہر



نواب علی یادر جنگ جو عجم مارچ ۱۹۶۵ء سے  
۵ جنوری ۱۹۶۸ء تک مسلم یونیورسٹی کے  
وائس چانسلر رہے ہیں

پرچلے اور سیکڑوں لطیفوں کو جنم دیا۔ مجاز یونیورسٹی کی شمشادہ لکھٹ  
میں ٹہل رہے تھے۔ قریب سے ایک کشتا گڑھا جھلانے رکشا کو لیا  
اور رکشے والے سے پوچھا: "ایشن جاؤ گے؟" رکشا والے نے  
جواب دیا: "ہاں میاں جاؤں گا۔" تو جھارے جھلانے کہا اور  
لگے بڑھ گئے۔

ڈاکٹر مای معصوم رضا کا چہرہ ملاہی مونچھوں سے ملا  
ہے۔ جب وہ علی گڑھ میں تھے تو ایک بار انہوں نے یونیورسٹی  
مونچھیں دکھائیں ان دنوں ان پر کوئی مقدمہ چل رہا تھا۔ ایک بار  
شمشادہ لکھٹ میں کسی دوکان سے کچھ سامان خرید رہے تھے۔  
ایک ہتھکڑی مل گئی، مونچھوں کی طرح اشارہ کر کے کہا: "اے

۱۱۳۲ ہجری ۱۴۰۲

# مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین

(جادید جیب)

جس طرح مسلم یونیورسٹی ملک کے دیگر تعلیمی اداروں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہے اسی طرح مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کو بھی ملک کے دیگر تعلیمی اداروں کی — اسٹوڈینٹس یونینوں کے مقابلے میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی آرزو تھی کہ ملک کی دیگر اسٹوڈینٹس یونینیں بھی مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی طرح ہو جائیں اور اس طرح ہماری یونین کو ”دریونین“ کا درجہ حاصل ہے۔

یہ یونین سڈنس ڈبلیگ یونین کلب کے نام سے قائم ہوئی۔ بانی درس گاہ سرسید نے اس کے قیام کی وقت کہا تھا کہ ”خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب بنائیں گے، جس کا نام انشا اللہ تعالیٰ مثل کیمبرج کی کلب کے یونین کلب کہلائے گا۔ علمی باتوں اور دنیاوی علوم میں مباحثہ ہوا کریگا اور قواعد و اسپیج بعینہ وہی ہوں گے جو کیمبرج یونین کلب کے ہیں“ یونین کلب قائم ہوا اور بعینہ انہیں خطوط پر قائم ہوا۔ لائق و فاضل اساتذہ کی سرپرستی اور طلباء کے ذوق و انہماک نے اس کلب کو درس گاہ کے کلب کی حیثیت بخش دی اور خود سرسید نے اس کلب کی ممبری کے لیے کالج میں داخلہ لینے کی شرط پوری کر تیکی خواہش کی۔

ملک و مسلم یونیورسٹی نمبر

یونین کی عمارت کا ایک گوشہ

اس کلب کے ذریعے نہ صرف یہ کہ طلباء میں تحریر و تقریر کی صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں بلکہ اس کی رنگارنگ ادبی اور علمی سرگرمیوں کی بدولت آزادانہ تحقیق، فراخ حوصلگی اور غیر متعصبانہ علمی شغف نیز قوم و ملک کی تعمیر و خدمت کی اسپرٹ پیدا ہو گئی۔ اور یہ کلب طلباء کی علمی، ثقافتی اور ذہنی تربیت کا محور و مرکز بن گیا اور اس کلب کے زیر سایہ خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، راجہ مہندر پرتاپ سید محمود، ڈاکٹر حسین، رشید احمد صدیقی، غلام السیدین جی، عظیم شخصیتوں نے جنم لیا اور اس عظیم تربیت گاہ میں اپنی صلاحیتیں کو اُجاگر کیا۔

یونیورسٹی بننے کے بعد بھی یہ یونین اپنے ماضی کی روایات پر گامزن رہی اور اسی یونین کے پلیٹ فارم سے خلافت تحریک، تحریک عدم تعاون، اور تحریک آزادی ہند کی لہریں اٹھیں اور پورے ملک پر چھا گئیں، اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ ملک کا ہر بڑا لیڈر اور قومی رہنما اس یونین کا ہمان بننے کا مشتاق رہتا۔

ملک اور بیرون ملک کے سیاسی رہنما، مذہبی عالم، اصحاب علم و ادب اس یونین کے مہمان بنے اور طلباء سے مخاطب ہوئے اور طلباء کی بے نظیر علمی، ادبی اور ثقافتی

اردو فائنل ہما اگست ۱۳۳۳ء



یونین کا ایکشن جیتنے کے بعد یونین کے عہدیداران قیصر محمود اور عارف محمد خاں اپنے ورکرز کے ساتھ

سرگرمیوں اور خوبی تحریر و تقریر اور ان کی شستہ و شائستہ روایات اور روشن اقدار کا کبھی نہ بھلانے والا اثر لیکر گئے۔ ایم، اے۔ او کالج اور یونیورسٹی کے بہت سے محافل جب یونین کے جلسوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے طلباء کی سرگرمیاں دیکھیں تو اپنی رائے تبدیل کی ان میں گو کھیلے اور یو، این، اے، ڈی جیسے لوگ شامل ہیں اور موجود زمانے میں مشہور صحافی نرادی چودھری کے تاثرات جو کہ ان کے علی گڑھ آنے سے پہلے کے تاثرات سے قطعاً مختلف تھے اسکی چھوٹی سی مثال ہے۔

یونین ہال میں جب مہمان تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو ہال کی چھت پر سے ایک مخصوص ڈھنگ سے پھولوں کی بارش کی جاتی ہے اور طلباء اس موقع پر پُر زور تالیاں

۱۲۴ اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۲ء

بجاتے ہیں اسی کے ساتھ طلباء کی جہاں لٹاری، لطافت، طرز گفتگو، شائستگی اور وقار مل کر میراں پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے گن گانے لگتا ہے اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کے طلباء کو پھول کی بستی سے پہرے کا جگر کاٹنا نہ ملے گا!

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی ہر چہتی سرگرمیوں طلباء کے مسائل سے دلچسپی اور علمی، ادبی، ثقافتی سرگرمیوں کی بدولت آج بھی اسٹوڈینٹس یونین یونیورسٹی کے دل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یونین کی سرگرمیوں کو ہم درج ذیل حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ طلباء کے تعلیمی، اقامتی اور اخلاقی مسائل۔

ملیکزہ مسلم یونیورسٹی نمبر





کنیڈی ہال میں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی انشالیشن سیری منی (INSTALLATION CEREMANY) دینے  
بائیں وائس چانسلر ڈاکٹر عظیم خطاب کرتے ہوئے۔ منتخبہ صدر سید قیس محمود۔ نائب صدر افتخار حسین خاں، محترمہ اعجازی عارف محمد خاں

مسئلہ حل نہ ہو تو علامتی اسٹراٹجک اور پھر بھی مسئلہ حل نہ ہو  
تو علامتی ہنگامی اسٹراٹجک کا جو کہ تمام طلباء کرتے ہیں سہارا  
لیا جا رہا ہے اور ۹۹ فی صدی مسئلوں کا یہاں تک پہنچتے پہنچتے  
حل نکل آتا ہے۔ اسٹراٹجک یا مظاہرے کی خامس بات یہ  
ہے کہ یہ پُر امن، پُر وقار اور پوری طرح منظم ہوتے ہیں۔  
اسی وجہ ہے کہ ان کے ذریعے تو یونیورسٹی کی اہلک کو کبھی  
نقصان پہنچا اور نہ کبھی اساتذہ کی بے حرمتی کے دائرے  
میں یہ احتجاج یا مظاہرے داخل ہوئے۔

۲۔ تحریری اور تقریری سرگرمیوں کے لیے یونین کے  
ذریعے مضمون نویسی اور تقریری مقابلے ہوتے ہیں، ایک  
اسپیئرڈ سٹرز کلب اور ایک اسکول آف پبلک اسپیکنگ  
اینڈ پارلی منٹری پریکٹس یونین کے زیر اہتمام چلتا ہے۔

۲۔ تحریری و تقریری سرگرمیاں۔

۳۔ علمی و ادبی سرگرمیاں۔

۴۔ دوسرے تعلیمی اداروں سے روابط۔

۵۔ ثقافتی سرگرمیاں اور انڈرٹیمس۔

۶۔ تعلیمی وظائف اور اسکول۔

۷۔ استقبال۔

۸۔ الیکشن۔

۱۔ پہلے زمرے میں اقامتی زندگی میں روزمرہ پیش آمدہ  
مسائل، نیز اقامت گاہوں اور شعبوں میں پیدا شدہ  
بد نظمیوں سے شکایات اور اسی قسم کے دیگر مسائل آتے ہیں  
ان کے حل کے لیے پید گنگو، ملاقاتوں اور تجویزوں نیز راہی  
میل جول کے ذریعے کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے

راجہ  
مہندر پرتاپ  
یونین آف  
میں



اسی کے ساتھ اردو اور انگریزی تحریری اور تقریری مقابلوں کے لیے گولڈ میڈل بھی دیے جاتے ہیں۔ گولڈ میڈل حاصل کرنے کے لیے مخصوص تحریری اور تقریری مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔

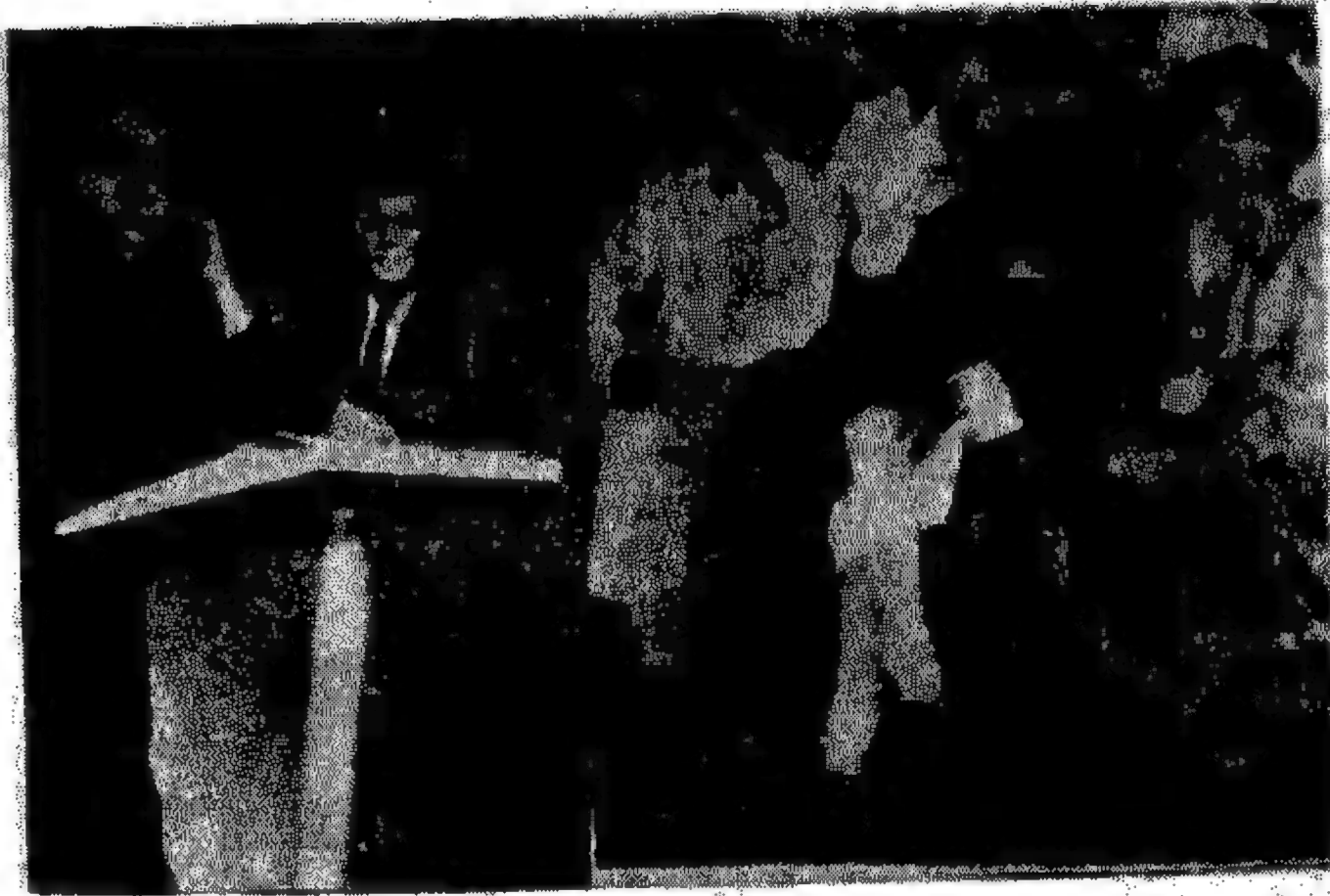
۳۔ علمی ادبی سرگرمیوں میں سیمپوزیم، سیمینار اور جلسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے نیز عظیم شخصیتوں کے خصوصی یوم منائے جاتے ہیں۔ سیمینار اور سیمپوزیم کل سہ ماہی کے پر بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونین کا ترجمان علی گڑھ اردو اور انگریزی زبان میں شایع کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یونین کی اپنی ذاتی لائبریری اور ریڈنگ روم بھی ہے۔

۴۔ دوسرے تعلیمی اداروں سے روابط کے لیے مختلف جگہوں پر سیمیناروں، جلسوں اور کانفرنسوں میں طلباء کے وفد بھیجے اور بلائے جاتے ہیں۔

۵۔ اس سلسلے میں ششہ و شائستہ ڈرامے —  
موک کانوکیشن بہت سلیقے بہت پر کیف اور دلچسپ انداز میں اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ نیز یونین کے کامن روم میں







کینیڈی ہال  
میں  
تقریری  
مقابلہ

انڈور گیس بلیر ڈیٹیل ٹینس وغیرہ کا انتظام ہے۔  
۶۔ یونین کی جانب سے مستحق طلباء کی رفیع ریلیف  
فنڈ کے ذریعے مالی مدد کی جاتی ہے۔ ہماری یونین ایک  
امتیازی اور تعمیری کام انجام دے رہی ہے وہ یہ کہ  
اس کے زیر اہتمام ایک پرائمری اسکول جس میں یونیورسٹی  
کے ملازمین کے بچے تقریباً مفت تعلیم پاتے ہیں بحسن و خوبی  
چلایا جا رہا ہے۔ غالباً اس کی مثال ملک کی اور کوئی یونین  
پیش نہیں کر سکتی۔

۷۔ یونین کا ایک بہت ہی اہم کام یہ ہے کہ ملک اور  
بیرون ملک کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کرے اور ان کو  
استقبالیہ پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ پون صدی  
میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شخصیت ایسی ہو جو یہاں نہ  
آئی ہو۔

۸۔ ان سب کاموں کے علاوہ یونین کے ذریعے قرأت  
کے مقابلے، جنرل ناچ کے مقابلے اور اسی قسم کے دوسرے  
مشاغل شامل ہیں۔ یونین نے سوشل سروس کے کاموں،  
قومی دفاعی فنڈ اور فسادات کے لیے ضرورت پڑنے پر





بہاؤں کا استقبال اور بارہی شروع

ہو جاتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے اور لوگ اس پر آوازے کسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب جن صاحب نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہوتا ہے وہ زبان سے زیادہ سلام شروع کر دیں گے اور ان کے سلام میں بڑی عاجزی پیدا ہو جائے گی اور وہ مصافحہ کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیں گے۔ یہ ابتدائی مرحلہ فیلڈ بنانے سے تعمیر کیا جاسکتا ہے بعض لوگ ایک سال پیشتر ہی فیلڈ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

اب دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے کہ الیکشن لڑنے والے پُرانی کاہنہ پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ جلد از جلد الیکشن کرائے اور پُرانی کاہنہ اس فکر میں رہتی ہے کہ کسی پہلے

ہمیشہ اپنی حدود میں رہ کر کوششیں کی ہیں اور فیلڈ اکٹھے کیے ہیں۔ الیکشن۔ اگلے الیکشن کا ذکر نہ کیا جائے تو یونین کا ذکر ادھورا اور خشک رہ جائے گا۔ یونین کا الیکشن بھی اپنا مخصوص طرز اور مثالی روایتیں رکھتا ہے۔ آئیے ہم اس کا جائزہ لیں۔

یونیورسٹی کا نیا سال شروع ہوتے ہی الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں جن طلباء کو الیکشن لڑنا ہوتا ہے وہ اجانک سرگرم ہو جاتے ہیں۔ طلباء سے تعلقات بڑھانے لگتے ہیں، عام مسائل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ غیر معمولی طور پر شیردانی اور ٹوپی میں لباس

الیکشن مٹنے رہیں غرض ایک دن الیکشن ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے پس اسی روز سے ہماہمی شروع ہو جاتی ہے۔ امیدواروں کو سپیڈ میں اور وکرس کی تلاش ہوتی ہے مخلص وکر کم اور نمائندے کی جیب کے وزن کو دیکھ کر زیادہ وکرس مل جاتے ہیں، چائے اور ہوٹل بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس کو علی گڑھ کی محسوس زبان میں "کٹنا" کہا جاتا ہے۔ ہما امیدوار جتنا زیادہ بے وقوف ہوگا اتنا ہی "کٹے گا" یہ پرانا اصول ہے۔ اور پرانے امیدوار اپنے سپورٹرز سے چمدہ کی اپیل کر کے خود انہیں کو "کٹنا" شروع کر دیتے ہیں۔

نامزدگی کے فارم بھرنے کے بعد باقاعدہ کنوینٹنٹ شروع ہو جاتی ہے ہر امیدوار کے ساتھ دو ایک پرمانے الیکشن باز چیت سپورٹرز کی چیت سے اور چند وکرز ہوتے ہیں۔ صدارت، نائب صدارت اور سکریٹری شپ کے امیدواروں کے باقاعدہ کمپ قائم ہو جاتے ہیں۔ روایت یہی رہی ہے کہ عام طور پر کمپ سرسید ہال میں بنایا جاتا ہے کسی کسی امیدوار مناسب کردہ محلے پر دوسرے

ہال میں کمپ بناتے ہیں۔ نامزدگی کے فارم کی جانچ کی میٹنگ ہو جانے کے بعد امیدواروں کی طرف سے باقاعدہ انتخاب لڑنے کا اعلان ہوتا ہے یہ اعلان ایک تقریب میں کیا جاتا ہے جس میں عام طور پر چائے اور نمک پارے پیش کیے جاتے ہیں اور یونیورسٹی کے تمام سینئر اور نمایاں طلباء کو اس میں مدعو کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر امیدوار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے بعض سپورٹرز امیدوار کی توصیف و تعریف نیز اس کے الیکشن لڑنے کے ہم گیر فوائد اور اس کی بڑے مثال قائمانہ صلاحیتوں کے گن گاتے ہیں بعض امیدوار تو اظہار خیال کو بھی کسرتیان سمجھتے ہیں اور اس موقع پر بھی دوسرے ہی ان کی طرف سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ شرکاء کی تقریریں اور توجہ چائے اور نمک پاروں پر ہوتی ہیں اور تقریری پر وگرام ختم ہوتے ہی چائے اور نمک پاروں پر دھاوا بول دیا جاتا ہے اس تقریب کے بعد امیدوار کے لیے یونین کے لیے اور یونیورسٹی کے لیے نعرے لگائے جاتے ہیں اور پھر حسب توفیق کندھوں پر یا پیدل ہی امیدوار

ملک فلاح دیہود کے موضوع پر گفتگو





اُجاگر کرنے کے لیے بہت ہی دلچسپ انداز میں "ایٹی" یا "ہیوٹا" تقسیم ہوتے تھے جو عرصے تک یاد رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس میں سرپوشی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ لہذا یہ سلسلہ اب بند ہے۔ باوجود اس کے کہ دیواروں پر پوسٹر لگانے کی اجازت نہیں لیکن اتنے پوسٹر لگا دیئے جاتے ہیں کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیواروں پر پوسٹر نہیں بلکہ پوسٹر دیواروں میں دیواریں لگا دی گئی ہیں۔

کنویننگ، راؤنڈ اور انفرادی ملاقاتوں کے بعد امیدواروں کے خاص سپورٹرز اور ورکرز کو ہم نوا بنانے کی کوشش جیسے "سپورٹرز ٹور" کہا جاتا ہے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموش معاہدے اور گروپ سپورٹ کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً اعظم گڑھ گروپ، بہار گروپ، جنوبی ہند کے طلباء، کشمیری طلباء یا غیر ملکی طلباء اور طالبات، ان کی حمایتیں حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض پوری یونیورسٹی میں دن رات الیکشن کا دھوم مچی ہوتی ہے۔ طالبات میں کنویننگ کو سپورٹرز مقدس فریضہ سمجھتے ہیں، ہر طرف جوڑ توڑ، معاہدے، مخالفت، دعوے، وعدے، شرمیلیں اور سرگرمی ہوتی ہے۔

یہاں تک کہ یونین میں "الیکشن تقریر" ہوتی ہے اس میں عام طور پر کسی امیدوار کی تقریر سنی نہیں جاتی کیوں کہ طلباء کلبے پناہ جھوم، نعرے بازی، اپنے امیدواروں کے کارڈ پھینکنا اور پھر پھر ڈر کہ کسی مقرر کی تقریر زیادہ اثر انداز نہ ہو جائے۔ غرض ایک ڈیڑھ گھنٹے کی اس روایتی تقریر بازی میں شور ہی شور رہتا ہے۔

اس تقریر پر دگرام کے بعد امیدوار کو دوبارہ کیمپ تک لایا جاتا ہے اور اب اسے الیکشن کا نتیجہ نکل جانے تک اسی کیمپ میں رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے اب الیکشن کمپوں

ملنگھ مسلم یونیورسٹی نمبر

کو جلوس کی شکل میں اپنے کیمپ تک لے آیا جاتا ہے اور اب یہاں بیٹھ کر تمام سیاسی پینچ اور سرپینچ منصوبے بناتے ہیں۔ اور ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ہر امیدوار کے سپورٹرز اپنے امیدوار کو اپنے خاص حساب کے ذریعے کامیابی کا پورا یقین دلادیتے ہیں۔

کیمپ میں آنے کے بعد رات کو رہائشی ہالوں اور ہوٹلوں کا دورہ (راؤنڈ) ہوتا ہے۔ امیدوار صاحب دولہا کی طرح آگے آگے، زندہ باد کے نعروں میں ہر ہوٹل میں پہنچتے ہیں، ہر کمرے میں جاتے ہیں، سب سے ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ ملاتے وقت سٹورز سا جھٹکا اور مسکرانا ضروری ہوتا ہے اور بقدر ظرف ہاتھ کو دبانا بھی جس سے بے تکلفی کا اظہار ہو سکے۔ امیدوار کے سپورٹرز ساتھ ہی امیدوار کے انتخابی کارڈ بھی بانٹتے جاتے ہیں۔ پھر تقریر ہوتی ہے اور سوالات و جوابات اور واپس کیمپ آکر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں کیمپ میں حسب توفیق چائے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اور اب خاص محفل جیتی ہے۔

اس میں دن بھر کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ کا منصوبہ بنتا ہے مخالفوں کے راز اور کمزوریوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس موقع پر سینئر الیکشن باز "بڑھ چڑھ کر اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں کہ آج انہوں نے فلاں ہوٹل ہموار کر دیا اور کل فلاں ہال چکا ہوا جائے گا یہ الگ بات ہے کہ موصوف کا زیادہ وقت چائے اور سگریٹ پینے اور آرام سے سونے میں گزرا ہو۔ اسی قسم کے "متمزک" سپورٹرز عام طور پر ہمارے سبب بنتے ہیں۔

راتوں رات یونیورسٹی کے چنے چنے پر رنگارنگ پوسٹر لگا دیئے جاتے ہیں، پھر امیدواروں کی "کوالی فیکیشن" ہوتی ہیں پہلے مخالف امیدواروں کی کمزوریوں کو



## یونین کے عہدیدار

برائے سال ۱۹۷۱ء

مرنی۔ پروفیسر عبدالعلیم۔

نرشہد۔ ڈاکٹر رشید الظفر۔

صدر۔ سید قیصر محمود۔

نائب۔ جناب اقتدار حسین خاں۔

مستند اعزازی۔ عارف محمد خاں۔

محمد عمران۔ اسحاق رفیع ریلیف و سیمینار

آن اسلام۔

تاج احمد۔ استقبالیہ۔

پی کے خالد۔ کامن روم ریلرڈ

آفتاب عالم خاں۔ کامن روم، مالک

کانویشن کوی سمین۔

ابوشحہ۔ ریڈنگ روم۔

خالد عمر خاں۔ اسکول آف پبلک امپلنگ

اینڈ پارلیمنٹری پریگنٹ، آل انڈیا شاہ

مقابلہ قرأت۔

اقتدار خاں۔ نائب صدر یونین اسکول

کے انچارج بھی بنائے گئے۔

بند دفتی آجاتی ہے۔ چائے اور دانے کا سلسلہ بڑھ جاتا ہے

بمقدار قسم کے امیدوار کے دانش مند پورٹرس جن کے کیمپ

میں چائے وغیرہ کا معقول انتظام نہیں ہوتا ان کیمپوں میں

چائے دئے پیتے ہیں جہاں صرت چائے ہی ملتی ہے اور

کام باتوں کی حد تک۔ اب کنوینٹنگ انفرادی اور خاموشی

سے ہوتی ہے اور امیدوار گروت نشیں ہو کر گویا اعتکات

میں یا مائیوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اب امیدوار نمازوں کا پابندی

سے اور دعاؤں کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔

آخر کار پولنگ کی رات آجاتی ہے اور رات بھر دوڑ

سجاگ، جوڑ توڑ اور آخری کنوینٹنگ ہوتی رہتی ہے اور

امیدواروں کو اپنے حق میں الیکشن سے کنارہ کش کرنا

کوششیں جاری رہتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر مینیجرز کا فیصلہ

”غیر جانب دار طلباء کی رائے“ ”ہی خواہاں یونین کی اپیل“

کسی ایک امیدوار کے خلاف یا حق میں بہت تیزی اور

خاموشی سے بانٹی جاتی ہیں۔

پولنگ کے وقت تمام امیدواروں کے درکرز،

بچ لگا کر قطاروں میں پولنگ اسٹیشنوں پر کھڑے ہو جاتے

ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ ٹولیاں راڈنڈ پر نکل کھڑی ہوتی

ہیں۔

پولنگ کے بعد ہفتوں کی تنہا کے بعد سب گہری

نیند سو جاتے ہیں۔ بے چارہ امیدوار اب بھی فتح و شکست

کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اس غریب کا درد ہفتوں

میں تقریباً کچھ منٹ چکا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے دن

دوٹوں کی گنتی شروع ہو جاتی ہے اور ہزاروں طلباء دہاں

جمع ہو جاتے ہیں اور منٹ منٹ کی خبر امیدواروں تک

پہنچاتے ہیں۔ آخر کار رزلٹ نکل آتا ہے جیتنے والے

امیدواروں کے کیمپوں پر ہزاروں طلباء کا ہجوم ہوتا ہے

تمام جیتے ہوئے نمائندوں پر بھولوں کی بارش شروع ہو

جاتی ہے اور وہ فلک شکاف نعروں کے ساتھ پوری یونیورسٹی

میں چکر لگاتے اور شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہارنے والے خوددار

امیدوار پھر بھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ ہاں جو نیم خوددار ہوں

وہ علی گڑھ تو پہلی فرصت میں چھوڑ دیتے ہیں لیکن پھر خوددار

ہو جاتے ہیں بعض امیدواروں کے دوٹوں کی کل تعداد

ان کے درکرز کی کل تعداد سے بھی کم رہتی ہے۔ ★

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

# علی گڑھ کول

کالج کو خاص علی گڑھ میں قائم کرنے کے جو وجوہ اور اسباب تھے وہ بجا سے خود بہت معقول ہیں اس نواح کے رؤسار و اہل دول کی علمی دل چسپی اور فیاضی سے اس کالج کو ہر قسم کے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل نغم میں صرف اس سرزمین کی خصوصیات جس پر یہ کالج قائم کیا گیا ہے۔ شاعر نے دکھائی ہیں۔ (ادامہ)

جہاں میں عجب طرفہ تر ہے مقام  
مگر دیکھنے کی نہیں کوئی شے  
نہ قصر معشوقی، نہ ایوان و کاخ  
نہ بازار شائستہ و دل پسند  
کہ جس کی کرے اجنبی آ کے سیر  
نہ کچھ چوک ہی شوکت و شان کا  
عمارت کی ہے بد قوارہ نشست  
منہسل کر نہ چلتے تو پہونچے گزند  
نہ شوکت، نہ زینت، نہ رونق کہیں  
جہاں لوگ جا کر پھریں صبح و شام  
کہ ہو جس کی بوسے معطر و مرغ

وہ کول اب کہ جس کا علی گڑھ ہے نام  
کہ اتنا تو دنیا میں مشہور ہے  
عمارات عمدہ نہ سرکیں و سرخ  
نہ اونچے مکاں ہیں نہ کوٹھے بلند  
نہ مسجد، نہ مندر، نہ گرجا، نہ پر  
نہ کوئی سڑک ہے یہاں خوشنما  
بلکہ تنگ ہے اور دکائیں ہیں پست  
وہ گلیاں ہیں کاواک و پست و بلند  
تشرینہ کا کوئی محلہ نہیں  
نہ تفریح کا کوئی ایسا مقام  
نہ گلشن ہے کوئی، نہ ہے کوئی باغ

بدھ دیکھے اک بیابان ہے  
کہ دیکھے کوئی جا کے جس کی بہار  
نہ چشمہ کہیں ہے، نہ پانی کا کنڈ

سواد اس کا خشک اور ویران ہے  
نہ سبزہ کہیں ہے، نہ ہے مرغزار  
ادھر اور ادھر ہیں بولوں کے جھنڈ

نہ ندی، نہ تالا، نہ دریا، نہ تال  
یہاں کوئی شاید کرے اعتبار  
نہ کھانے کو ملتی ہیں مرغابیاں

جہ ہر دیکھتے سخت پانی کا کال  
اگر آپ کہتے کہ عنصر ہیں چسار  
جو پانی نہیں ہے تو پھسلی کہاں

کہ تاریک ہو مہر عالم فرود  
کہ گرتے ہیں صدمہ سے جن کے دخت  
کہ صحر اکو بھی آدمی جیسے بھول  
تو سامان مٹی میں سب مل گیا  
کہ جوتے کا ہے سخت مشکل نباہ  
تو چھینٹا دیں آستیں پر پڑا  
کہ گویا ہے یہ سوزین اس کی کان  
تو چیدوں کا بچنا ہے اس سے محال

وہ گرمی میں آندھی کے طوفان روز  
ہواؤں کے جھونکے وہ تند اور سخت  
ہر اک سمت اڑتی ہوئی خاک دھول  
دریچہ اگر رہ گیا ہے کھلا  
وہ بارش میں کیچڑ، خدا کی پناہ  
جہاں چپ سے جوتا زمین پر پڑا  
وہ دیمک کی کثرت یہاں الامان  
نہ رکھتے برابر اگر دیکھ بھال

کہ پیدا نہیں کوئی اچھا شر  
کہ کھاؤ تو ہو جائے فوراً دکام  
نہ آم ایسے میٹھے کہ ہوں کھا کے سیر  
وہاں کیا ملے اور کوئی شر  
شریعہ نہیں، ناشپاتی نہیں  
نہیں اس گلستاں میں ان کی نمو  
نہ سرد و خرد امان دل جو یہاں  
کہ فطرت یہاں کی نہیں گل تر آتش

زمین ہے یہاں کی خراب اس قدر  
ہیں امر و خشک اور کھتے تمام  
نہ کیلا سیلا، نہ شاداب بیر  
جہاں پر میسر نہ ہونے شکر  
یہاں کی زمیں کچھ اگاتی نہیں  
وہ گل جن کی آنکھوں کو ہے جستجو  
نہ ہے لالہ آتشیں زو یہاں  
عبث پھول کرتی ہے بیل تلاش



کسی چیز میں بھی طراوت نہیں  
نہ خاطر میں تفسیرِ سخن اور انبساط  
نہ دل میں امنگوں کا کوئی اثر  
قویٰ مضحکہ، جسم راحت پسند  
نہ زندہ دلوں کا کہیں پر ہجوم  
جو افسردہ دل ہے تو چہرہ اداس  
وہاں کیا ہوں شیریں شمائل بشر

جو آب و ہوا میں لطافت نہیں  
نہ اعضا میں چستی، نہ دل میں نشاط  
نہ صورت میں ہے شان و شوکت نہ فر  
ارادے قوی ہیں، نہ ہمت بلند  
نہ کوشش، نہ جوشش نہ شورش نہ دھوم  
نہ رنگیں طبیعت، نہ رنگیں لباس  
نہ شیریں ہو جس سرزمین کا ثمر

کہ کالج کی ڈالی یہاں داغ بیل  
کہ جس کی گئی روشنی دور دور  
کہ اس شہر کی چم گئی جس سے دھوم  
کوئی شہر اب اس کا ہمسر نہیں  
جو رکھا گیا اس کے بالائے سر  
کہ عالم میں ہے اب وہ مشہور عام  
علی گڑھ کا شہرہ ہے زیرِ فلک  
چلے آئے ہیں لوگ ہر سمت سے  
ہزاروں طرح کے مشاغل ہیں روز  
لگے آنے و نہر مانروایانِ دہر  
نہ تھا وہ نہ اسلم یہ دل کش مقام

مگر دیکھئے کیا ہیں قدرت کے کھیل  
یہاں پر جڑا لاکے وہ کوہ نور  
بنایا یہاں ایسا دارالعلوم  
ہوئی مرکزِ علم یہ سرزمین  
یہ کالج ہے گویا کہ اک تاجِ نذر  
ہوا اس سے روشن علی گڑھ کا نام  
جہاں دیکھئے، شرق سے غرب تک  
اب اس شہر کو دیکھنے کے لئے  
مجانس ہیں روز اور محافل ہیں روز  
حسلائیق کا مرجع ہوا اب یہ شہر  
کیا اس کو کالج نے مقبول عام

منش کردہ ام رستم داستان  
وگر نہ سیلے بود و داستان

ماہنامہ از علی گڑھ منتقلی۔ بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء جلد ۱۲ شماره ۱۲

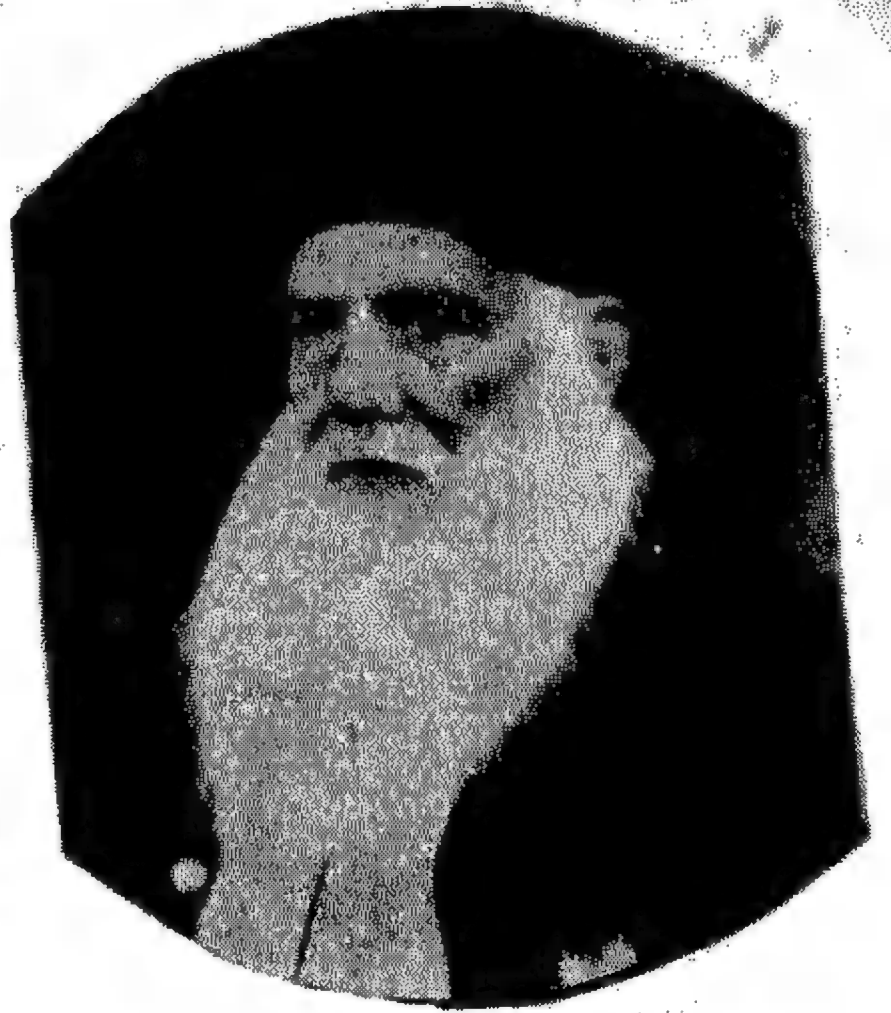
www.1arabianews.com

# ن کی گود میں

## مرسید

### کا پیش گزرا

(ایم رحمان)



بیٹھ کر کرتا، تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑکیوں میں ایک لڑکی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی، مگر ان سوت کی لڑکیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی!

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایسے شخص نے مرسید احمد خاں سے بدی کی جس سے انہوں نے کبھی بہت بڑا سلوک کیا تھا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت جس سے اسے پوری مزاحمت سے مل سکتی تھی۔ ان کے ہاتھ آگئے اور مرسید انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے، ان کی والدہ نے جب سنا، تو کہا:

”اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عہدہ کوئی کام نہیں اور اگر تم کو اس کی بدی کی مزاحمت سے دلائی ہے تو نہایت عفو ہے کہ اس قوی اور زبردست حکم الحاکم کے چٹکل عبور ایک اعلیٰ کی مزادینے والا ہے، چھوڑ کر دنیا کے ضعیف و ناتواں حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو!“

مرسید کہتے ہیں اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس وقت سے میرے دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے

۱۸۸۳ء میں برصغیر کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ مرسید احمد خاں اس کے ممبر تھے۔ ان سے تعلیم نسواں کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے اثنائے شہادت میں فرمایا:

خود میں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے پائی۔ نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیئے، جو اب تک بعینہ مجھے یاد ہیں۔

مرسید احمد خاں کی والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ وہ نواب دیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن نہایت لائق، منتظم، ذہین، رحمدل اور بااخلاق تھیں۔ مرسید احمد اپنی ابتدائی تعلیم کا جو انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کیا، اس طرح ذکر کرتے ہیں:

میں نے خود گلستاں کے سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے جب میں ان کو سبق سنا، یا سننے سبق کا مطالعہ ان کے پاس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لبریری

کا خیال نہیں آیا۔

مرسد ایک ادوائے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جس زمانے میں میری عمر گیارہ باو برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڑھا اور پرانا تھا، کسی بات پر تھڑا مارا جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر بعد میں گھر گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا: اس کو نکال دو، جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے، یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا، چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر مرکز پر پھول دیا اسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا، نکلی اور مجھے میری خالہ کے گھر لے گئی میری خالہ نے کہا، دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا، اس سے بھی خفا ہوں گی، مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے میں چھپا رہا میری خالہ میرے سامنے لا کر دو اور بہنوں سے کہتی تھیں: دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں، تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا: اگر اس نوکر سے قصور معاف کرانے تو میں معاف کروں گی، وہ نوکر ڈیوڑھی میں بلایا گیا، میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔

مرسد اپنے ایک دوست سے ہمیشہ لے جایا کرتے لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے اور انہوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا، مرسد بدستور لے رہے لیکن ایک مدت بعد انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے سبب دریافت کیا۔ مرسد نے جو بات تھی، کہہ دی۔ انہوں نے کہا:

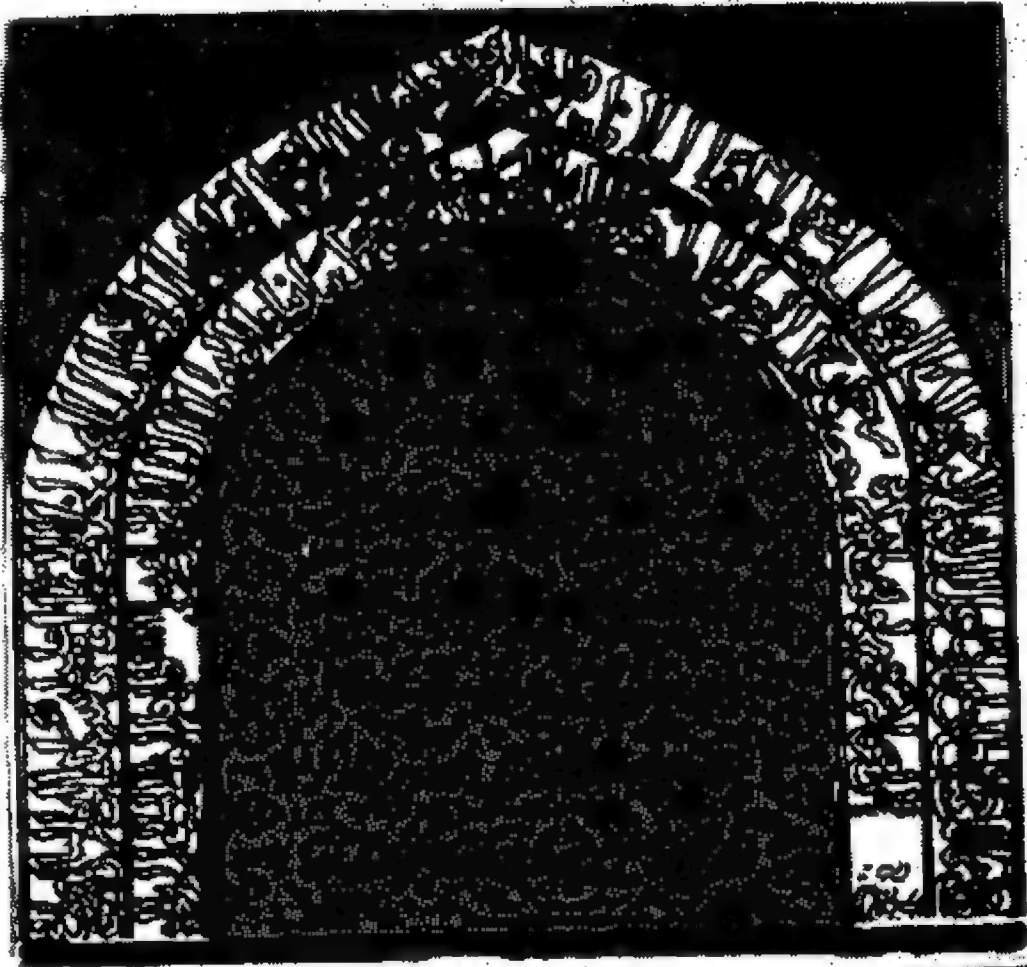
”نہایت افسوس ہے جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہئے

یہ تمہارا فرض ہے تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے اس سے تم کو کیا، دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں؟

عزیز النساء بیگم غریب اور مسکین عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ ان کے رہنے سہنے اور علاج کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک غریب اور لاوارث بڑھیا زینت تھی جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی۔ اتفاق سے وہ اور زینت ایک ہی زمانے میں بیمار ہو گئیں۔ جو دو حکیم ان کے لئے تجویز کرتا تھا، وہی دوا زینت کو پلاتی تھیں دونوں کو صحت ہو گئی۔ اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون تجویز کیا جو مرسد تیار کر کے لاسے چونکہ انہیں یقین تھا کہ زینت کو یہ قیمتی معجون کوئی تیار کر کے نہیں دے گا وہ خفیہ خفیہ زینت کو کھلاتی رہیں اور خود کبھی تک نہیں۔ اس سے زینت کی صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور ساتھ ہی ان کی صحت بھی اچھی ہو گئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا: اس معجون نے تو آپ کو بہت فائدہ کیا، تو انہوں نے ہنس کر جواب دیا: کیا تمہارے نزدیک خدا بزرگ دوا کے صحت نہیں دیتا؟ سید صاحب کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا اور پھر سارا قصہ معلوم ہوا۔

ان کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال میں جوانی میں ہو گیا، اس وقت ان کی عمر کوئی ۳۴ سال کی ہوگی جیسا کہ انہیں رنج ہوا ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ گریہ و فاری میں مصروف تھے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے تھے اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلتے: خدا کی مرضی! لیکن بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ اتفاق سے انہی دنوں میں قریب کے عزیزوں کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامان شادی جو چکا تھا، تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی جب یہ موقع واقع ہوئی، اس لئے حسب دستور ان لوگوں نے اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا مگر سید احمد خاں کی والدہ اس اعتقاد کے تیسرے دفنان کے گھر گئیں اور کہا:

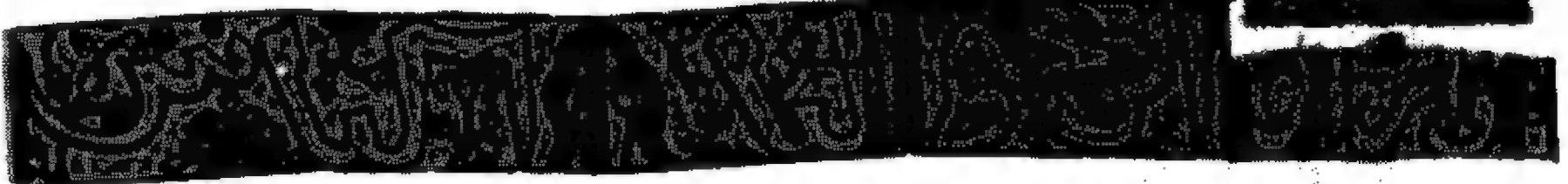




مرسید اعظم  
کی  
مشہور کتاب  
"آثار العارفين"  
کے پہلے  
ایڈیشن کے  
تطبیب خانہ کے  
چند کتبے اور  
نقشے



مہماری شادی میں آئی ہوں، تین دن سے زیادہ ماتم  
کو نامنوع ہے جو ہونا تھا ہو چکا، تم شادی ہرگز ملوئی نہ کرو اور  
جب میں تمہیں اجازت دیتی ہوں، تو پھر تمہیں کوئی  
کیا کہہ سکتا ہے۔  
وہ کبھی کسی مقصد کے لئے منت یا سیار نہیں  
مانتی تھیں اور نہ انہیں فال، گنڈے، تعویذ پر اعتقاد  
تھا۔ تاریخوں اور دونوں کی سعادت یا نحوست کی وہ  
ذرا برابر پر دہانہیں کرتی تھیں۔ انہیں خدا پر پورا  
بھروسہ تھا۔ سید احمد خاں کہتے ہیں۔  
"میرے ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا  
تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمن کے وہ معتقد تھے  
کے یہاں جو کچھ ہوتا تھا، اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔  
شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لوگوں  
کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک گنڈا دیا  
کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اس تعویذ میں



ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا۔ بارہ برس کی عمر تک انڈیا مرغی کھانے کی اس کو نعمت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کے انھیال والوں نے وہ گندہ پہنایا، مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گندے کے سبب انڈیا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے، تو کوئی آفت آئے گی، خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکے جب بھی ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈیا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا، تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔

عزیز النساء بیگم بڑی ہی دوراندیش تھیں۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خاں نے وزارت سے استعفیٰ دیا، تو کچھ دنوں بعد ہمارا جہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ہزار دینار سفر خرچ کے لئے پیش کئے اور لاہور بلوایا۔ سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اسے منظور فرمائیں، خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی، لیکن ان کی بڑی بیٹی یعنی سید احمد خاں کی والدہ نے کہا: ”آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اس قدر کہ اپنی بقیہ زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر کر سکتے ہیں، خود لاہور جانا اور ہمارا جہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات ہاتھ میں لینا اور ہم سب کا انگریزی عمل داری میں رہنا خلافت مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیسے اتفاقات اور کیسے انقلابات درپیش آئیں۔ دوسرے آپ کا زمانہ ضعیفی کا ہے اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لئے یہی مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ یہیں رہیں۔“ دیرالدر کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔

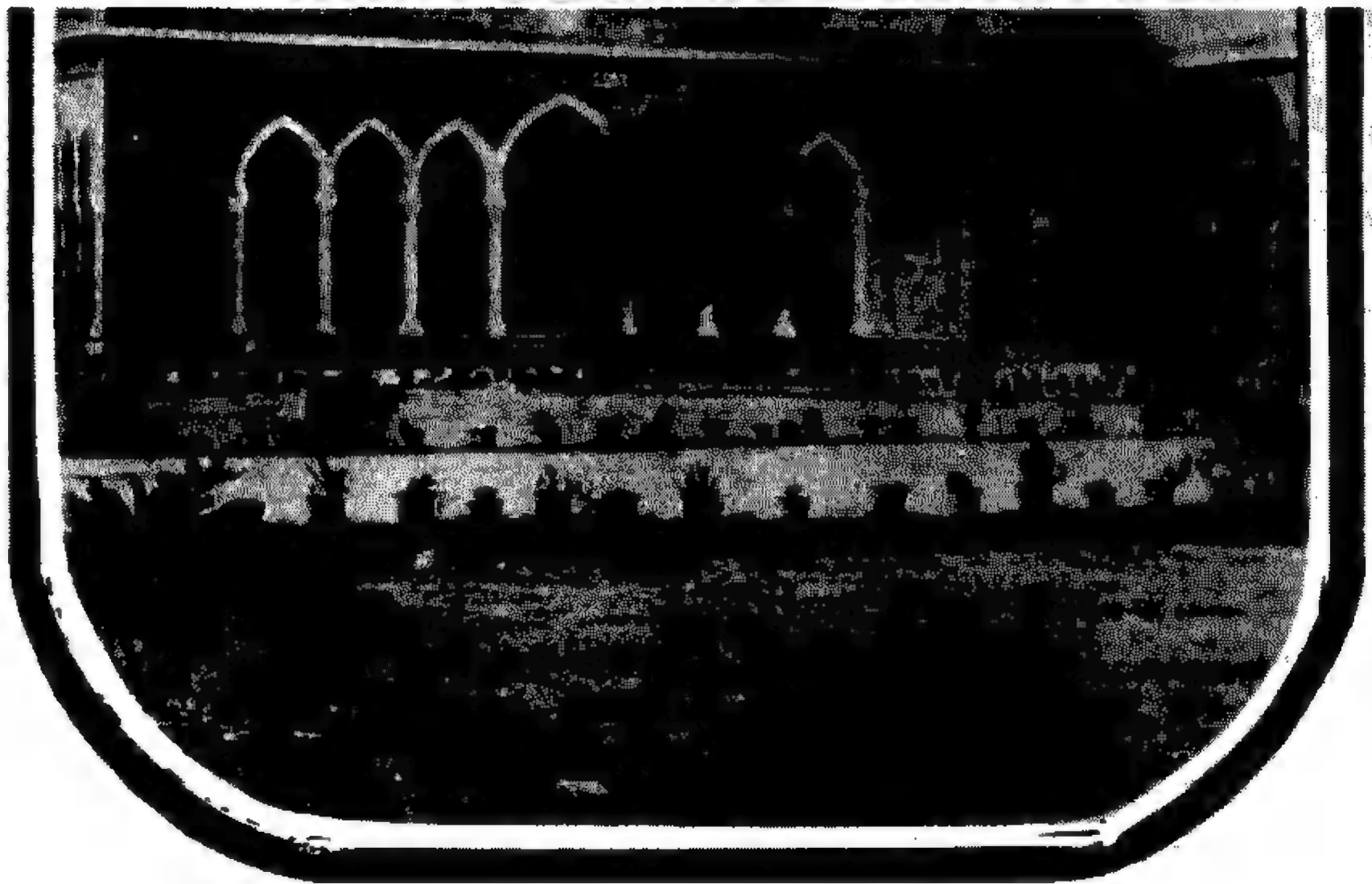
وہ بڑی ہی نیک اور عابد و متقی خاتون تھیں۔ سرسید لکھتے ہیں: ”انتقال سے پہلے صرف دو وصیتیں کیں: ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ان کے ذمے نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز۔ صرف بیماری کے دنوں کی نمازیں قضا ہوئیں۔ اگر زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد ہم اس قدر نماز و کاحساب کر کے کفارے کے گہروں غریبوں کو بانٹ دینا۔ دوسرے دن انھوں نے قضا کی، تو میں نے ان کی دونوں وصیتیں پوری کر دیں۔ ان کی نصیحتیں نہایت نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں، وہ کہتی تھیں:

”مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں، اس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے، مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔“

انھوں نے ایک مرتبہ سید صاحب کو نصیحت کی: ”جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو۔ ایسا لازمی کہ ہر حالت میں جانا ہوگا، تو وہاں تم کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پاپیادہ۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔“

”اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ ٹکی کی ہو اور پھر بُرائی کرے یا دو دفعہ ٹکی کی اور دو دفعہ بُرائی کرے تو تمھیں آزرہ نہ پہننا چاہئے۔ کیوں کہ ایک یا دو دفعہ ٹکی کرنے والا کیسی ہی بُرائی کرے، اس کی ٹکی کے احسان کو بھلایا نہیں جاسکتا۔“

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر



# سائنس و سوسائٹی

نشاطِ ثانیہ





سر سید کا خیال تھا کہ سماجی اصلاح اور ترقی کی کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک عوام کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے منظم جدوجہد نہ کی جائے وہ کہا کرتے تھے کہ صرف نئے خیالات کی روشنی ہی سے تنگ نظری اور توہم پرستی کا کبرا چھٹ سکتا ہے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل لالی اور تقریریں، علمی مباحثوں اور سائنسی تجربوں کے علاوہ ایک عظیم الشان منصوبہ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا تیار کیا ۱۸۶۶ء میں جب وہ غازی پور سے علی گڑھ آئے تو سائنٹفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ یہاں آ گئی۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی جس کے نام ہی سے اس کے مقاصد اور نوعیت کا رکا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے مغربی علوم اور افکار سے ہندوستانیوں کی بیگانگی کو دور کیا اور ایک ایسی فضا تیار کر دی جس میں سائنس کے فکری اور عملی کارناموں کو سمجھنے اور حالات گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مدد ملی۔ سر سید کی تعلیمی مہم کے لئے سائنٹفک سوسائٹی نے ہر ادل کا کام کیا راجہ جے کشن داس نے ۶ جون ۱۸۶۶ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب تک کوئی سہل طریقہ علوم و فنون درجہ پور پے کے حاصل ہونے کا سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اب جو یہ تدبیر یعنی تقریر سائنٹفک سوسائٹی کا سید احمد خاں صاحب نے اپنی عالی ہمتی سے محض اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لئے کیا ہے یہ نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس میں صرف تھوڑا سا حرف کرنے سے آپ کو ادراک اپنی اولاد کو اور اپنے جمیع ہم وطنوں کو نہایت عمدہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

(ردنار نمبر ۵ ص ۴-۳)

سر سید نے اس سوسائٹی کی تنظیم نہایت اعلیٰ پیمانے

۱۵۰ اردو ڈائجسٹ ہماگت ۷۲

پر کی تھی۔ تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے اس کی مالی شان و حرمت خاص اپنے اہتمام اور نگرانی میں تیار کرائی۔ ہر مہینے میں متعدد جلسوں کا بندوبست کیا۔ مضامین جن پر لکچر ہوتے تھے خالص طور پر ایسے چنے جاتے تھے جن سے معلومات میں اضافہ ہو اور آزادی فکر و نظر پیدا ہو۔ ڈاکٹر کلکی ہر مہینے ایک لکچر نچل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حافرن کو تجربے دکھاتے تھے۔ ایک پورا عملہ سوسائٹی میں کام کرتا تھا۔ مترجم، مولوی، پریس مین، چپراسی، مالی دھڑہ کو تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی مولانا حالی لکھتے ہیں۔

”سر سید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دار و مدار تھا اور علاوہ ڈائریکشن اور سالانہ چندہ کے طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انہوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیل لکلا کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی ادوار و کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے جب تبیل کلام کی چھپائی موقوف ہو گئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دے دیا۔“

(حیات جاوید ج ۱ ص ۱۲۵)

سر سید اس سوسائٹی کو جس قدر فردرستی اور اہم سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو ۱۶ اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان جاتے ہوئے انہوں نے جہاز پر سے نواب محسن الملک کو لکھا تھا۔

”مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو سنبھالنے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرما دیں۔“ (خطوط سر سید ص ۱۲)

عجیب اتفاقی ہے کہ آج پورے سو سال بعد اس

ملک میں مسلم یونیورسٹی خیر

## سر سید احمد خاں

### ایک نظر میں

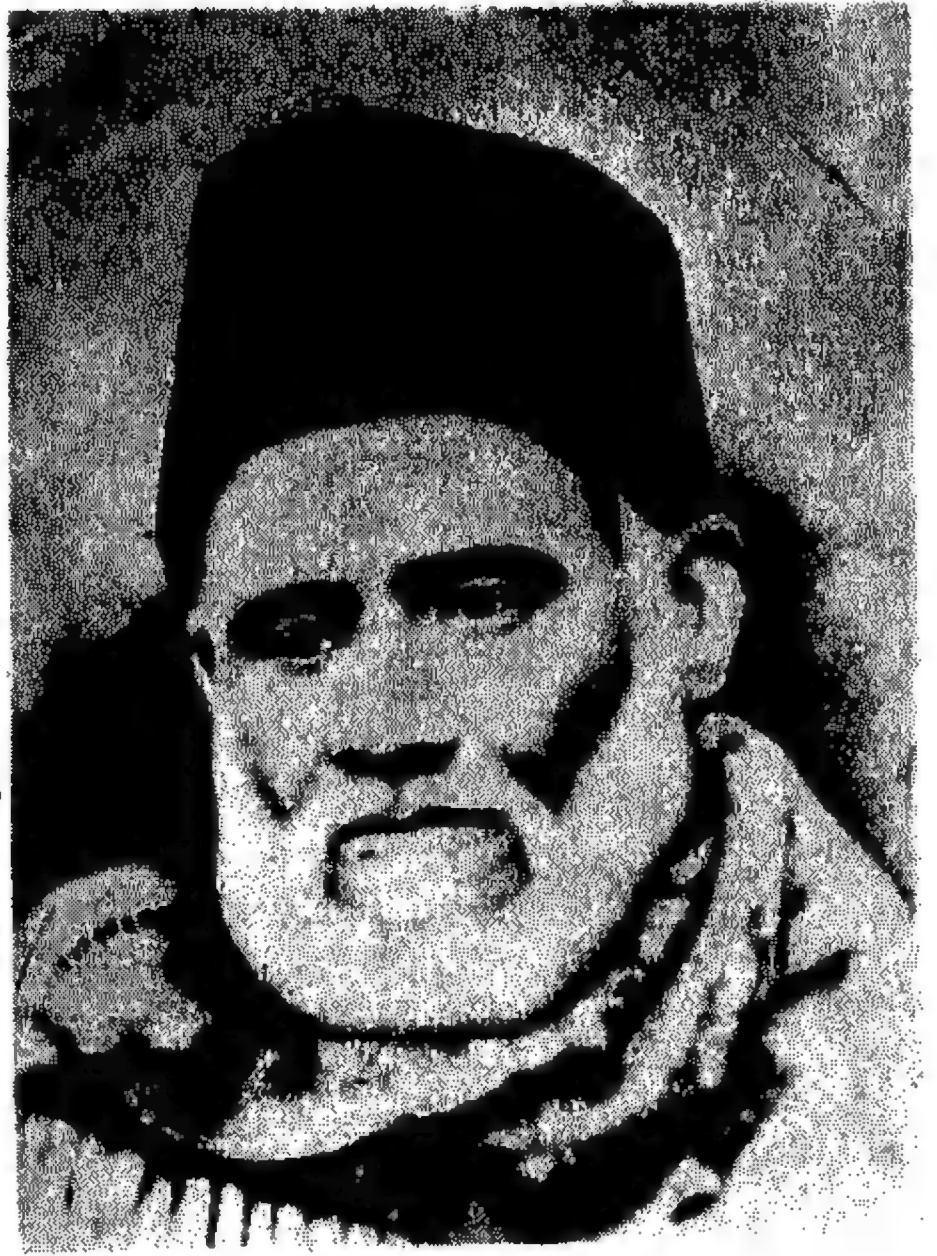
- ۱۸۱۷ء - اراکوہر کو دہلی میں پیدائش۔  
 ۱۸۲۵ء - نانا کا انتقال۔  
 ۱۸۳۸ء - والد جناب سید محمد متقی کا انتقال۔  
 دہلی میں نوکر ہوئے۔  
 ۱۸۴۰ء - پہلی کتاب جام جم کی اشاعت۔  
 ۱۸۴۵ء - آثار الہنادید کا پہلا ایڈیشن۔  
 ۱۸۵۸ء - والدہ محترمہ عزیز النساء کا میرٹھ میں انتقال۔  
 ۱۸۶۱ء - شریک حیات کا انتقال۔  
 مراد آباد میں انگلش اسکول کا قیام  
 ۱۸۶۲ء - غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی شروع کی۔  
 غازی پور میں ہی ایک اسکول کی بنیاد رکھی۔ جسے بعد میں علیگڑھ منتقل کر دیا گیا۔  
 ۱۸۶۶ء - برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔  
 علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت کا کام شروع کیا۔  
 ۱۸۶۹ء - یکم اپریل کو انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔  
 ۱۸۷۰ء - اراکوہر کو ہندوستان واپس آئے۔  
 تہذیب الاخلاق کی اشاعت شروع کی۔  
 ۱۸۷۳ء - کلچ شروع کرنے کی اسکیم پیش کی۔  
 ۱۸۷۵ء - ۲۴ مئی کو ایم۔ اے۔ او کلچ کا افتتاح۔  
 ۱۸۷۶ء - نوکری سے ریٹائر ہو کر علیگڑھ میں سکونت اختیار کر لی۔  
 ۱۸۷۶ء - محمد ن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام۔  
 ۱۸۸۹ء - ہڈ ڈائن ٹریٹیز کا قیام۔  
 ۱۸۹۵ء - ۲۷ مارچ کو دنیا سے فانی سے کوچ فرمایا۔

سوسائٹی کی تجدید کا سامان جس عمارت میں کیا جا رہا ہے وہ نواب ہندی علی حسن الملک ہی کے نام سے موسوم ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کی ضرورت :- (۱) جب میں اپنے پیارے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے استقدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نکال نہیں سکتے کہ کل کیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں جو بہت چھوٹی چھوٹی قومیں تھیں انہوں نے کیونکر ترقی پائی اور کس طرح وہ ایک بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کی مانند ہو گئیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جو بڑی بڑی قومیں ایک بڑے سیوہ دار درخت کی مانند چھل چھل رہی تھیں وہ کیونکر مرجھا کر سوک گئیں۔

(ردِ ملامت نمبر ۱، ص ۲۶ تقریر سر سید)

(۲) آداب ہم بالا جمال بن دیلوں پر غور کریں جن سے قوموں کی دانائی اور علوم اور عقائد کی کمال کو ترقی ہوتی ہے۔ اس اعظم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجہ کے دریا کرنے کے لئے ہم کو ان قوموں کے اگلے اور پچھلے حال پر نظر کرنی چاہیے جو آج کے دن فنون اور علوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہیں۔ جب کہ ہم اگلے زمانے اور حال کے رہانے کی تاریخ پر متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہو اور اس نے علوم و فنون میں بزرگی اور عظمت حاصل کی ہو۔ ایسے شخصوں یا قوموں کی چند مثالیں ہیں جنہوں نے خود آپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یا علم ایجاد کیا یا اس کو تحقیق کیا اور پھر اس کو اس کے برتر درجوں میں پہنچاتے گئے اور آخر کار اس کو کمالیت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ مگر عموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم تو کسی بات کی تحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس تحقیقات کو





## مولانا شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے غلیٹ  
فضیلت کے اعلیٰ مارچ طے کے ۱۸۸۷ء میں ریٹ  
نے انہیں علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر بنادیا علی گڑھ  
کی فضا شبلی کی علمی نشوونما کے لئے بہت مفید ثابت  
ہوئی، اور وہیں سے علمی دنیا میں شہرت حاصل کی۔  
مولانا شبلی نے علم کلام، تاریخ، تنقید، میرت، غرض  
ہرمیلان میں اپنی ذہانت کا نقش جمایا لیکن سب سے زیادہ  
نام تاریخ اور تنقید میں پیدا کیا۔ ادب، تاریخ اور تحقیق  
میں مولانا کا رتبہ بہت بلند ہے۔

اس سے لیتی ہے اور پھر اپنی محنت اور استقلال سے اسکو  
کالیبت کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ غرض کہ قوموں کی  
دانائی کی ترقی کچھ تو خاص انہی کی اور کچھ اور قوموں کی

۱۵۲ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۷۲ء

مختوں اور کوششوں سے ہوتی ہے۔ تو میں بھی اسی طرح  
جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پاتے  
ہیں اس طرح کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اور وہیں کو دریں اور  
جو کچھ ان کے پاس نہیں ہے وہ اور وہیں سے لیں۔ اسی اصول  
پر دنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد  
ہے۔ پس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن  
اپنے علم کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ بڑھادیں گے اور  
کاہلی اور سستی اور غور مطلبی اور ہم وطنوں کی خطائی سے  
بے پرواہی کی حالت میں جہیں وہ اب دکھائی دیتے ہیں  
اور جس میں بد بختی سے وہ آپڑے ہیں رہنے پر راضی رہیں  
گے اس وقت تک ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں  
ہو سکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں اور قوموں  
کے مختلف فنون اور علوم کے لینے اور ان کو بخوبی حاصل  
کرنے سے اپنے علم کو بڑھادیں۔ اس مردہ پن کے کاہلی  
کی حالت میں سے نکلنے کو جس کی روز بروز ہم میں ترقی معلوم ہوتی  
ہے۔ ہر برس جو گزر رہا ہے ایک نئی شکل پیدا کرتا ہے اور  
ہر برس وقت کو زیادہ کرتا ہے۔“

”اتما س بخد مت ساکنان ہندوستان درباب

ترقی تعلیم اہل ہند“، سرسید۔ ص ۶-۲۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا مقصد :- ”اس مجمع کا نام  
سائنٹیفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جاوے گا اور  
مقصد اس کا یہ ہوگا۔“

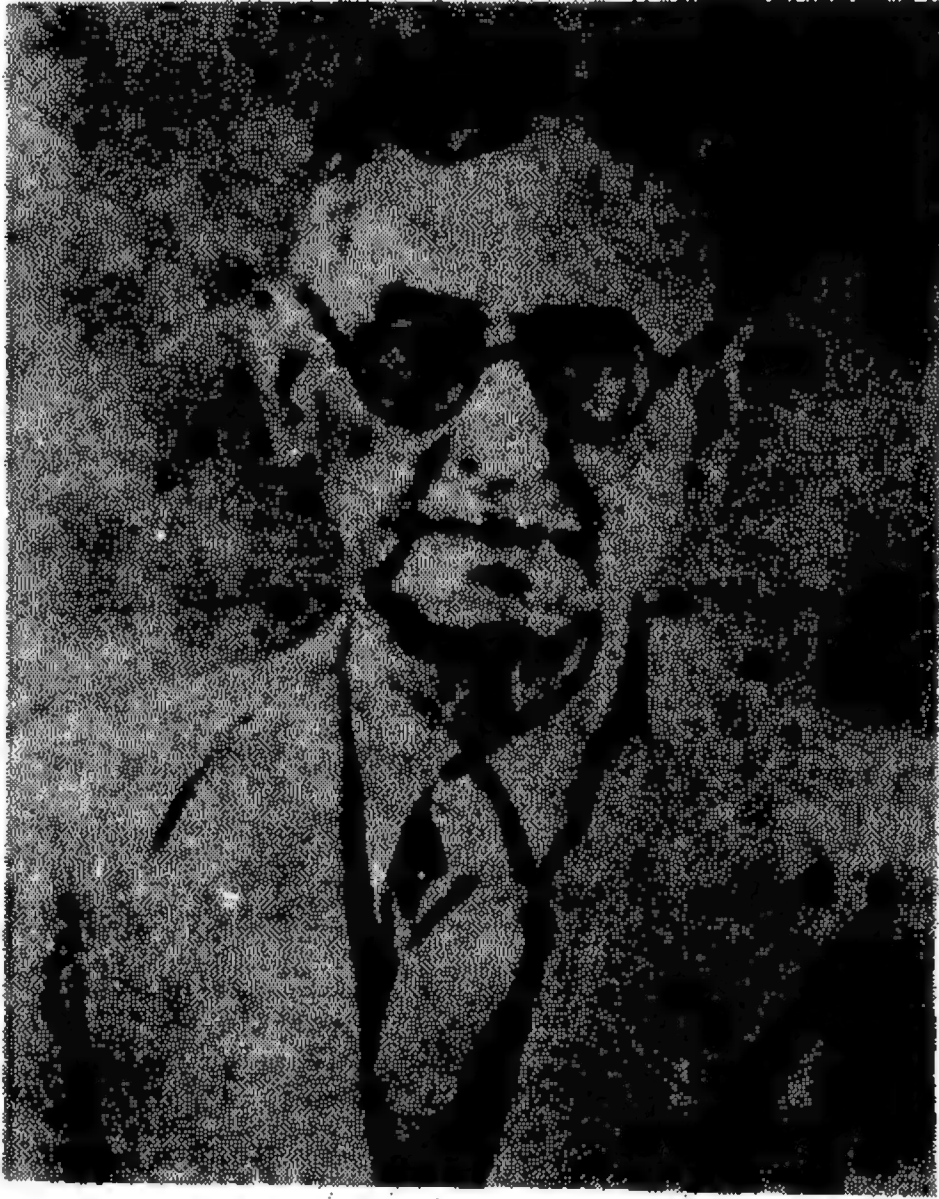
(۱) ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان

میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی  
نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے

عام استعمال میں ہوں۔ (۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی  
کیاب اور نفیس کتابوں کی تلاش کر کر ہم پہنچانا اور چھاپنا  
سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار ہوگا۔“

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر





## سجاد حیدر یلدرم

۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا پھر ترکی میں غیر  
بکرعے آہ دیں ترکی قلم یلدرم (بمعنی بجلی) رکھا اور ترکی  
زبان کے چند شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ دبئی پر  
یوپی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار  
رہے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے  
ایک خاص طرز تحریر کی بنیاد ڈالی اور اردو ادب میں ایک  
نیا تصور، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی زندگی منتقل کی۔

انتخاب کیا جاوے گا ان کی تاریخ ہندوستان سے۔ (۱۴)  
مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین جو تالیف کی جاوے گی  
تاریخ عرب و اسپین مصنفہ کانڈ صاحب اور اسپین کے

اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۷۲ء، ۱۵۳

د قانون سوسائٹی میں ۱۱

سوسائٹی کی مطبوعات: سائیلیک سوسائٹی نے  
جن کتابوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا یا جو اس کے اشاعتی پروگرام  
میں شامل تھیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) ایک مختصر رسالہ سال ۱۱۰۰ میں یورپ کے علوم و فنون  
کے جو ماہر صاحب کے خزانہ علم میں سے تالیف کیا جاوے گا۔  
(۲) پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب آرم اسٹیم صاحب  
کی کتاب کا جو قلوب کی ترقی دولت کے بیان میں ہے۔  
(۳) تاریخ ہندوستان مؤلفہ انٹرنیشنل صاحب (۴) رسالہ  
سچاپ کی گلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلیو جے ایم کورن رین  
کائن صاحب (۵) تاریخ جدید ہندوستان مؤلفہ مارٹین  
صاحب (۶) ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ جو کئی انگریزی جغرافیہ  
سے تالیف کیا جاوے گا۔ (۷) رسالہ یورپ کے آلات کشمکاری  
کے بیان میں جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جاوے گا۔

(۸) تاریخ چین زبان فارسی مترجمہ محمد زماں عرف فرنگی خاں اہل  
انگریزی مصنفہ ایک پادری صاحب کی جس میں بیان ہے چین  
کی صورت اور پیداوار بول اور علوم اور فنون اور مذہب  
اور رسومات سلطنت مورخہ چھٹی صدی (۹) ایک کتاب  
بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے  
نام ہوں گے اور مصنفوں کے نام اور تاریخ تصنیف اور  
نام زبان جس میں وہ کتاب ہوا اور کچھ کیفیت اس کے مضمون  
کی اور ان لوگوں کے نام جن کے کتب خانہ میں وہ ہوں۔

(۱۰) رسالہ اثر کربائی جس میں علمی اور علمی دونوں مذکور  
ہیں مع بہت سی تصویروں کے مصنفہ بیکول صاحب۔  
(۱۱) رسالہ حیالوجی یعنی اس علم کا جس میں انقلابات زمین  
کا بیان ہے مع بہت سی تصویروں کے۔ مصنفہ جان ٹلیس  
صاحب۔ (۱۲) تاریخ ایران مصنفہ سر جان مالکوم صاحب  
(۱۳) تاریخ بھوپال مصنفہ سر جان مالکوم صاحب جس کا

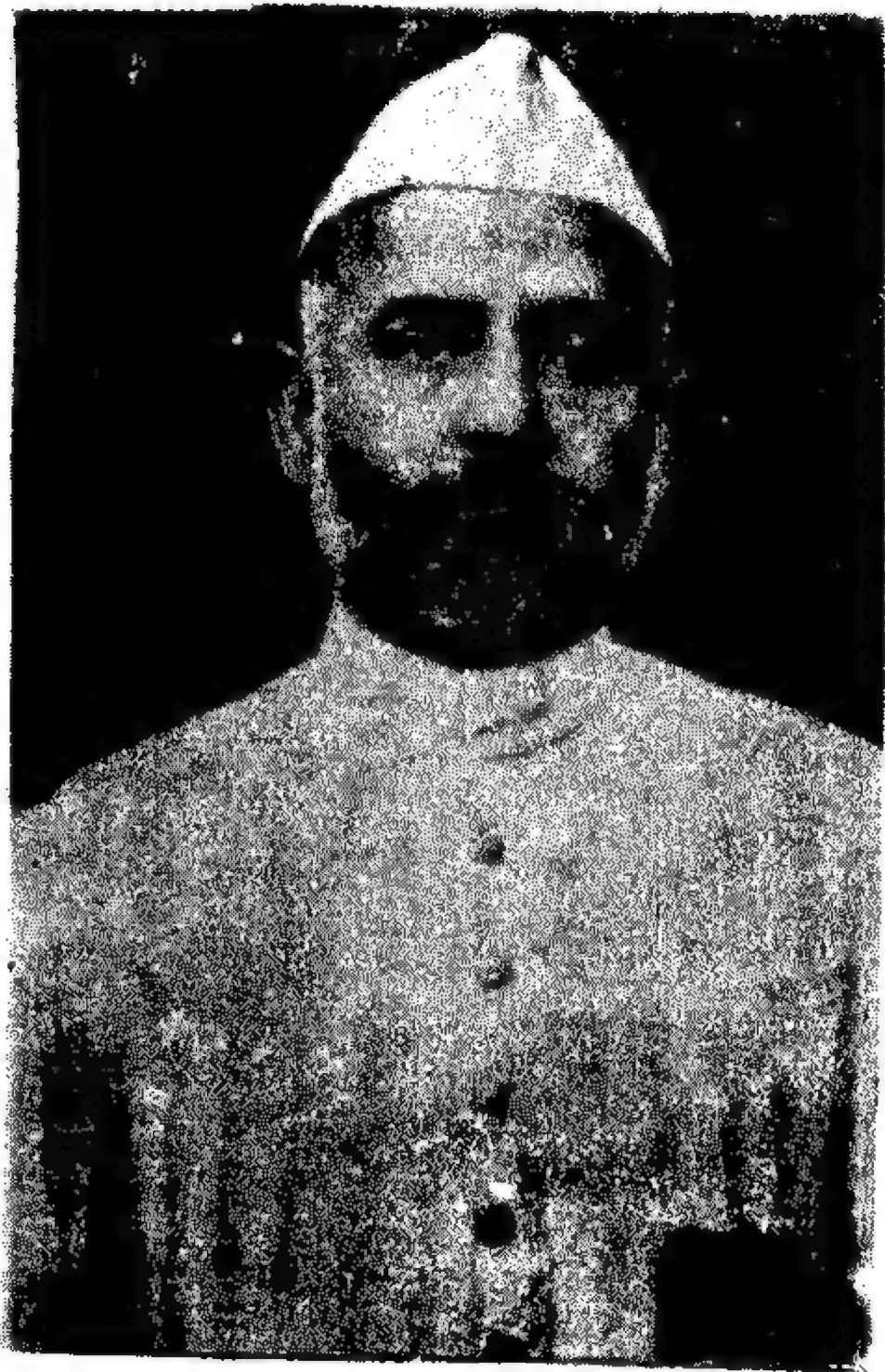
ایگزٹہ مسلم یونیورسٹی نمبر

فصل (۲۰) ڈاٹلی صاحب کی کتاب منطق (۲۱) احمد در سالہ  
حکمت قدرت کے دلی صاحب کے سلسلہ میں سے (۲۲)  
جنرل کنگم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جواہروں نے  
صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں ۲۳ رسالہ ہیئت یا  
کئی دنیاؤں کا ثبوت مصنف دی دل صاحب (۲۴) رسالہ  
بہاروں کی شہادت مصنف مر صاحب (۲۵) بکل صاحب  
کی دوسری جلد کا چھٹا باب جس میں نتیجے نکالنے کی حکمت کی  
علمت کا بیان ہے (۲۶) میکس مر صاحب کی کتابیں در باب  
علم منسکرت (۲۷) مواظہ سکندر مصنف ارسلو (۲۸)  
پولٹیکل اکونومی یعنی انتظام مدین مصنف سینیر صاحب (۲۹)  
روبن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان میں شامل  
حصہ جو ابتدائے قدیم ہونے سلطنتوں یونان سے اس زمانہ  
تک جب کہ یونان میں علوم و فنون میں مشہور مشہور لوگ ہوئے  
علاوہ انہیں اس کا دوسرا حصہ اور تیسرا حصہ۔  
(۳۰) رسالہ علم فلاحات یعنی کشکاری مصنف رابرٹ  
اسکاٹ برن صاحب (۳۱) رسالہ نیچرل فلاسفی مصنف چارلس  
ٹالمنسن (۳۲) رسالہ علم و آب و ہوا مصنف چارلس ٹالمنسن  
(۳۳) رسالہ جبرقیل مصنف چارلس ٹالمنسن (۳۴) رسالہ در  
علم قوت برقی مصنف چارلس ٹالمنسن (۳۵) سینیر پولٹیکل  
اکونومی (۳۶) اصول سیاست مدین۔ مقالہ اول جواہر سٹوڈنٹل  
مترجمہ پنڈت رحیم نرائن دہلوی۔ (۳۷) تاریخ ایران  
دچار حصے) سر جان مالکم۔

مولوی عبداللطیف خان بہادر (کلکتہ) نے ۸ جنوری  
۱۹۶۵ء کے ایک خط میں مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے شائع  
کرنے کی تجویز پیش کی۔

(۱) رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی جواہر صاحب کے  
دائرہ علوم میں سے لئے جادوی (۲) ہیولٹ صاحب کی

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی خیبر



سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں  
رحم علی گڑھ مسلم کالج کے ایک ہونہار طالب علم  
تھے

عربوں کی تاریخ مصنف شیخ ابی العباس المقری اور  
تاریخ اسپین مصنف کالی کٹ — میں سے۔ (۵۵)  
رسالہ علم فلاحات یعنی کشکاری مصنف لائی صاحب (۱۶)  
تاریخ اسکندر اعظم مصنف ایرین صاحب (۱۷) مغلیہ دربار  
کا بیان مصنف برنیر صاحب (۱۸) رسالہ علم طبعیات جو  
نہایت پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنف جے جے گریفن  
صاحب (۱۹) کلک صاحب کے آخر نسخہ کی چوتھی اور پانچویں





ایک یادگار تصویر (ناموران ایم اے ادکاج)

دائیں سے بائیں: بلائے لہو مولانا عبدالحق مرحوم

ڈاکٹر ذکریا رحیم مرحوم اور خواجہ عبدالحق مرحوم

زیادہ بڑھ گیا ہے اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کو اس میں کسی بڑے آرٹیکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا مگر تعلیم کے متعلق یا عام اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی ہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا وہ ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اس میں سوشل اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ ایک خاص دھڑ جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں سے کبھی کسی قوم یا فرقہ کسی خاص شخص کی دلانازی روا نہیں رکھی۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔

اردو ڈائجسٹ ہماگست ۱۵۵

سیاحی کے حالات اور نیز حالات سیاحی کسی اور مصنف کے (۳) رابرٹ سن اور برنسٹ صاحب کار سالہ در باب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے (۴) تاریخ خلفاء عباسیہ (۵) کلیک صاحب کی تاریخ انگلستان (۶) رسالہ در باب ترکیب اور انتظام سلطنت انگریزی (۷) رسالہ در باب مرکز ریل (۸) ایک برائیں صاحب کار سالہ در باب فن فائیک گرائی یعنی سورج کے عکس سے تصویر کھینچنے کا فن (۹) رسالہ در باب امریکہ کی ترکیب اور انتظام سلطنت موجودہ کے (۱۰) تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان (۱۱) حیات نامے مشہور مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام سے مشہور ہے (۱۲) انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سنگ اور اشعار سنگ سے متعلق ہے (۱۳) کانٹ صاحب کار سالہ در باب ترکیب جسم انسانی کے (۱۴) ڈاکٹر اے کانٹ صاحب کی طبیعات متعلقہ تندرستی اور تعلیم (۱۵) ڈاکٹر سوئٹزر کار سالہ در باب سلامتی عقل (۱۶) ہرلٹ صاحب کار سالہ در باب حقوق انسانی اور ان حقوق کی حفاظتوں ملکی کے (۱۷) ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کار سالہ در باب تاربتی کے (۱۸) سمی یا پیپر صاحب کار سالہ استعمال بجلی متعلقہ ممتہ کرنے کے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار: ۱۸۶۶ء میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے آخر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ پھر مہینہ میں دو بار نکلتے لگا۔ اس اخبار کا ایڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے آخر تک سوائے ان ایام کے جبکہ سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لبریری



سوسائٹی کا کتب خانہ: یہ اس بات کے رپورٹ کرنے سے بھی رضا مندی ہوتی ہے کہ کتابوں کا واسطے سوسائٹی کے خریدنا شروع ہو گیا ہے اور ایک عمدہ ذخیرہ ان کا فراہم ہوتا جاتا ہے چنانچہ جس قدر کتابیں خرید کی گئی ہیں یا لوگوں نے بطور نذر کے سوسائٹی کو دی ہیں ان سب کی فہرست مرتب ہوئی ہے اور آئندہ کو مشہر کی جادے گی۔ منجملہ ان کے سید احمد خاں نے جو نذر کی ہیں وہ قیمتی چھ سو روپیہ کی ہیں۔

(رداء نمبر ۲۸۱، جنوری ۱۹۶۵ء ص ۱۹)

سوسائٹی اور زراعت کے طریقوں کی اصلاح:- سر سید پیداوار بڑھانے کے لئے زراعت کے طریقوں میں اصلاح کو از بس ضروری سمجھتے تھے اور اس کام کو انہوں نے سوسائٹی کے سب سے اہم کاموں میں رکھا۔ علی گڑھ اور کانپور میں متعدد خطوط ہیں جو اس سلسلہ میں ان کی مساعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ۱۶ اگست ۱۸۶۱ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

علم فلاح کا ہم ہندوستانوں میں بالکل معدوم ہو گیا ہے زمیندار انہیں اصول پر کاشت کرتے آتے ہیں جو ہزاروں برس ہوئے کہ ان کے باپ و دادا کے استعمال کرتے تھے اور ان قبائل سے جو نامناسب ترڑ اور برے موسموں اور ان بری رسموں سے کہ زمین کو کچھ فرصت نہیں دیتے اور فصل در فصل چین کر دیتے ہیں جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہیں اور نئے نئے طریقے جو ترقی زراعت کے لئے یورپ میں ایجاد ہوئے ہیں اور نئی نئی کلیں جو یورپ میں لگائی گئی ہیں اور جس سے زراعت کا کاروبار میں بہت آسانی ہو گئی ہے ہندوستانی ان سے مطلق پرہیز نہیں رکھتے۔ اگر ان کا رواج دیا جائے اور ہندوستانی بھی علم فلاح سے جو یورپ میں ایجاد ہوئے اور ان مفید کون

ایگزٹو مسلم یونیورسٹی نمبر

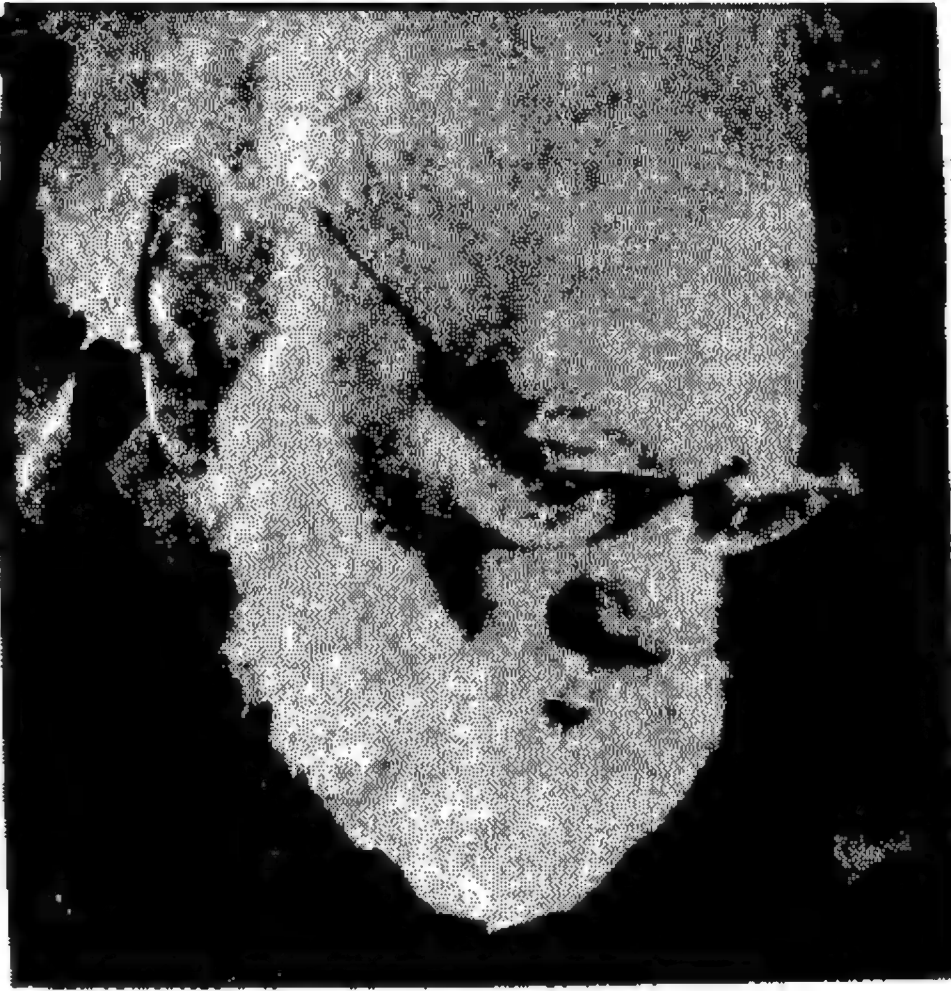


### پروفیسر محمد حبیب محمد

پروفیسر محمد حبیب یکم نومبر ۱۸۹۲ء کو بکھنویں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور کالج اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی مسلم یونیورسٹی کی ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۰ء تک ۲۸ سال خدمت کرتے رہے۔ اور ۲۲ جون ۱۹۴۰ء کو ۸ بجے شب کو انتقال کیا۔ اور یونیورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ہندو مسلمانوں کے درمیان جھگڑوں سے وہ ہمیشہ تعلق رہا اور کبھی کبھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ تین برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا۔ (حیات جاوید ص ۱۳۲ - ۱۲۸)

۱۵۶ ادوڈائجسٹ، ۶ اگست ۱۹۶۲ء



## ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم

۱۸۷۴ء میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں علیگڑھ سے بی۔ اے پاس کیا اور دیس برسید اور مولانا حالی سے محبتیں ہیں پھر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدرآباد کنٹرول میں علامہ عثمانیہ کے صدر شعبہ اذد مقرر ہوئے پچاس سال تک انجمن ترقی اذد کے سیکریٹری رہے ۱۹۲۵ء میں انجمن کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کیا اور اپنی تمام عمر اردو کی خدمت میں گزاری۔

کے سوانح اور طرح بہ طرح کی بازگیریاں اور عجیب عجیب طرح کی آرائشیں بہت ہی خوبصورت اور خوشنما دکھائی دیتی ہیں اور سچ دن کیسی روشنی ہے جس میں وہ سب چیزیں پھیل کر پڑ جاتی ہیں سچ ایک ابدار موتی کی مانند ہے جو دن میں بھی نہایت خوب دکھائی دیتا ہے پر ہیر اور شب چراغ نہیں جو صرف رات ہی کو روشنی میں جگمگاتا ہے یہی سبب ہے کہ جھوٹ سے ہمیشہ لطف زیادہ ہو جاتا ہے بے فائدہ دل خوش رہتا ہے۔ کیا اس میں کچھ شک ہے کہ اگر آدمیوں کے دلوں میں سے بے ہودہ خیالات اور جھوٹ

سے واقف ہوں تو کچھ شبہ نہیں کہ بندہ یہ ترقی پیداوار زمین کے ہندوستان کی دولت کو بھی بہت ترقی ہو۔

یہ بات سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین کثرت پیداواری میں ملکوں میں مشہور ہے لیکن اگر اس عمدہ زمین میں کاشتکاری علمی قاعدہ سے ہو تو اور زیادہ ترقی ہوتی تصور ہے۔ بہت سی اجناس ہندوستان کی پیداواری کی ایسی ہیں جو اور ملکوں کی اجناس کے مقابلہ میں ناقص اور بری ہیں لیکن اگر یہاں کے کاشتکار علم فلاحیت کی تمام شاخوں سے واقف ہوں تو بلا شبہ یہاں کی اجناس پیداوار بھی اور ملکوں کی اجناس پر سبقت دے گا۔ یہ بات ہمیشہ ہوتی ہے کہ اگر کسی ملک میں کوئی جنس اچھی پیدا نہیں ہوتی تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہاں کی زمین اس جنس کے لائق نہیں ہے۔ یہ بات کسی قدر سچ ہو مگر اس کے ساتھ بلاشبہ یہ بات بھی ہوتی ہے کہ ناقص جنس کا پیدا ہونا اکثر بہ سبب ناواقفیت فن زراعت کے ہوتا ہے۔

(رویداد نمبر ۶ ص ۱۰-۹)

## سائنٹیفک سوسائٹی کا اخلاقی نصب العین

سچائی:۔ لوگ سچ کو غلام میں مانتے ہیں اچھا کہتے ہیں پر بڑبڑتے نہیں اچھا جانتے ہیں پر بڑبڑتے نہیں۔ سچ کو پوچھتے ہیں پر سنتے نہیں۔ ہزاروں ہیں جو تلون مزاجی سے خوش ہیں سچ پر قائم نہیں رہتے۔ اپنے خیالات کو اپنے افعال کو سچ کا پابند نہیں رکھتے۔ سچ کے ڈھونڈنے میں کچھ محنت مشقت نہیں۔ سچ میں کچھ دھوکا نہیں۔ جو آدمی اسے چھوڑے اور جھوٹ کو پکڑے مگر ایک جلی حادث ہے کہ آدمی کو خود بخود جھوٹ بولنے کا مزہ ہوتا ہے۔ بے غصہ علمبروں نے اس کی تحقیقات کی اور حیرانی میں رہے کہ جھوٹ سے آدمی کو نہ شاعرانہ خوشی ہوتی ہے نہ سوداگرانہ فائدہ ملتا ہے پھر وہ کیوں جھوٹ بولتے ہیں۔

مگر سب اس کا یہ ہے کہ سچ کی نسبت جھوٹ زیادہ پُر رونق معلوم ہوتا ہے۔ وہ شمع کیسی روشنی ہے جس میں رنگ برنگ





دین کالج کی چند استانیات اور طالبات کالج کے احاطہ میں۔ آج کی مسلم یونیورسٹی میں عبداللہ ہال اور سرد جینی ٹائڈ ہال طالبات کے لئے مخصوص ہیں

سچ کا جانتا جس سے اس کا وجود ثابت ہوتا ہے اور سچ کو مان لینا جس سے اس کا برتاؤ ہوتا ہے انسان کی عمدہ ترین صفاتوں میں سے ہے۔

ایک شاعر نے کیا اچھا کہا کہ سمندر کے کنارے پر کھڑا ہو جہاز کو سمندر میں چلتا دیکھنا خوشی کی بات ہے قلعہ کے جھوڑوں میں سے معرکہ کارزار کو دیکھنا خوشی کی بات ہے مگر سچ کی اچھی اور اونچی خوش ہوا زمین پر کھڑے ہو کر جھوٹ کی نیچان کی خرابیوں اور آندھنیوں کی گرد و غبار کے دیکھنے کے برابر کوئی خوشی کی بات نہیں مگر ہمیشہ یہ تماشا عبرت کی نگاہ سے دیکھا جائے نہ غرور نہ تکبر سے کچھ شک نہیں کہ آدمی کے دل میں نیک باتوں کا دلوں ہونا اور سچ کے جھوٹے میں جھوٹا دنیا ہی میں بہشت ہے۔

عارفانہ اور حکیمانہ سچ سے درگزر و اور دنیا دارانہ سچ

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر

موت کا تشخص اور جھوٹی شہنشی نکل جائے تو ان کے دل افسردہ اور ان دلوں کا دلوں پر مردہ نہ ہو جائے گا۔ بعض نیک لوگوں نے شاعری کو بھی برا کہا ہے اس سے بھی ہمارے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں اور وہ سب جھوٹ کے پتے ہوتے ہیں مگر اس جھوٹ سے جو صرف خیال میں ہو کر گزر جاتا ہے کچھ نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس سے نقصان ہوتا ہے جو دل میں بیٹھ جاتا ہے یا دوسرے کے دل میں بٹھایا جاتا ہے۔

جھوٹ کیسا ہی خوشنما دکھائی دیتا ہو اور لوگوں کے دلوں کو کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن سچ یہ ہے کہ سچ کی خوبی خود اس کی ذات سے عیاں ہے۔ سچ از خود یہ بات سکھاتا ہے کہ سچ کی تحقیقات کرنا جس سے اس کا عشق ظاہر ہوتا ہے اور



ہناؤ تو بھی ظاہر ہو گا کہ دنیا کے کاموں میں بھی سچ سچ سہمدہ بات ہے۔ جو لوگ سچ کو نہیں برتتے وہ بھی کہتے ہیں کہ صاف معاملہ اور کھرا مین دین آدمی کی عزت ہے۔ دنیا کے کاروبار میں جھوٹ کا ملاؤ چاندی سونے میں تلے کے کا سا ملاؤ ہے کہ گو وہ مل جاتا ہے پر چاندی سونا کھوٹا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ پیسے در پیسے سانپ کیسی نکیریں ہیں جو نہایت ذلت سے پیٹ کے بل رینگتا ہے پر پاؤں کے بل نہیں چلتا۔ جھوٹ اور فریب سے زیادہ کوئی بری چیز نہیں جس سے انجام کو آدمی حد سے زیادہ شرمندہ ہو جھوٹ بولنے والا بے شک خدا سے نڈر اور آدمیوں سے خوفناک ہوتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ خدا سے تو نہیں چھپتا ہاں آدمیوں سے چھپ سکتا ہے۔ پھر کیا یہ عقل کی بات ہے کہ آدمی خدا سے تو نہ ڈرے اور انسانوں کا ڈر کرے۔

بہت لوگ کہتے ہیں کہ سچ سے آدمی کا اکثر نقصان ہوتا ہے اس لئے لاچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے مگر ایک بڑی غلطی

ہے وہ شخص ابتدا ہی سے سچ کو نہیں برتا اور یہ سہلی رنم کے جھوٹ ظاہر ہونے سے نقصان اٹھاتا ہے اور غلطی سے سمجھتا ہے کہ میں نے پچھلے سچ کے سبب نقصان اٹھایا۔ اگر کوئی ایک جھوٹے تمسک پر گواہی کرے اور پھر سچ کہے کہ میں نے جھوٹی گواہی کی ہے اور بالفرض اس کو کچھ مضرت پہنچی تو سچ سے مضرت نہیں پہنچی بلکہ اس پہلے جھوٹ نے نقصان پہنچایا۔

اگر آدمی یہ عہد کرے کہ میں سب گناہ کر دوں گا مگر جھوٹ نہیں بولے گا تو اس سے از خود سب گناہ جھوٹ جاتے ہیں، چوری کرتے وقت، جوا کھیلنے وقت اس کو خیال ہو گا کہ اگر کسی نے پوچھا تو سچ کہنا پڑے گا اور شرمندگی یا ذلت یا سزا اٹھانی ہو گی پس وہ سچ ہی اس کو ہر قسم کی برائی کرنے سے روکتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ تمام گناہوں کی اماں اور سچ تمام برائیوں کا علاج ہے۔ ماستی موجب رضا میرے خداست

مسلم یونیورسٹی کے جملہ متفقین اسناد میں حصہ لینے والے کچھ اساتذہ و طلبا



کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست  
سر سید را اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۹ء (۵۱ - ۵۰)

فہرست ممبران سوسائٹی (انگریزی):۔ جے ایچ  
بیلن۔ جے ایچ بکس۔ ڈبلو جے برائی۔ ایم براؤن سرشد  
لیفٹیننٹ ایس بر دک۔ جے ڈبلو کلائیو۔ ڈبلو گولڈسٹون  
اے کالون۔ ایف کوپر۔ لیفٹیننٹ کریگی۔ سی ڈانیل۔  
آر ایم ایڈورڈس۔ سی اے ایلٹ۔ جی فائتم۔ ڈبلو  
اے فارس۔ لیفٹیننٹ جے ایف آئی گریہم۔ لیفٹیننٹ  
اے ڈبلو گریہم۔ کرنل جی ڈبلو سملٹن۔ ڈبلو آر ایم ہال ایڈ  
ڈبلو اے ہیو۔ اے ادمیوم۔ کرنل اے لیک۔  
کرنل آر میگلن۔ ایف ڈی مکسورڈ جی پی منی۔ آر منی۔  
اے مانینگو۔ کرنل آر مارلس۔ ڈبلو میور۔ جی پامر۔  
ایف بی پیرن۔ جے ایچ پرنسپ۔ جی لیچ کرس۔ اے  
اے رابرٹس۔ بی سپٹ۔ اے ٹیکسیر۔ ڈی سمن۔  
جے سمن۔ آر سمن۔ جے ایم سی سن بلٹ۔ جان  
اسٹریچی۔ جی ڈی ٹرنبل۔ ڈبلو این ٹرنر۔ میجر آر ویڈنگٹن۔

سعد آباد۔ محمد احمد علی خاں رئیس بوڑھانسی۔ بابو  
ایشر چندر رئیس کول۔ چودھری اصغر علی رئیس کھیرہ ضلع  
بدایوں۔ محمد الطاف احمد رئیس بریلی۔ مولوی ابوالقاسم  
عبدالحکیم کلکتہ۔

ب:۔ رائے بختاور سنگھ صدر امین بدایوں۔  
رائے بدایون بخش ڈپٹی کلکٹر غازی پور۔ شیخ برکت علی  
منصف بانس گلو۔ منشی بخش علی سررشتہ دار غازی پور۔  
منشی بندہ پر شاد انسپکٹر پولیس غازی پور۔ منشی باجوعل  
کان پور۔ موتی بہاری محل منصف فرخ آباد۔ رائے  
بشمبر سہائے تحصیلدار ہاپور۔ لالہ بدری پر شاد محل علی گڑھ  
لالہ بنارسی داس لکھنؤ۔ منشی بنایک پر شاد سررشتہ دار  
لکھنؤ۔ سید باسط علی رئیس جلالی۔

پ:۔ راجہ پرتاپ سنگھ۔ بابو سیاری موہن بانرجی  
بنارس۔

ت:۔ سید تراب علی ڈپٹی کلکٹر بدایوں۔ تقی علی خاں  
دریا بار۔

ٹ:۔ شاہ کرم پندت غازی پور۔ راجہ ٹیکم  
سنگھ بہادر۔

ث:۔ منشی ثناء اللہ سررشتہ دار بریلی۔  
ج:۔ راجہ جے کشن داس۔ لالہ جگت نراین وکیل  
غازی پور۔ پندت جانی پر شاد تحصیلدار پٹنی۔  
چ:۔ منشی جی لال بنارس۔ بابو چندر شیکر بدایوں  
ح:۔ نواب محمد حسن خاں سنواری۔ منشی حافظ علی خاں  
تحصیلدار باندا۔ مولوی محمد حبیب اللہ خاں مرزا پور۔ نواب  
حمزہ علی خاں شیخ پورہ۔ شیخ حفیظ الدین حیدر وکیل مرزا پور  
۔ مولوی حیدر حسین وکیل آگرہ۔ مولوی محمد حفیظ الدین  
منصف کول۔ محمد حرمت علی خاں پندرادل۔

خ:۔ مولوی خورشید علی خاں صدر الصدور الہ آباد  
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

منہ و ستانی:۔ الف۔ جہا راجہ ایسری پر شاد نرائن  
سنگھ کاشی نریش۔ نواب محمد امین اللہ خاں۔ منشی  
احمد حسین تحصیلدار سیونڈا ضلع باندا۔ منشی الطاف حسین  
میرٹھ۔ مولوی سید امداد علی ڈپٹی کلکٹر مراد آباد۔ شاہ  
اسد علی وکیل آگرہ۔ منشی امجد علی خاں امرہ۔ سید  
احمد خاں علی گڑھ۔ مولوی امجد علی وکیل آگرہ۔ منشی  
امام الدین تحصیلدار مراد آباد۔ مولوی امانت اللہ  
غازی پور۔ لالہ اجودھیا پر شاد منصف مرزا پور۔ مولوی  
محمد امرا اللہ وکیل آگرہ۔ محمد امداد علی تعلقہ دار پچاسو۔  
محمد آغا جان انسپکٹر زیرہ دہن۔ محمد ارشاد علی خاں رئیس

۲:- راجہ دیو نرائن سنگھ بنارس۔ ڈاکٹر درمی  
نعل تیماری کا پور۔ مولوی وحید الدین ٹیپو ہسپتال  
بست چہار برگہ۔ چوبے دھنت رائے ڈپٹی کلکٹر آگرہ۔  
دلیل الدین احمد اسپیکر غازی پور۔ بابو درگا پرشاد  
دکیل علی گڑھ۔ لالہ دھنی رام ہاتھرس۔ بابو دھنا  
نارائن سکریٹری انجمن اوردھ۔

۳:- مہاراجہ ڈل مجے سنگھ بگرام پور۔

۴:- سید ذاکر حسین منصف ہاتھرس

۵:- منشی رام غلام سنگھ تحصیلدار غازی پور۔

پنڈت رادھا کشن تحصیلدار دھام پور۔ منشی رام ملادا

دکیل پور تھلہ۔ بابو رام کال چودھری منصف بلیا۔

بابو روپ چند گھوش بیسا۔ منشی رکھناتھ سہلے منصف

۶:- مولوی زین العابدین منصف محمد آباد۔

۷:- مولوی سمیع اللہ خاں دکیل آگرہ۔ بابو

سویجک سنگھ غازی پور۔ سید علی خاں بنارس۔ مولوی

سراج حسین مہوبا۔ سر سید محمد تحصیلدار سکندرہ راول۔

— مولوی سلطان حسن منصف کیر۔

۸:- لالہ شیو بالک سنگھ غازی پور۔ رائے

شکر داس منصف امدھ۔ لالہ شیو امرعل دکیل غازی پور۔

بابو شیو پرشاد بنارس۔ بابو شنبو ناتھ پوسٹ ماسٹر اد آباد

شیخ شرف الدین ہسپتال بدایون۔

۹:- صفات احمد خاں غازی پور۔

۱۰:- نواب ضیاء الدین احمد خاں۔

۱۱:- منشی طالع چند پرشاد تحصیلدار رملہ۔

۱۲:- سید ظہور حسین دکیل آگرہ۔ قاضی ظہور الحق

غازی پور۔

۱۳:- مولوی عبداللطیف خاں بہادر۔ مولوی عبدالماجد

غازی پور۔ منشی علی حسن تحصیلدار بنارس۔ نواب علی رضا

ملیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر

خاں قزلباش لاہور۔ قاضی عزیز الحق غازی پور۔ شیخ عبدالمجید

غازی پور۔ منشی سید علی نقی غازی پور۔ منشی سید علی

حسین پر تاب گڑھ۔ قاضی علی اکبر دکیل غازی پور۔ مولوی

محمد عبدالقیوم منصف الہ آباد۔ نواب عبدالعلی خاں رئیس بنگلہ

۔ مولوی عبدالستار دکیل آگرہ۔ قاضی عنایت حسین صدر

الصدر فتح گڑھ۔ مرزا عباس بیگ اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ۔

قاضی محمد عباس مراد آباد۔ محمد عنایت اللہ خاں تعلقہ دار

بھیکم پور۔ منشی محمد عبدالعزیز سررشتہ دار علی گڑھ۔ مولوی

عبداللہ عبیدی مدرس ہوگی۔

۱۴:- محمد غلام حیدر خاں پیش کار کول۔ شیخ غلام

حسین سربراہ کار۔

۱۵:- فیض احمد خاں رئیس دتاولی۔ شاہ فرید عالم

غازی پور۔ مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج۔ مولوی

سید فرید الدین دکیل آگرہ۔ سید فضل حق دکیل علی گڑھ

قاضی فضل احمد تحصیلدار میرٹھ۔

۱۶:- شیخ محمد قطب الدین بریلی۔ مولوی سید قادر

علی تحصیلدار تگینہ۔

۱۷:- مولوی محمد کریم بخش ڈپٹی کلکٹر ملت پور۔

بابو کاشی ناتھ بسواس منصف سید پور۔ بابو کالی پرشاد

سنگھ کلکتہ۔ مولوی سید کرامت علی امام باڑہ ہنگی۔ منشی کاشی

پرشاد سررشتہ دار غازی پور۔ منشی کالی چرن سررشتہ دار

مرزا پور۔ پنڈت کالکا پرشاد تحصیلدار گنور۔ بابو گینو

رائے غازی پور۔ سید محمد کمال الدین حسین تحصیلدار

دلیل نگر۔ رائے کرن سنگھ بروہی۔ منشی کنہیا لعل

منصف ایڈ۔ منشی محمد کرامت اللہ منصف شاہ جہاں پور

لالہ کشن سہائے میرٹھ۔

۱۸:- گ۔ سلاہ گوبی ناتھ دکیل غازی پور۔ بابو سرداس

متر بنارس۔ لالہ گلاب سنگھ دکیل مراد آباد۔ بابو گلش پرشاد

۱۹:- لالہ ڈاکٹ ہما گت ۱۶۱۶





دیسمن کالج کی طالبات کلاس روم میں

منعم بکھنور۔ منشی گورسرن داس تحصیلدار علی گڑھ۔ معمر  
گوپال سہائے منصفہ جلیسر۔ دو بے گوجر بل علی گڑھ۔  
ل۔ بابو لکھی نرائن سین غازی پور۔ بابو لکھی داس  
خلانجی غازی پور۔ قاضی محمد لطافت حسین دکیل علی گڑھ  
محمد لطف علی خاں رئیس چھتاری۔ منشی للتا پرشاد  
جوڈیشیل کشر بکھنور۔

۔ مہاراجہ ہیشتر بخش سنگھ رئیس دمرادوں۔  
شیخ محمد جان غازی پور۔ مولوی سید محمد بین ڈپٹی کلکٹر  
فرخ آباد۔ پنڈت من بھول میر منشی پنجاب۔ منشی سید

۲۱۲ اردو ڈائجسٹ مہاگست ۱۹۷۲ء

محمد حسین دکیل پٹیالہ۔ مولوی محمد عزیز مینا ضلع غازی پور۔  
مولوی محمد مظہر اللہ سر رشتہ دار بکھنور۔ مولوی محمد بخش خاں  
بہادر اگرہ۔ لالہ متوعل دکیل غازی پور۔ مولوی محمد حسن  
صدر الدین بکھنور۔ منشی مازھوعل بنارس۔ مولوی محمد حسن  
خال صدر الصدور مراد آباد۔ مولوی محمد مومن علی خاں صدر  
الصدر شاہ جہاں پور۔ رائے مان رائے دکیل اگرہ  
۔ مدد علی خاں غازی پور۔ منشی محمد مدد حسین دکیل علی  
گڑھ۔ محمد مرادان علی خاں مراد آباد۔ چوبے مومن لعل  
تحصیلدار ہاتھرس۔ محمد معشوق علی خاں تعلقہ دار چکاتھل  
مہاراجہ مان سنگھ فیض آباد۔ راجہ مازھو سنگھ ایشی۔  
شاہ کھن لال بکھنور۔ کنور معشوق علی دان پور۔ خواجہ  
محمد حسین کول لالہ متر سین ہاتھرس۔ نواب محمد علی خاں  
رام پور۔ مولوی ہمدی علی خاں تحصیلدار اٹاوا۔ میونسپل  
کیشن بریلی۔ لالہ منوعل دکیل علی گڑھ۔

ن۔ منشی نجم الدین حیدر تحصیلدار اگرہ۔ مولوی  
محمد نجم الدین ڈپٹی انسپکٹر میرٹھ۔ دیوان نہال چند دکیل  
جمو۔ سردار نہال سنگھ چھاچھی لاہور۔ منشی سید نصیر علی  
تحصیلدار باغپت۔ رائے نرائن داس بنارس۔ منشی  
نواب رائے منصف داتا گنج بدایون۔ سید ناصر علی خاں  
بہادر ذوالقدر الہ آباد۔ پنڈت نند کشور تحصیلدار سنہیل۔  
حکیم نصیر الدین تحصیلدار جوں پور۔ محمد نظام علی خاں  
انسپکٹر پولیس کول۔ بخش نند کشور رئیس ہاتھرس۔ محمد  
نصرت خاں رئیس سومیرہ۔ منشی نول کشور مالک مطبع بکھنور۔  
و۔ کنور دزیر علی خاں ڈپٹی کلکٹر میرٹھ۔

۸۔ لالہ ہریش لعل دکیل غازی پور۔ بابو ہران  
چندر غازی پور۔ منشی ہنومان پرشاد دکیل اگرہ۔  
لالہ ہوتی لعل ہاتھرس۔ راؤ ہندو پت جاگیردار علی گڑھ۔

●●  
ملکڑہ مسلم یونیورسٹی پور

# نواب منزل اللہ خاں کو یونیورسٹی کے متعلق ایک خط

نواب چیمٹاری کی ڈائریکٹری کا  
ایک دور رس

نواب فاضل محمد احمد سعید خاں صاحب آٹ چیمٹاری موجودہ چانسلر اپنی ڈائری "یاد ایام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ — ایک روز مسٹر میکوی سے علی گڑھ کا ذکر آیا تو یہ معلوم ہو کر قلق ہوا کہ ان کی رائے میں علی گڑھ کے لوگوں کا معیار ریافت بہت ہی کم تھا۔ یہ حضرت یوپی گورنمنٹ کے ناظم تعلیمات تھے اور ملازمتوں کے امتحانات کے موقع پر یہ یا ان کا نمائندہ ہر بورڈ پر ہوتا تھا میں نے اس گفتگو سے متاثر ہو کر ایک نوٹ دائس چانسلر کو بھیجا۔ نواب منزل اللہ مرحوم اس زمانہ میں عارضی دائس چانسلر تھے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میٹرک کے بعد اساتذہ کا ایک بورڈ مقرر ہو جو طلباء اور ان کے والدین کو مشورہ دے کہ لڑکے کی آئندہ تعلیم کس نوعیت کی ہو آ یا اسے کسی خاص شعبہ کے واسطے تیار کرنا مناسب ہو گا، یا لڑکے میں مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے کی صلاحیت ہے یا نہیں وغیرہ۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ایسا کرنا مفید ہو گا تاکہ لڑکے اپنی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق ایسی تعلیم پاسکیں جو ان کے مستقبل کی ضمانت کر سکے ورنہ یہ حالت موجودہ کسی تین معنایں میں بی۔ اے کرنے کے جہد بے روزگاری کا شکار ہوتے ہیں اور مولانا حالی مرحوم کے اس شعر کا مصداق بن جاتے ہیں۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کیا کر :- وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

اب یہ کافی نہیں ہے کہ تعلیم دی جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم علیٰ ضروریات کے لحاظ سے ایک منظم پروگرام کے مطابق ہو۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کی ہر شعبہ میں ضرورت ہے مثلاً یہ کافی نہیں کہ زراعت کو ترقی دی جائے بلکہ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ نیشکر کتنی ہو اور گیہوں کتنا، دہلی کتنی ہو اور مٹھا کو کتنا۔ اسی طرح صنعت و حرفت میں یہ کافی نہیں کہ صنعت کو ترقی دی جائے بلکہ کپڑے کے کارخانے اتنے اور جو تانبہ اس کے اس قدر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی منصوبہ بندی تعلیم کے واسطے بھی ضروری ہے کہ ہر شعبہ کے واسطے منتخب اور موزوں نوجوان دستیاب ہو سکیں۔



# عہد سیرت کچھ ہندوستانی اساتذہ

۱۸۹۸ - ۱۸۷۵ء

## ایم۔ اے۔ ادا کا۔ ج۔ علیگڑھ

۱۔ ابوالحسن	اسٹر	۲۳۔ شیو شنکر	پروفیسر سنکرت
۲۔ الطاف علی	۔	۲۵۔ محمد ضیاء الدین احمد	اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی
۳۔ امجد علی	۔	۲۶۔ عبدالحق	اسٹر
۴۔ امبا پرشار	۔	۲۷۔ عبدالمجید خاں	پروفیسر فارسی
۵۔ استوش بھٹا چاری	۔	۲۸۔ عبدالحق	اسٹر
۶۔ برج موہن لال	۔	۲۹۔ مولانا عبداللہ انصاری	ناظم وینیات
۷۔ بختاورد لال	۔	۳۰۔ محمد عبدالباقی	اسٹر
۸۔ ہنس دھر	۔	۳۱۔ علی محمد خاں	۔
۹۔ بہادر علی	۔	۳۲۔ عنایت احمد	۔
۱۰۔ بندوری لال	اسسٹنٹ پروفیسر	۳۳۔ قسمر علی	۔
۱۱۔ پیارے لال	اسٹر	۳۴۔ کشن لال	۔
۱۲۔ چکرورتی جادوہین چند	پروفیسر ریاضی	۳۵۔ پنڈت کیدار ناتھ	۔
۱۳۔ چکرورتی بھوانی چندر	اسٹر	۳۶۔ گوہنڈ پرشاد	پروفیسر ریاضی
۱۴۔ خلیل احمد	پروفیسر عربی	۳۷۔ مانا پرشاد	اسٹر
۱۵۔ دانی رام	ہندی اسٹر	۳۸۔ محمد اکبر	پروفیسر عربی
۱۶۔ سید ابوطالب	اسٹر	۳۹۔ محمد سلیم	اسٹر
۱۷۔ مولانا سید جعفری	پروفیسر وینیات	۴۰۔ مولانا محمد شبلی نعمانی	پروفیسر عربی و فارسی
۱۸۔ سید حسین	اسٹر	۴۱۔ محمد علی	اسٹر
۱۹۔ مولانا سید عباس	پروفیسر شعبہ وینیات	۴۲۔ محمد خان	۔
۲۰۔ سید کرامت حسین	پروفیسر قانون	۴۳۔ رام شنکر مصرا	پروفیسر ریاضی
۲۱۔ سید عبدالباقی	اسٹر	۴۴۔ مہن لال	اسٹر
۲۲۔ سراج الدین	۔	۴۵۔ ظفر علی خاں	اسٹر فارسی
۲۳۔ شوکت حسین	۔	۴۶۔ ولایت حسین	اسٹر
		۴۷۔ ہرناتھ سنگھ	۔





از  
مولانا شوکت علی مرحوم

## علی گڑھ کے کھیلنڈروے

میں اپنے علی گڑھ کے کھیلنڈروں سے ایک مہینے کے لیے رخصت ہوا تھا، اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ مہینہ ختم ہوتے ہی پھر اس "اولڈ بوائے" پیامبر کی معرفت نزدیک اور دور کے دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ انہی سنوں گا، اپنی کہوں گا، غرض کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کی یاد تازہ کروں گا۔ وعدہ تو یہ تھا مگر آج تین مہینے بعد اس کا ایفا ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض اجنبی لوگ یہ خیال کرتے ہوں "لکھتے کیا خاک" سارا سال تو ادا دل ہی معنوں میں ختم کر دیا تھا، مگر می علی گڑھ





## تیرا ایک فن — مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تیرنے کی شق کرتے ہوئے

کامسالہ اس ۶ فٹ ۱۲ انچ کی لاش اور چھوٹے سے دل میں اس قدر جمع ہے کہ اگر کوئی طیب حاذق سستی اور کاہلی اور لکھنے سے نفرت دور کرنے کی کوئی مجرب دوا دیدیں تو روزانہ بلاناغہ ایسے مضامین برسوں لکھوں اور سال بھر بھی گاڑیوں باقی رہے۔ اصل یہ ہے کہ علی گڑھ کے محبت کرنے والے کے واسطے بڑا وسیع میدان ہے۔ دشواری اگر ہے تو یہ ہے کہ کہاں سے شروع کرے۔ ہمارا علی گڑھ ہمارا عالم خیال کا علی گڑھ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ حد درجہ دیکھتا ہوں اور ہر تو ہی تو ہے، مگر علی گڑھ کی مونسپلٹی کے حدود میں بھی ہم نے کافی اضافہ کر لیا تھا۔ اور درود اور دوسلکھنڈ سے آئیوے کیلئے تو راج گھاٹ سے شروع ہو جاتی ہے۔

بہرالا کا اسٹیشن چھوڑ کر ریل آگے بڑھی اور گنگا جی کے پل پر آئی، اس وقت بول سری گنگائی کی جے کے نعرے لگانے والوں میں ہم کھلنڈروں سے زیادہ کوئی پُر جوش نہ ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اس جگہ سے ہماری قلم و شروع ہو جاتی ہے۔ اور راج گھاٹ کا اسٹیشن مع اپنی پھر اپنی کش مکش اور اپنے جاتریوں کے انہوہ کے ہمارا چھوٹا موٹا شملہ ہے۔ وہاں سے ہی تو ہم سوکھی ڈبل روٹیاں اور بہت سا کھن سا تھ باندھ کر زندہ کی نہر کا محو بصورت آبشار دیکھنے جاتے تھے۔

نہانے والوں کی کثرت کی وجہ سے راج گھاٹ ٹوٹا، کالج میں ایک اصطلاح ہو گئی ہے۔ اور جب کبھی کانفرنس یا کسی دوسرے جلسے کی شرکت کے لیے بہت سے مہمان باہر سے آتے ہیں تو رات بڑا راج گھاٹ ٹوٹا کہنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا۔ اتروالی اور ہر دو گانچ تو گویا ٹیٹو سرکل اور عمتاز بورڈنگ ہوس کی برابر تھے۔ ایسٹ انڈین سے آئیوے کے لیے علی گڑھ کی حد ایک طرف خورجہ اور دوسری طرف ہاتھرس ہوتی تھی۔ خورجہ آیا اور دوسری طرف کیلنڈروں کی یاد شروع ہو گئی۔ مسٹر محمد مصطفیٰ خاں مرحوم، مسٹر اختر محمد خاں (ڈپٹی کلکٹر شاہجہاں پور) مسٹر سعید محمد خاں (سید) مسٹر ظفر محمد خاں (مجا) مسٹر رشید محمد خاں (ٹوٹی بابا) سب ہمیں کے رہنے والے تھے۔ اور اب مسٹر ریاض الحسن (رقا) خاص الخاص کیلنڈر وہاں براج رہا ہے۔ جب ہمارے لیے اس قدر میدان وسیع ہو تو پھر مضامین کی کیا کمی۔ پیارے کیلنڈر وہاں اس تین مہینہ میں بیکار نہیں رہا۔ تمہاری اور تمہارے عزیز اولہ بوائے کی برابر تھوڑی بہت خدمت کرتا رہا۔ اس ننھے نے بجائی کو ابتدا میں بڑے غور و پرداخت کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اب عنقریب اپنے پاؤں کے بل کھڑا ہو جائے گا۔ اور تھوڑے دنوں بعد خود ہی نہیں دوڑے گا بلکہ ہم سب کو بھی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

۱۶۶ اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۰۶ء

ساتھ لے گا اور قومی ترقی کی دوڑ میں ہمیں اٹلی جگہ دلائیگا۔  
میں اس طرح میں بہت غور سے دیکھتا تھا کہ علی گڑھ سے  
ان میں اپنی تعلقت کیلنڈروں کے بارے میں پڑھنے والے کیا  
دلے قائم کریں گے۔ ایک دوست جو مجھے بہت عزیز نہیں اور  
حضرت خورشیدی دسجے اول کے کیلنڈر سے تھے کہنے لگے کہ  
کم بہت ہے تو بتا کہ تیرے اس مضمون سے ظہار کیا اخلاقی سبق  
حاصل کریں گے۔ بھنگ کے پیالہ کی کورس کی آواز ۱۵ نمبر کے  
کمرے سے سوسائٹی تک جانا بھلا کونسا بڑا متحسن امر تھا بلکہ  
کرم حکیم بہم صاحب اڈیر مشرق جوار رو کی خدمت ایک  
زمانے سے مسلسل کر رہے ہیں۔ اور جن کے ہمارے درمیان  
ایک مشترک دوست کا بڑا رشتہ ہے۔ شکایت کرتے ہیں کہ  
لفظ "نقار" اور "کیلنڈر" غلط استعمال کیا گیا۔ اسے کیلنڈر  
مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ مثل اور بعض  
کیلنڈروں کے نہ تو مجھے عربی آتی ہے نہ فارسی نہ اردو اور نہ  
انگریزی بعض اوقات علی گڑھ اور پرانے اور نئے دوستوں  
کی یاد دست کر دیتی ہے۔ اور اس بے چینی کے عالم میں جو  
دل میں آتا ہے جس زبان میں قابو ہوتا ہے اس میں اپنا دل  
کھول کر کافی پر رکھ دیتا ہوں۔ اس پر حضرت الشاہداز "خفا  
ہوں یا مانع مشفق" برا کہیں انہیں اختیار ہے میں معذور  
ہوں۔

جب کہ ہمارے لیے دنیا و مافیہا میں سوائے کھانے، پینے، کھینے،  
لٹنے، سونے اور تنہوڑا سا پڑھنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ ایک  
کو بھی اگر پرانے دوستوں اور کالج کے بھائیوں کا خیال  
آگیا اور ان سے ملاقات کی آرزو پیدا ہوئی۔ ایک بھی اگر کچھ  
منٹوں کے لیے اپنی موجودہ زندگی کی کش مکش اور وقتوں کو  
بھول کر آدھ گھنٹہ کے لیے خواب دیکھنے لگا۔ ایک کو بھی اولڈ  
بوائز کے اہم فرائض اور قوم کی ضروریات کا اندازہ ہو گیا تو  
میں خوش اور میرا خدا خوش میری بجات کے لیے اتنا ہی کافی  
ہے۔ دفتر کے خطوط سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور کوئی خوش ہوا  
ہو یا نہ ہوا ہو مگر میرے کیلنڈر سے تو ضرور خوش ہوئے ہیں۔  
کوئی دنیا کی پریشانیوں میں پھنسا ہوا لکھتا ہے "ادے بجائے  
یہ غرہ دار غافات تجھے اب تک کیسے یاد ہے۔ کالج چھوڑے  
زمانہ ہوا۔ پھول باسی ہو گئے، اس گلدستہ میں پھر تو نے کیسے  
تازہ پھولوں کی سی دھک پیدا کر لی؟ دوسرا لکھتا ہے کہ "اٹھارہ  
برس کے بعد کالج اور اس کی زندگی یاد دلا کر بے چین کر دیا؟  
تیسرا لکھتا ہے "سوئے سے توجگایا مگر کون جگایا؟ اس گری نیند  
میں یہ توفانہ تھا کہ اپنی بے بقاعتی اور ناکارہ پن سے بے  
خبر تھے؟ بہت سے جیتے جاگتے مست کیلنڈر سے بہت بڑھانے  
والے پیغام بھیجتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ یہ سلسلہ برابر جاری

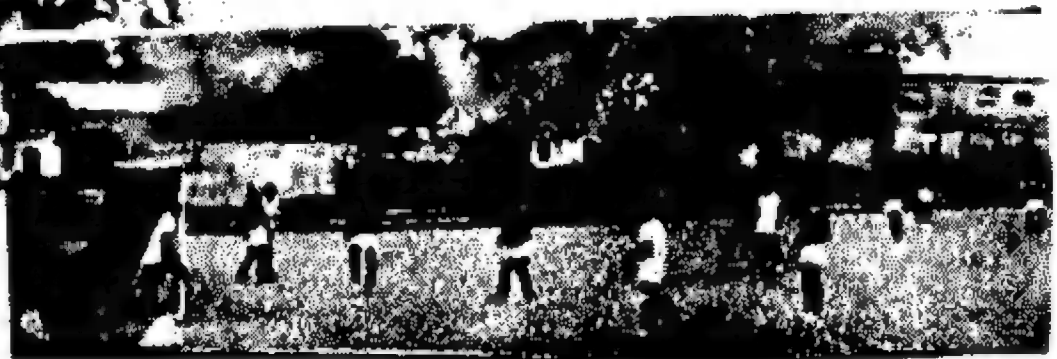
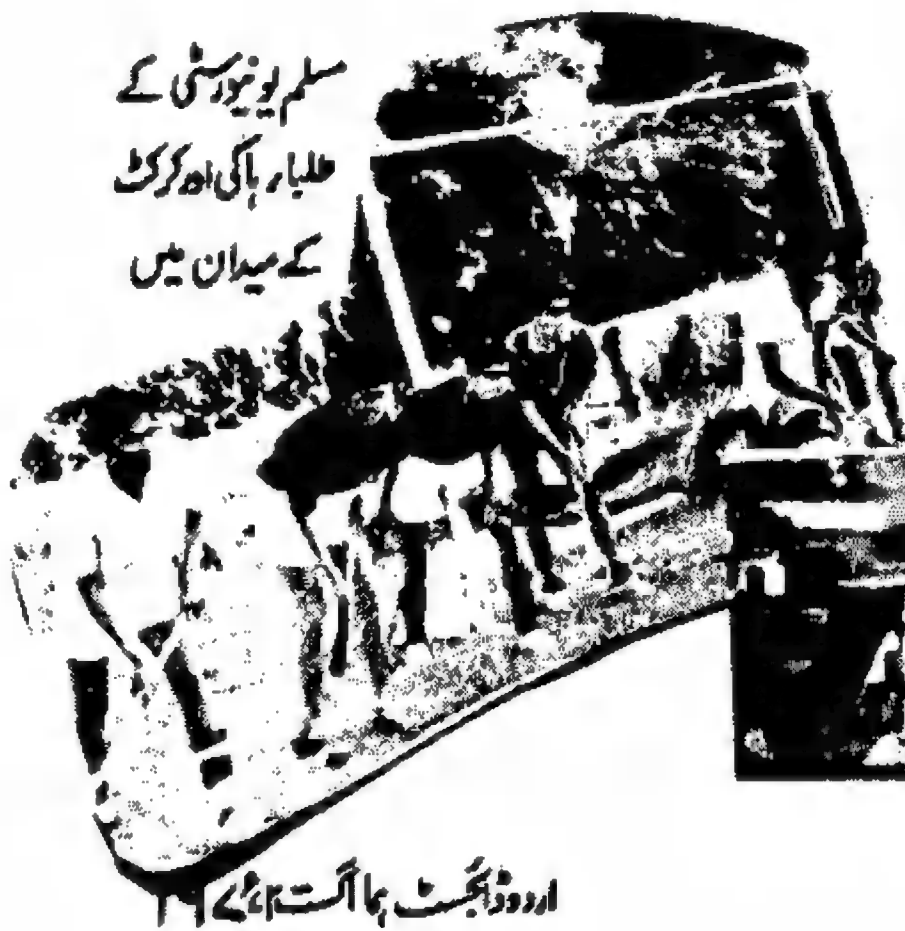
فریاد کی کوئی نے نہیں ہے

نالہ پابند نے نہیں ہے

اگر میرے کیلنڈروں کے حال سے ایک کے دل میں

علی گڑھ کی یاد تازہ ہو گئی ایک کو بھی وہ پیارا زمانہ یاد آگیا،

مسلم یونیورسٹی کے  
ظہار ہاکی کھیل  
کے میدان میں



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اردو ڈائجسٹ ہمارا آگے ۱۹



رہے

جب تک کہ دل کی بیگلی جائے  
اور اترے والے گت چلی جائے

”اے کھیلندرو! خدا تمہارا بھلا کرے! میرا خیال صبح نکلا، ہم سب میں جان ہے۔ علی گڑھ کی محنت کی چنگاری ہاجو گزشتہ بے اعتنائیوں ادیبے توجہیوں کے ابھی بھی نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ وہ مجھے بھی نہیں پائے گی۔ اس اولڈ بوائے کے ذریعہ سے زندہ ہی نہیں بلکہ روز افزوں ترقی کے دلیں ایک مشعل کی طرح روشن ہو جائے گی۔ ہمارے دل کی کدوئیں دور کرے گی کہ علی قدر مراتب ”مادر مہربان“ کی خدمت کریں۔ پیاری ماں“ کو اس کی متمول اور غیر متمول اولادیں سب برابر ہوتی ہیں۔ بلکہ غیر متمول سے تنہا زیادہ محبت ہوتی ہے۔ غریب کی کمائی کے ایک پیسے سے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی کے امیر کے روپیہ سے ہمارا کوئی بھائی بے بفاعت اور ناکارہ نہیں ہے۔ آلودہ جو اپنے آپ کو خون ناکارہ بنا دے۔ اور کالج کو اس وقت ہر ایک کی مدد کی ضرورت ہے۔ آدھم سب اسکی اپنے ”اولڈ بوائز ایسوسی ایشن“ کے ذریعہ سے مدد کریں ہم کو خود ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ جو کام میں نہیں کر سکتا ہوں تم کر سکتے ہو جو تم نہیں کر سکتے ہو ہمارا کوئی اور بھائی کر سکے گا۔“ ناامیدی اور یاس ”یہاں سے روانہ ہوں“ مردہ دلی کے لیے دروازہ بند ہے۔ ٹھنڈا کھل تو کیا بروت کی سلیں کی سلیں بھی ہماری آگ کو نہیں بجھا سکتی ہیں یہ علی گڑھ کے کھیلندروں کی محفل ہے۔ اوکھیلندرو! تمہارا قصہ گو تمہارے دل بڑھانے والے پیاموں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

کیا بارہ گلگوں سے مسرور کیا دل کو  
داتا رکھے آبادان ساقی تیری محفل کو

کس قدر لمبی تمہید ہو گئی ”آدم برسر مطلب“ ظہور حسین  
کمال الدین ظفر علی خاں اور غلام علی اور میں۔ ہم خاص یار

تھے اس زمانے (۱۸۹۰ء) میں کچی بارک گلزاری ہوئی تھی۔ میر ولایت حسین صاحب انہیں کمروں میں رہتے تھے جہاں اب رہتے ہیں۔ میر صاحب کو اس وقت بھی زیادتی کام کی وجہ سے ذرا فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس زمانے کے اسکول کے لڑکے بڑے شرمیلے ہوتے تھے۔ اور ہم کالج والے بھی کچھ کم نہ تھے مگر میر صاحب تحمل اور چشم پوشی سے کام لے کر سب انتظام درست رکھتے تھے۔ ان کے قریب ہی موجودہ برسر مطلب عبدالباقی صاحب ایم۔ اے رہتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں اور اس سے پیشتر انکو ”سید کلن صاحب“ کہہ کر پکارتے تھے۔ موجودہ نام تو عید بقریہ کے واسطے رکھ چھوڑا تھا۔ اسکول میں ان کی پڑھائی کی بڑی تعریف تھی۔ اور انکے شاگردانے بڑی محنت کرتے تھے۔ مگر سب کو یہ شکایت تھی کہ چلے کیسے ہی نظر چاکر شرارت کی جاتی تھی، سید کلن صاحب ضرور دیکھ لیتے تھے۔ آگے بڑھ کر بڑا کرہ تھا۔ جہاں اب ”نول ہوم“ سر آدم جی پیر بھائی منزل ہے۔ اور یہاں لے کالج کے طلباء کے کمرے تھے۔ بڑے کمرہ میں اس وقت کالج کا بلیک ہزار داستان مسٹر محمد داؤد مرحوم رہتا تھا۔ اور واقعی سارے کالج کی جان اس وقت ان کمروں میں تھی جو بڑے کمرے سے شروع ہو کر مسجد پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ بڑے کمرے میں مسٹر داؤد مرحوم کے علاوہ مسٹر احمد حسین بی۔ اے مولانا طفیل احمد مولانا احمد معقم (چریا کوٹی) رہتے تھے۔ اور اس پاس کے کمرے بھی اور زندہ دلوں سے بھرے تھے۔ مسٹر حبیب اللہ خاں قریب ہی رہتے تھے۔ ان کے پاس میرے عزیز دوست مسٹر مظفر علی خاں (سکریٹری میونسپلٹی بندالیوں)، مسٹر محمود حسن خاں، بی۔ اے (مجتوں) مصطفیٰ گوندہ اور مسٹر سید ظفر الدین (میاں صاحب) رہتے تھے۔ مسٹر قطب الدین (نٹو) جو آب حیدر آباد میں ہیں، اور ان کا چھوٹا بھائی فرید حامد علی خاں مرحوم (دستاکیس) اور میرا دوست ظفر حسین فاروقی (بریل فیشن) بھی انکے پڑوسی تھے۔ مسٹر قمر بیگ چغتائی انکے اس وقت

ملی گڑھ  
یونیورسٹی  
کرکٹ  
گراؤنڈ  
میں  
چند  
کیلنڈر  
اسی  
جگہ  
سے  
مولانا  
شرکت  
علی  
نے  
کرکٹ  
کھیلنے  
ہوئے  
تاریخی  
جگہ  
ملاقات

کالج چھوٹے تھے مگر چھوٹے ملی گڑھ خاص میں ملازم تھے، اسوجہ سے کالج ہی میں ہی ملازم تھا۔ ماسٹر الطاف علی صاحب مع اپنے لڑکے اکرم علی اور سر فراز بخش (نیلسن) کے کونے کے کمرے میں تھے۔ جہاں اب ناھر خاں صاحب منعم عمارت رہتے ہیں۔ اس میں گڑھ کپتان احمد سعید خاں صاحب رہتے تھے۔ واقعی جیسا کالج کا بانی تھا ویسا ہی اس کو گڑھ کپتان ملا تھا عجیب و

ملی گڑھ مسلم یونیورسٹی نہر

غریب آدمی تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے احسان حسین خاں مرحوم (گادفری) حاجی حسین، مابد مشہور کریم کونور صاحب، حامد (کیٹ) رہتے تھے۔ اب آخری مسجد والی بارک کے شرف کے کمرے میں مسٹر محمد علی خاں وکیل، بجنور مسٹر محمد ارمان سکنداسرائی اسکول لاکل پورا جو ہمارے زمانے کے مشہور دوڑنے اور کودنے والے تھے۔ رہتے تھے جن سے آج ۱۸

ادوٹا ٹیٹ ہما آگست ۱۶۹۶



برس کے بعد اولدھوائے کی بدولت پھر ملاقات کر کے دل خوش ہوا۔ ان کے قریب ہی خواجہ غلام الشکین صاحب اور سید وزیر حسین صاحب فکیل رہتے تھے۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی مسر ذوالفقار علی اور ان کی رام پوری ملٹن کے تین کمرے تھے جس میں کا آخری کمرہ اور ورزشی سالن اور پہلوان ڈوکر کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے قریب ہی کمال الدین غلام علی، ظفر علی خاں، حامد علی بریلوی (جو اب ایڈیٹر ایسٹ علی ڈاکری ڈگری لاکر جید آباد میں انیسر حفظانِ صحت میں رہتے تھے۔ ان کے پاس مسر فضل حق خاں (چچر پور) خان شیر شاہ خان، خان علی احمد خاں رستی دانشمندان، جالندھر مسر بہادر علی مرحوم، مسر میر حسین بی۔ اے (منیر) منصف رجوریاست ممدوٹ میں ہیں) کا قیام تھا جس طرح سب سے بڑے اور شروع کرے میں کلچر کا بلیبل ہزار داستان رہتا تھا۔ اسی طرح آخری کمرہ میں مسجد کے قریب اس زمانہ کے بوم اول نے جن سے "خاندان بومیہ" کی ابتدا ہوئی تھی اپنا گھونڈ بنایا تھا کیا یہ لہا تا علی اور انتظامی قابلیتوں کے اور کیا بلحاظ ورزش جسمانی، شاعری اور ہنسی مذاق کے غرض ہر لحاظ سے اس زمانے کی کئی بارکسچین ہو رہی تھی۔ ہر طالب علم تفریح اور دل بستگی کی تلاش میں اسی طرف رجوع کرتا تھا۔ سرداران کلچر تک تو ہماری رسائی بعد کو جنگل کے پیالے کی وجہ سے ہوئی مگر ہم نے آپس میں ایسا سامان کر لیا تھا کہ ہم کو کسی کی پر دانہ تھی۔ ۵۲ نمبر کے کمرہ کے آگے جنب ہے اسکے نیچے اکھاڑہ کھودا تھا مسر تقسیم بیگ چغتائی تو کبھی کبھی تاکر زور کرتے تھے اور واقعی اس زمانے میں کشتی خوبصورت لڑتے تھے۔ مگر ہم لوگ شام کو کریکٹ کے بعد روز زور کیا کرتے تھے۔ چھوٹے جوڑوں کی بھی کمی نہ تھی۔ احسان، حاجی، عابد، حامد (کیٹ)، محمد علی اور عزیز الرحمن (بلو باندہ) آپس میں بڑی شہ زوریاں دکھاتے تھے۔ ظفر علی خاں اڈیشہ پنجاب

ریلو، اگر بھولے نہ ہوں تو ان کو کشتی میں میرا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہمارا دن عجیب طور پر کٹا تھا علی العباد خدا کے خوف اور مسر ازملڈ کے ڈر کے مارے ان کے ہمراہ مسجد جا کر نماز فجر ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد کمرہ بند کر کے گھنٹہ بھر ڈنڈ مگر سے تنخل رکھتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر چونکہ کریکٹ ٹور کا زمانہ آگیا تھا اس لیے تھوڑی سی کریکٹ کی مشق اسٹریچی ہال کے کچے جاں گاڑ کر کرتے تھے۔ اجنبی آدمی ضرور پوچھے گا "ارے بھائی پڑھتے کس وقت تھے؟" ان ضروری کاموں سے جب فرصت ملتی تھی تو پڑھنا بھی ہو جاتا تھا۔ ہم "کھیلنڈروں" پر کچن کی پرانی مثل سارقی آتی ہے "تام کیا ہے؟ شکریا، کھاتے کتنا ہو؟ من برس بارہ، پانی کتنا پیتے ہو؟ شکا سارا اور کام کتنا کرتے ہو؟" مختلف پیارہ ہم تو ننھے پیارے تھے پڑھ بھی لیتے تھے۔ ہاں امتحان میں آج تک فیل نہیں ہوئے۔ ۱۰ بجے سے ۳ بجے تک کلچر جلتے تھے اور شام کو کریکٹ یا فٹ بال کھیلتے تھے۔ کشتی کے بعد جو وقت بچتا تھا، اس میں کچھ تو پڑھنے میں اور اس سے زیادہ "بھنگ" کے پیالے اور کچھ سی میں سرور ہوتا تھا۔ کمال الدین، غلام علی، اور ظہور حسین اور سب کھیل کھیلتے تھے۔ مگر کشتی ہمیں لڑتے تھے۔ ان غریبوں کو مگر چین نصیب نہیں تھا۔ ظفر علی خاں کے "گودہ" میں درد ہوتا تھا۔ اس لیے پیارے کمال الدین کو ان کے ہاتھ پاؤں دبا پڑتے تھے۔ اور ظہور اور غلام علی سے میں خدمت لیتا تھا۔ مگر ہم سب کی دن بھر کی کوفت "بھنگ کا پیالہ" اور کر دیتا تھا جب کہ ہم چاندنی رات میں پٹنگوں پر لیٹ کر خوب پیچروں کے زور سے لاپتے تھے۔ اس پاس کے سب دوست جمع ہو کر آواز ملاتے تھے۔ میرا عزیز دوست سرفراز خاں باجوہ اسکول کا طالب علم ہونے کے ہم میں شریک ہو جاتا تھا۔ آواز اس زوردار ہوتی



سنگرم  
کنیدی ہال  
مسلم یونیورسٹی  
علی گڑھ  
میں  
یوم  
جہوں  
کے  
موقع  
پر



تھی کہ سر تھیوڈور سارین صاحب بعض اوقات دوسرے دن صبح کو ہماری طرف دیکھ کر اور مسکرا کر یہ کہہ دیتے تھے کہ رات جو کیداروں نے سولے نہیں دیا کوئی پوچھے کہ اس سے کیا حاصل تھا؟ کچھ بھی نہیں، ہم ہنسنے لگے، تو درست نوجوان جانور تھے جو کھیل دل میں آتا تھا کیلئے تھے پھر نے زبردست تھے۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت تھی، دلیں انگلیں تھیں، زمین سے آسمان کی طرف اڑنے کو دل چاہتا تھا۔ چلا کر آپس میں لڑ کر، فٹ بال میں ایک دوسرے پر دھنیاں حملہ کر کے کریکٹ میں، گیند میں اور بے اور بعض اوقات خود اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑ کر دل کی بھر اس نکال لیتے تھے۔ اور کیا حاصل تھا؟ ہم سب میں کمال الدین کی زبان ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اور پھر بھی ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی بات کا کوئی بُرا جیس ماننا تھا اور وہ واقعی ایسا فاضل تھا کہ اس سے جس قدر محبت کی جائے بجا تھی۔

بڑے طالب علموں میں مولوی بہادر علی مرحوم بڑے ہنس نہتے تھے۔ اور ہر ایک کے لیے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہا کرتی تھی۔ اگر موت نے اس قدر جلدی نہ کی ہوتی تو ان کی مسلح کلقات ہم سب کے لیے علی گڑھ میں بہت مفید ہوتی۔ مولوی بہادر علی مرحوم اگرہ کالج سے ایف۔ اے پاس کر کے بی۔ اے میں داخل ہوئے تھے۔ اور ریاضی ان کا خاص مضمون تھا۔ اس زمانے میں عام خیال تھا کہ مسلمان علم ریاضی کے لیے بنائے ہی نہیں گئے ہیں اور علی العموم وہ اس مضمون میں کمزور ہوتے تھے۔ ہمارے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے اس کو غلط ثابت کر دیا اور ان کے بعد سے تو بہت سے مسلمان علی گڑھ اور اور کالجوں سے ریاضی میں اعلیٰ درجہ پا کر نکلتے ہیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مسلمان سب مضمونوں میں یکساں ہیں۔ اور ذرا دل لگا کر پڑھیں تو کسی قوم سے کیا، ہندوستان، کیا یورپ اور کیا امریکہ میں کم نہ رہیں۔

اس زمانے میں بی۔ اے میں کسی کا ریاضی بمقابلہ فارسی یا عربی لینا ایک عجیب بات خیال کی جاتی تھی اور اس کے مسلمان ہونے پر شبہ ہوتا تھا۔ کمال الدین نے فوراً مولوی بہادر علی کا نام "بابو شمس بر وزن گھوس" رکھ دیا اور ان کو اسی نام سے پکار پکار کر دق کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں ریاضی کے پروفیسر نہ ہونے کی وجہ سے مولوی بہادر علی نے مجبوراً ریاضی چھوڑ کر عربی لے لی اور سب سے ادا۔ کمال الدین ہی کو جا کر یہ خوشخبری سنائی کہ "لے بھائی اب تو خوش ہوا۔ ریاضی چھوڑ کر عربی لے لی۔ اب تو بابو شمس نہیں رہا۔" کمال الدین حضرت کب چوکنے والے تھے فوراً بول اٹھے کہ اب تم "بابو کھل" ہو گئے۔ اور وہ جب تک کالج میں رہا اسی نام سے مولوی بہادر علی مرحوم کو پکارتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسکول میں ماسٹر مقرر ہو گئے۔ انکے تقرر پر انکے دوست مسٹر داؤد نے فوراً ایک لکھ لکھ کر ان کو بھج دی جو کالج میں از حد مقبول ہوئی اور ہر خاص و عام کی زبان پر تھی۔ بہادر علی مرحوم نہایت درجہ پابند صوم و صلوة تھے اور صفا چٹ لوگوں کی نگاہ میں اٹکی خوبصورت خشنواشی دارھی ہمیشہ کھٹکتی تھی۔ اسی کی وجہ سے ان کا اول شعر میں مذاق اڑایا گیا ہے۔

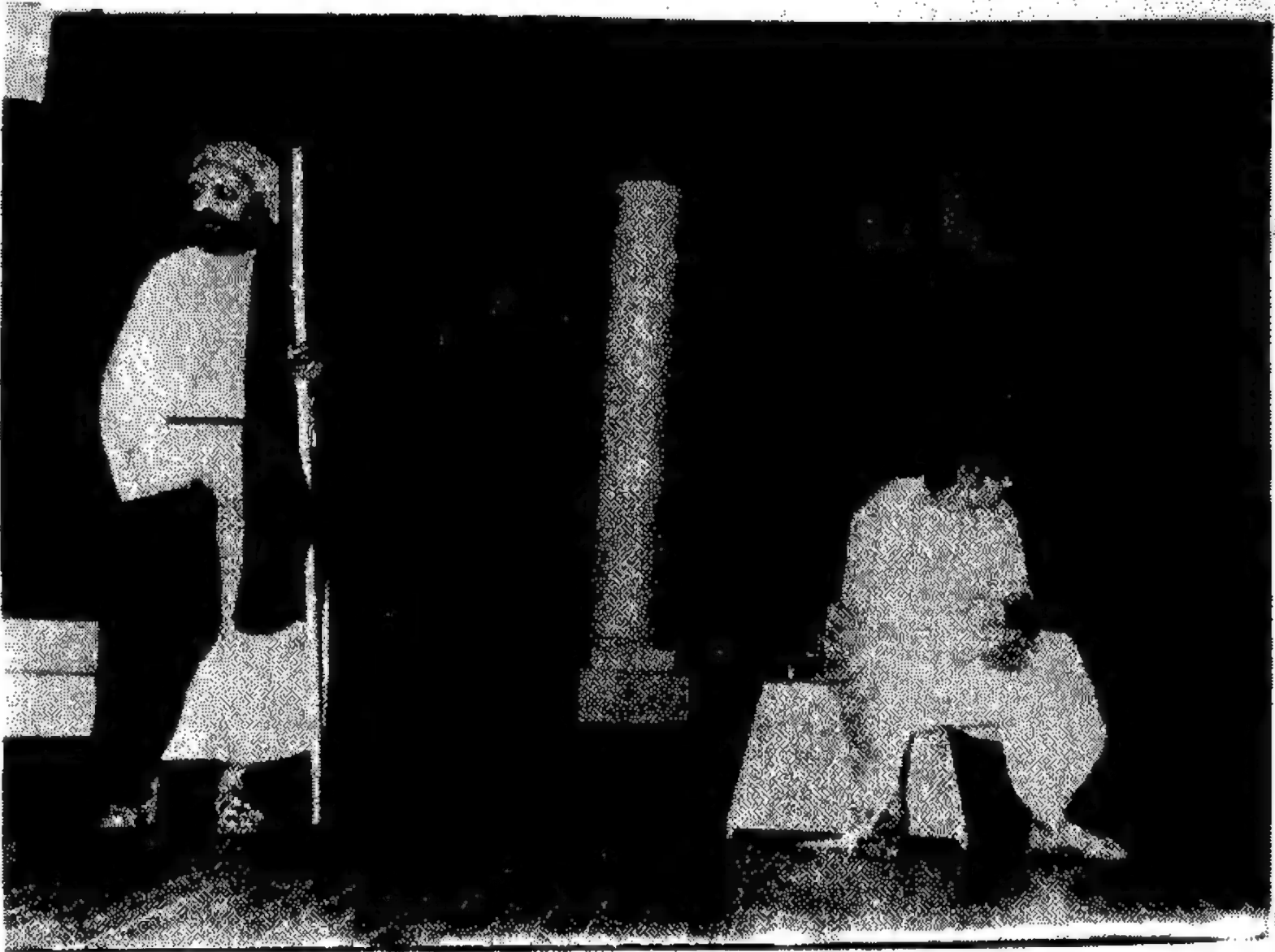
کہاں چھوٹی کسوت، کدھرا ستر ہے  
یہ پیشہ کہو کیا تمہارا برا ہے  
بس اب درس و تدریس میں کیا دھرا ہے  
بہادر علی بھائی زمانہ برا ہے

مرحوم خود اس کو سنکر پھر ٹک جاتے تھے، اور آخر وقت تک جبکہ وہ علی گڑھ میں قابلیت کے ساتھ وکالت کرنے تھے اور ہمارے کالج کے ٹرینی بھی تھے ان کے احباب ان سے ملتے وقت زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے "بہادر علی بھائی زمانہ برا ہے۔ بڑے کمرے، ٹول ہوئی" کے سامنے

ہمیشہ جگہ ہوتا تھا اور رات کو اکثر گانا ہوتا تھا۔ کالج کے زمانے میں، مسٹر احمد حسین (سینئر اسٹیٹ اسکول لاہور) کا وہ مسکن تھا جس وقت انہوں نے اپنی بلند اور زور دار آواز سے "نوفل کا دوبارہ" جیسا سب کھیلندے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اور سب نے مل کر آغ مرحوم کا دیوان کا دیوان دہرایا۔ بعض پرانے اشعار تو اب بھی علی گڑھ کو یاد کر کے میرادل دہرانے کو چاہتا ہے جو بہت حسب حال ہیں۔

ستم ہی کرا جفا ہی کنا، نگاہ الفت کبھی نہ کرنا  
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کی کرنا  
لے تو چھوٹے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لگین  
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تھی نہ کرنا  
ہماری میت پر تم جانا تو چار آنسو بہا کے جانا  
ذرا ہے پاس آبرو بھی، کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا

"نوفل" کے دوبارہ کے لقب کا بولنا تھا کہ چاروں درویش اور پانچواں میں اپنے، اور "بھنگ کا پیالہ" ساتھ لائے سرداران کالج کا حکم ہی تھا اور ہم بھی خوشی سے ان کی خدمت میں حاضر ہونا پسند کرتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں کالج کے بڑے طلباء کا بہت اثر تھا، اور ہم چھوٹے ان کے حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ مسٹر بیگ مرحوم خود ان کا بہت خیال کرتے تھے اور کالج کے معمولی انتظامات میں جن کا طلباء سے تعلق تھا ان سے مشورہ لیتے تھے۔ ادھر "بھنگ" نے رنگ جمایا، ادھر "گش" میں بہار آئی، کا قلم تھا اور بلیس "شارترے صدقہ، نازدادا پر خوار" جہاں اس قدر بلیس رستی ہوں وہاں "بوم" اور "لومنی" کا برا احوال کیوں نہ ہو۔ اسی لیے تھوڑا وقت ان سے محبت آمیز شکوہ و شکایات میں گزرتا تھا، میرا عزیز دوست اور ہم درجہ مسٹر شکور بخش قادری مرحوم (پرنسپل ٹیچنگ سکول، "بلوہل") کا کام عاشق ہونے کی وجہ سے "لومنی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔



گنبدی ہاں  
مسلم  
یونیورسٹی  
علی گڑھ  
میں  
کدراہ  
”سقراط“  
کا  
ایک  
سین

شکوہ بخش ”بلو منی“ جس کے ذکر سے ہم محفل میں سماں باندھتے  
تھے۔ کہاں ہے عبدالحکیم ”بھوٹان“ جس کی شان میں داؤد  
اور ہم سب مل کر نغمہ سنجہ ہوتے تھے۔ اور اپنی محبت اور یاد  
کے زور سے دہرہ دون سے علی گڑھ کھینچ لاتے تھے۔  
جمع پھریاں عیش کا سامان ہو

پھر یہی کمرہ ہوا اور بھوٹان ہو

سب زندہ ہیں مگر شہر خوشاں میں ہیں اور غالباً وہ  
بھی ہمیں یاد کرتے ہوں گے۔ ہماری آنکھوں سے ہاں پوشیدہ  
ہیں، چھپے ہیں تو کیا ہیں؟ ہم بھی ایک نہ ایک دن ڈھونڈ کر  
ان سے مل جائیں گے۔ عالم ارجح میں نہیں تو روز محشر تو ضرور  
ملاقات ہوگی۔ میں بھی کیا آدمی ہوں ”کیسلنڈروں“ کا تو ذکر  
ستار اور پہنچ گیا عالم ارجح میں ہے

در محفل خود را مدہ ہم چوں منے را

افسردہ دل افسردہ کتہہ ناخمنے را

داؤد مرحوم کا زیادہ کلام تو جھکیا د نہیں ہے کیونکہ

ہائے کیسا آدمی مر گیا، اور کیسا جوان مرا، میرے خیال میں اس  
زمانہ میں اس سے زیادہ تنہس کچھ کالج میں کوئی نہ ہو گا۔  
حد درجہ خلیق اور طنسار تھا۔ آخر وقت تک جبکہ وہ ایک بڑے  
عہدے پر نہایت نیک نامی سے کام کر رہا تھا، ویسا ہی منکسر  
مزاج اور خندہ پیشانی تھا۔ مرنے سے کچھ دنوں پیشتر ان کے  
چھوٹے بھائی اور اپنے دوست مسٹر رفاق بخش قادری کے  
بنگلہ پر ملنے گیا۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ رنگت اس قدر کج  
کی وجہ سے سیاہ ہو گئی تھی۔ آواز بیٹھ گئی تھی، مگر ہونٹوں پر  
وہی مسکراہٹ تھی، پورے دو گھنٹہ تک پاس بٹھایا اور  
مجھ سے اور محمد علی سے پٹانے تذکرہ کرتے رہے۔ افسوس ہم  
میں سے جو جاتا ہے جوان ہی جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک نو عمر  
غریب لڑکی اور کچھ نئے نئے بچے رونے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔  
اس جلسہ کا میں جب خیال کرتا ہوں تو دل کو صدمہ ہوتا ہے  
کہاں ہے ہمارا بلیبل ہزار داستان داؤد کہاں ہے بہادر علی  
مرحوم جسکو ہم زمانہ کی برائی سے متنبہ کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۷۳ء



شاعری سے بالکل بے بہرہ ہوں، مگر قبلہ و کعبہ حاکمی کی مشہور غزل کے ایک شعر پر جو مصرع لگاتے تھے وہ یاد ہیں جس سے مرحوم کی شوخی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب کرے قصہ کسی چیز کا کوئی انسان  
دیکھ لے پہلے کہ اس چیز کے ہے بھی شایاں  
بچے اوروں سے کہ وہ آتے ہیں داد کے یاں  
ان کو حاکمی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں  
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

خدا معلوم قبلہ و کعبہ نے اسکو سن کر کیا فرمایا ہوگا؟ ضرور اپنے کالج کے لڑکے کی ذہانت سے خوش ہوتے ہوں گے۔  
کھیلنڈروں کی محفل میں کون کون شریک ہوتے تھے تقریباً وہ سب ہوتے تھے جو آجکل "اولڈ بوائز" میں ممتاز ہیں، اور شریک ہونوالوں میں مولانا طفیل احمد صاحب، اور مرعجب اللہ کے نام خاص ذکر کے قابل ہیں۔ زمانہ حال کے "کھیلنڈرے" خیال کرتے ہوں گے کہ یہ لوگ تو کم از کم ہرگز ایسے "مجمع ناجائز" میں شریک نہ ہوتے ہونگے۔ جی حضور شریک ہی نہیں بلکہ بانی مبنائی ہی حضرات ہوتے تھے ہم تو انکے ادنیٰ شاگردوں اور چیلوں میں تھے۔ مولانا طفیل احمد صاحب تو اول درجہ کے کھیلنڈرے تھے۔ کوئی کریکٹ ٹورالے نہیں چھوٹا تھا فلائین کی سفید پتلون، فم لین کی سفید قمیص اور اسپرٹلی گڈہ کا پرانا نیلا کریکٹ کا کوٹ پہنے آگے آگے ہوتے تھے اور پیچھے پیچھے دیر بیگ ایک نماز کا مصلیٰ اور وضو کا لونا لیے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ حضرت اس حیثیت سے کریکٹ کھیلنے جاتے تھے بھوکے کیوں نہ مریں، کھانے کو ملے یا نہ ملے مگر کیا مجال کہ ظہر کی نماز قضا ہو جائے۔ میں نہیں بلکہ اگر وہ کلب میں ڈیرا کر ڈاکر ساری ٹیم کو نماز پڑھواتے تھے۔ مولانا کی طرح موجودہ۔۔۔ کھیلنڈروں میں میرا دوست مرشد شفقت حسین مشہور بلور کی مثال بھی اس معاملہ میں نہایت قابل تعریف اور لائق

۱۴۴۱ھ ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء

تقلید ہے۔ رہے حبیب اللہ خاں صاحب وہ تو ہم سب کے سردار تھے اور کم از کم جس قدر شرارتیں میں نے سیکھی ہیں اسکی ظاہری نہیں تو درپردہ کھانے والے خالغاب ہی تھے، وہ ہمارے استاد اور لیڈر تھے۔ بد قسمتی سے وہ ہم سے اب ذرا فغا ہیں، مگر انشاء اللہ وہ دن قریب آئے گا جب ہم اور وہ پھر ایک ہو جائیں گے اور سب کھیلنڈرے مل کر کالج کی ترقی کے سامان جیتا کرنے میں سرگرمی دکھائیں گے جیسے کہ بھنگ سے پیالہ کے دور چلانے میں۔ اسے کھیلنڈرہ اب مجھے رخصت ہونے کی اجازت دو، تمکو چھوڑنے کو دل تو نہیں چاہتا ہے مگر اس پیام پر "اولڈ بوائز" کے لیے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ آؤ ہم تم سب مل کر اسکو پردان چڑھائیں۔ یہ کچھ روپیہ کا بھوکا نہیں ہے۔ مگر ہاں تمہاری محبت کا بھوکا پیاسا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ سب بھائی اسے پیار کریں، اسکے لیے خوبصورت خوبصورت کپڑے بنائیں۔ اپنر گوڑہ کناری لگا کر اس کی زینت کا باعث ہوں ابھی تو وہ بچہ ہے اسے یہ چیزیں دل سے عزیز ہیں، اس کے لیے اچھے کھلونے دور دور سے بھیجیں، اس کے سنانے کے لیے چھوٹی چھوٹی لوریاں بھیجیں، اس کے ہنسانے اور خوش کرنے کیلئے سب اس کے آگے اچھی اچھی لٹکیں لگا کر سنائیں۔ اور وہاں پڑھانے کیلئے بھی لائق استاد مقرر کریں جو سارے دنیا کے علوم و فنون سے خوش چین کر اس کے سامنے رکھیں یہ کس کا ہے؟ اسکے لیے ابھی سے لڑنا نا زربا ہے بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ شوکت اور اس کے مفسد دوستوں کی جماعت نے اپنے دشمنوں کو زک دینے کے لیے ایک آلا بجا دیا ہے۔ جسکے ذریعہ سے ان کو بدنام کر کے اپنے لیے چھوٹی شہرت حاصل کریں گے۔ کھیلنڈرہ جس کا جو جی چاہے خیال کرے۔ مگر زمانہ دکھا دیگا کہ یہ کمزور بچہ اولڈ بوائز، اپنے بڑے بھائیوں کی مدد سے ایک دن سارے اختلافات تھوڑی دیر میں مٹا

ملیگرہ مسلم یونیورسٹی بہرہ

مرید اور  
رقار  
ابید حامد  
۲۔ مجبور ملازما  
۳۔ سید محمود  
سید زین العابدین  
۵۔  
۶۔ مرزا دینو  
آفت بنائیں  
۷۔ ایم اعلیٰ  
۸۔ راجہ  
جے کشن پال  
۹۔ مرید  
۱۰۔ جنت اللہ  
۱۱۔ رائے بدایون  
ڈپٹی کلر



پیدا کر دیئے ہیں جو انشا اللہ یہ اولڈ بوائے ضرور دور کریگا  
جناب اڈیٹر صاحب میری اس بے خودی کے عالم میں لکھی  
ہوئی "بکواس" میں کوئی بات اس پیارے پیامبر کی شان  
کے نام نہ لیا ہو تو میری معذوری پر غور کر کے آپ فرود معاف  
کر دیں گے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ  
کچھ نہ سمجھ خدا کرے کوئی

شوکت علی از بنارس

ماخوذ از اولڈ بوائے۔ علی گڑھ

بابت ماہ دسمبر ۱۹۹۷ء جلد ۱ شمارہ ۴



لہرو ڈائجسٹ ہماگست ۱۹۵۷ء

دیگا۔ ایک دوسرے کی بے اعتباری جو ہماری بد قسمتی سے  
ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔ اسکو یہ ضرور قتل کرے گا  
جب ہم کو غلی گڑھ کی چپہ چپہ زمین پیاری ہے۔ اس کا چوٹے  
سے چھوٹا سنگ ریزہ عزیز ہے۔ اس کا آسمان اس کا سونچا  
اس کا چاند اس کے تارے اس کا پانی اس کے موجود  
طالب علم ہم کو پیارے ہیں تو پھر اس کے اولڈ بوائے نے کیا  
قصور کیا ہے۔ ہم میں اور ان میں بلا استثناء کوئی دشمنی اور  
غنا نہیں ہے۔

میرا ان کا معاملہ ناظم

کچھ جدا جنگ و آشتی ہے

اس کم بخت بے اعتباری کا برا ہو کر اسنے اخلاقات

ملنگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر



مسلم لیگ قیومی

کا

اقامتی

کے

(سید محمد ضمیر اختر حسنی)



۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کے بعد جب انگریز حکومت

کا حاکم ہندوستان بن گیا، پھر ٹوٹا تو وہ ہندوستانی مسلمان تھے جو دوسری قوموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ظلم اور برہمیت کا شکار ہوئے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جہاں ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں نے خود کو حالات کے مطابق موڑ لیا تھا وہاں مسلمان قدیم روایات کا بوسیدہ لبادہ پہنے افسانوی شرم و عریض کی طرح اپنی گردنوں کو غفلت گزشتہ کے ریگزار میں چھپاتے بیٹھے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کو نہ صرف نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ تعصب اور تنگ نظری سے اس کو کفر کا نام دیتے تھے یہی وجہ تھی کہ جہاں دوسری قوموں کے لوگ تعلیم حاصل کر کے حکومت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے تھے وہاں مسلمان قدیم نوابی خون کے جوش میں تعلیم سے دور بھاگ کر پستی کے عین غار میں گرتے جا رہے تھے۔

اس وقت میں مرسیا احمد خاں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا امدان کے ذہن میں اپنی قوم کو اس ذلت اور نکتہ

۱۷۱۱ء بروز جمعہ ۱۷ اگست ۱۹۲۱ء

سے نکلنے کے لئے جدوجہد کے خطوط ابھرنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ نئی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں مرسیا نے اس دور کے نظام تعلیم پر نظر ڈالی جب کہ آبادی سے دور جنگوں میں دس گناہ ہوتی تھی جہاں پر طلباء علم حاصل کرتے اور وہیں قیام کرتے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ قدیم نظام تعلیم ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر ایک طالب علم نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا تھا بلکہ زندگی کا ہر پہلو ایک ساتھ دیکھ کر اچاگر کرتا تھا۔ رہنے پہننے کے ڈھنگ، آداب، اخلاق، کھانسنے پینے کے طریقے، غرض یہ کہ ہر چیز دس گناہ سے بیکھر کر واپس گھر لوٹتا تھا۔ اسی طرح کا نظام تعلیم کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں رائج تھا کہ طلباء ہوشیوں میں ایک ساتھ رہ کر تہذیب حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے اور جب ایک طالب علم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا تو وہ ایک مکمل تعلیم یافتہ تہذیب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



یافتہ انسان ہوتا۔

مرسید اسی طریقہ تعلیم کو اپنے ملک میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لندن کا سفر کیا اور اس طریقہ تعلیم کا بخود مطالعہ کیا۔ ان کی دانست میں قوم کی حالت صحت اسی وقت سدھر سکتی تھی جب ہندوستان میں اسی دسگاہیں قائم کی جائیں جن کا کردار اقامتی ہوتا۔ لندن سے لوٹ کر مرسید نے ایک اقامتی دسگاہ کا خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ مرسید کے خیالات جب عوام تک پہنچے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ جو دسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ کس قسم کی ہوگی۔ مرسید نے جواب دیا، ہم سے لوگ باہر راہ پوچھتے ہیں کہ دسگاہ کونساں ہو۔ مجوزہ میں جو دسگاہیں گے وہ کیونکر تربیت پائیں گے۔ ہم اس مدرسہ العلوم کو محمد بن یونیورسٹی یعنی دارالعلوم مسلمان بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی نقل امانا چاہتے ہیں۔ جو دسگاہیں ان مکانات (ہوسٹلوں) میں سکونت اختیار کریں گے ان پر اسی طرح جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں میں گرجا میں جانا اور نماز میں شریک ہونا ضروری ہے۔

اپنی اپنی مسجدوں میں جانا اور نماز میں شریک ہونا فرض ہوگا یعنی لوگوں کو پانچ وقت کی نمازوں میں حاضر ہونا اور نماز جماعت سے پڑھنا واجب ہوگا اور شیعوں کو صرف تین وقت اس لئے کہ وہ ظہر و عصر، مغرب و عشاء ساتھ پڑھ لیں گے۔ جس قدر طالب علم آکسفورڈ کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں ان کو ایک قسم کا کوٹ اور ایک قسم کی ٹوپی ملتی ہے تاکہ ایک قسم کا لباس سب کا ہو جائے اس سے نہایت عمدہ فائدہ ہے جس کا بیان اس مقام پر ضروری نہیں۔ مدرسہ العلوم کے طالب علموں کو بچانے کوٹ کلسے ایجنٹ کا نیم اسٹین چھ لال ترکی ٹوپی (بعد میں سیاہ شروانی اور ٹوپی ہو گئی) دی جائے گی۔ تمام طالب علم جب مدرسے میں یا کتب خانے میں یا عجائب خانے میں یا اخباروں کے کمرے میں آئیں گے تو بغیر اس چھ اور ٹوپی کے کلسے کے مجاز نہ ہوں گے۔

لوگوں کے پڑھنے اور کھیلنے اور کھانے اور سوتے اور نہانے اور کپڑا بدلنے کے سب وقت معین ہوں گے اور ہر ایک کے کو اس وقت وہی کام کرنا ہوگا جو اس وقت کے لئے مقرر

مرسید ہال میں آجکی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چند طلباء اور منتظمین



جھوٹ بولنا گوہ کسی ہی خفیت ہستیں کیوں نہ ہو۔  
ایک بہت بڑا جرم سوسائٹی کا سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی  
کو بھوناکہ بیٹھنا جرم سوسائٹی مانا جائے گا گو کہ اس شخص نے  
جھوٹ ہی کیوں نہ بولا ہو۔

خود لڑکے بھی باہم مل کر ایک کلب جس کا نام انشائے  
تعالیٰ مثل کیمبرج کے کلب کے یونین کلب کہلائے گا، علمی باتوں  
اور نیادی علوم میں مباحثہ ہوا کرے گا اور قرائے ایچ بی بی بی  
ہوئے جو کیمبرج یونین کلب میں ہیں۔

(تہذیب الاخلاق بابت یکم جب ۱۳۸۹ھ)

سر سید احمد خاں نے ایک اقامتی درس گاہ کا جو خواب  
دیکھا تھا اُن کا ردہ پورا ہوا۔ انہوں نے محمد بن اینگلو اور نیٹل  
کالج قائم کرتے وقت جن باتوں کا خاص خیال کھلایا تھا ان میں کہ  
طلباء کو مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ  
تعلیم حاصل کرنے کے بعد سراج کی بدلتی ہوئی قدروں میں اپنا  
مقام حاصل کر سکیں اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش  
بدوش ترقی کی دوڑ میں ساتھ رہیں۔ تعلیم کے بعد انہوں نے  
اقامتی زندگی پر بہت زور دیا۔ ان کی نظر میں اقامتی زندگی  
ہی ایک طالب علم کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے  
کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، باہمی اہتمام کا جذبہ ان میں پیدا  
ہو اور ایک ساتھ مل کر وطن کی ترقی میں قدم بڑھائیں۔  
درس گاہ کی اقامتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے  
ہوشوں میں رہنے والے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے  
کہا: اسے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استاد کو  
تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوش  
ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں  
سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو۔ مختلف علوم کو پڑھتے  
اور مختلف مہنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ  
مقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے

ہدیگرہ مسلم یونیورسٹی خیر

ہے یہاں تک کہ جو وقت سونے کا ہے اگر طالب علم چاہے کہ  
میں اس وقت پڑھوں اور تھوڑی دیر کے بعد سونوں تو وہ ایسا  
نہ کر سکے گا بلکہ اس کو ضروری ہوگا کہ سونے کے وقت پر سو  
رہے اگرچہ بالفرض نیند آئے تو پلنگ پر آنکھیں بند کر کے  
پڑا رہے۔

کھیلنے کے لئے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہونگے  
اور جو کھیل جس کو پسند ہوگا وہ اختیار کرے گا۔ گھوڑے پر چڑھنا  
بندوق چلانا، تیرنا یہ سب کام بھی مناسب طور پر اور انداز پر  
سکھائے جائیں گے۔

الفاظ بد لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں ان کو بولنے  
کا سخت امتناع ہوگا یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی کو جھوٹا  
کہہ بیٹھے گا تو وہ بہ منزلہ دشنام سخت کے سمجھا جائے گا۔

تمام طالب علم ایک کمرے میں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں  
گے۔ تمام چیزیں کھانے کی وقتاً فوقتاً پکائی جائیں گی اور  
ہر نوکم کا میوہ بھی لڑکوں کو مناسب طور سے دیا جائے گا اور  
ہر ہفتہ میں ایک خاص کھانا خود لڑکوں کی فرمائش سے پکایا  
جائے گا جس کو وہ خود اپنی کوشش رائے سے قرادیں گے بشرطیکہ  
بہ لحاظ موسم کے وہ صحت کو مضر نہ ہو۔

لڑکوں کو صفائی سے رہنے کی تاکید ہوگی۔ کسی لڑکے کو  
اجازت نہ ہوگی کہ وہ گولے اور کناری لگا ہوا یا بازار کا رنگا  
ہوا رنگین و نیم رنگ یا ایسا ہاریک جس میں سے بدن دکھائی  
دے کہڑا پہنے۔

کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بہت بڑے بڑے  
بال چوکان کی لوسے زیادہ نیچے ہوں مگر پر رکھے یا کاکلیں بنائے  
یا پٹیاں جلے یا مٹی لگائے یا انگوٹھی دھچکے پہنے یا کسی نگلی  
پر مندی لگائے۔

بڑے جو فقیر کریں گے ان کو کسی قسم کی مزا کے بدنی یا  
ایسی مزا جس سے رفتہ رفتہ غیرت جاتی رہے، نہیں دی جائے گی۔



یومِ مرتبہ  
کے موقع پر  
بانی درسگاہ  
کے  
مزار پر  
چاد  
چڑھاتے ہوئے  
طلباء  
اور  
وائس چانسلر  
ڈاکٹر  
عبداسلم

اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے  
کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔  
”اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے ”کالج لائف  
یا نئی زندگی“ یہی پہلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور  
اسی کا سمجھنا اصل فائدہ ادا ملے مقصود زندگی اس کالج کا  
ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح  
دکھا اور داندہ نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس  
کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیے۔ وہ نہ اسکی زندگی اور  
موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔  
”اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کالج لائف سے کیونکر فائدہ  
اٹھا سکتے ہو اور اس کو کیونکر گزارنا چاہیے۔ سب سے اول  
اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے  
رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے،  
پوڈب کے ہوں یا پچم کے، اتر کے ہوں یا دکھن کے۔ جب وہ

ساتھ پدارت محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری  
بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو  
بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے  
ہیں مگر کچھ میں تم کو ایک ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا  
ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی  
مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور  
فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے اس کے حروف و تہمت بہت پرکا  
اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس  
کے معنی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں  
اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ  
تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

”اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی  
کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس  
موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمہارے ساتھیوں کا



سب تمہاری حائل ماں (کالج) کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی نہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک حائل ماں کے بچے ہو، توڑ دیا۔

”لبرڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی، ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اور اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہو۔ تمہارا درہست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔“

”تمہارا کھانا، پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا ریڈیو جیسوں میں شریک رہنا، یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے۔ پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظالم تمہارے سر ہو گا اور تم پر افسوس ہو گا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو اسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔“ (مقالات سرسید صفحہ ۷۵ تا ۷۸)

سرسید نے بار بار اقامتی زندگی پر زور دیا ہے اور اسی اقامتی کردار کے ساتھ اس درس گاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔<sup>۹۲</sup> میں اسی مخصوص کردار کے ساتھ محمدن اینگلز اور نیشنل کالج نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہندوستان کے مختلف ہوبو کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے سے طلباء علم کی پیاس لے کر آتے ہیں اور اس بحر بیکراں سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہاں طلباء کے قیام کے لئے دس ہال ہیں جن میں آٹھ ہال سرسید ہال، وقار الملک ہال، سرشاہ سلیمان ہال، آفتاب ہال، محسن الملک ہال، راس مسعود ہال، ہادی حسن ہال اور پروفیسر حبیب ہال

طلباء کے قیام کے لئے اور عبداللہ ہال و مروجنی نائڈو ہال طالبات کے لئے آفوش مادہ جیسا سکون بہم پہنچاتے ہیں ہر ہال خود ہوشیوں پر مشتمل ہے۔

ہر ہال میں ایک کتب خانہ، مسجد، طعام گاہ، کلب (کامن روم)، مختلف کھیلوں کے کلب اور ہر وہ چیز موجود ہے جس کی کسی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ عبداللہ ہال اور مروجنی نائڈو ہال میں ہر وہ نشیں خواتین کے لئے وہ تمام اشیاء موجود ہیں جس کی بدولت وہ ہر آلائش حاصل کر سکتی ہیں۔ دوسرے ہالوں کے مقابلہ میں یہاں کچھ سختیاں ہیں مگر یہ تمام سختیاں اسی قسم کی ہیں جیسی کہ عام طور پر اپنی لڑکیوں کے لئے والدین ہمدردی سمجھتے ہیں۔

اپنی اقامت گاہوں میں طلباء ہر طرح سے آزاد نہیں ہیں بلکہ گھر کی طرح یہاں پر بھی ان پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً اگر وہ اقامت گاہ سے باہر جاتے ہیں تو ان پر فرمز ہے کہ شب کے دس بجے تک واپس لوٹ آئیں۔ وعدہ لہذا بجا کرنے کے متعلق جتنے ہیں اگر کوئی بہت ہمدردی کام ہو تو وارڈن سے اجازت لینی ہمدردی سے چھٹیوں میں اپنے گھروں کو جانے سے قبل وارڈن کو اطلاع کرنی ہمدردی ہے اور گھر سے واپس آ کر بھی آمد کی اطلاع ہمدردی ہے۔ یہاں پر طلباء و طالبات کے ساتھ بالکل اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے جس طرح گھروں پر ان کے والدین کرتے ہیں مگر گھر اور ہوشی کی زندگی میں ذرا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ گھر پر اکثر والدین سب سے بڑے بچے کو یا پھر سب سے چھوٹے بچے کو دوسرے تمام بچوں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ گوسینیرٹ اور جو نیرٹ کا ماحول یہاں پر بھی ہے مگر اس قسم کا ہرگز نہیں کہ عزیز بچے کو لاڈ پیار سے اور دیرمیاں بچوں کو لاہمداہی سے بگاڑ دیا جائے۔ یہاں پر سینئرس کو زیادہ اہمیت ہمدردی جاتی ہے مگر بالکل اس طرح جیسے کہ ایک خاندان کا بڑا زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ وعدہ تمام طلباء

۴۲-۱۹۷۱ء میں مسلم یونیورسٹی میں

طلباء کی کل تعداد — ۸۹۲۵

مسلم یونیورسٹی اس خواب کی تعبیر ہے۔ قوی یکجہی کا جو ماحول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ملنی مشکل ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایک ایسا سانچہ ہے جو ایک طالب علم کو اپنے اقامتی کردار سے مکمل انسان بنا کر باہر نکالتا ہے۔ اسی ماحول میں وہ کر دلیں کی عداوت، فرقہ پرستی، نفرت و دشمنی دھو ہو جاتی ہے اور طالب علم کی روح کو ایک ایسی نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اس کے دل میں محبت، وطن دوستی اور خدمت خلق کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ جب طالب علم ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے شعار کو اپناتے ہیں اور قوم کے آئینی ستون بن کر باہر نکلتے ہیں تو اس آدمی کی حقیقی اولاد کے روپ میں نظر آتے ہیں جس کو فرشتوں سے سجدہ کیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود قومی یکجہی کے اس حسین و جمیل جنم کو اگر کوئی فرقہ پرستی کا گڑھ کہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے ایسا سلوک جس کے بارے میں سر سید احمد خاں نے فرمایا تھا: "اگر ہمارے ساتھ ملی گروہ ہو اور ہمارے کالج کے ان پیدائشی فرقہ پرستوں کو جو جیلورڈ کے وہاں رہتے ہیں جن کی صورت دیکھ کر ہمارے دل میں پیاد آتا ہے۔ جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے اس کا تماشا دیکھو۔ باپ سے زیادہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہماری غفلت سے زیادہ کوئی چیز ان کو رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری بھڑکی، ہمارا طمانیہ ہمارا ہاتھ کی سنٹی سے ان کو جرت اور نفیست ہوتی ہے۔ مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب و تنبیہ کو۔ ایسا بلند نگہ باز اس البتہ ہماری قوم کے بچوں کو تربیع دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔"

ریپر بمقام پٹنہ ۲۸ جنوری ۱۹۸۸ء

مسلم یونیورسٹی کے ماحول میں ہر مذہب و ملت کے بھول گئے ہیں۔ یہاں ہر ایک ہی گھرے میں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلباء ایسی محبت سے رہتے ہیں کہ ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی عقائد جدا جدا ہیں۔ ایک باورچی خانہ کا پکا ہوا کھانا ایک ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ ان میں کسی طرح کا بھوت بھات کا احساس یا اختلاف نہیں ہے۔ سر سید نے قوموں کو یکجا کرنے کا جو خواب دیکھا تھا

## سر سید کے زمانہ میں علیگڑھ اسکول میں طلباء کی تعداد

۱۸۸۲	۱۸۸۳	۱۸۸۴	۱۸۸۵	۱۸۸۶	۱۸۸۷	۱۸۸۸	۱۸۸۹	۱۸۹۰	۱۸۹۱
۷	۱۲	۲۱	۳۰	۴۰	۵۲	۵۳	۵۳	۵۴	۵۷
۶۶	۸۹	۱۱۳	۱۲۳	۱۵۵	۱۲۲	۱۸۶	۱۷۹	۱۹۲	۱۹۳



محمد اکرام الشراخاں

# جسے سب سے کم سمجھا اور جانتا گیا اسکا نام ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

”سوچنے، سمجھنے، پرکھنے کی آزادی اور ہر چیز کے ہر پہلو کو جاننے کی بے لاگ خواہش“ کی وجہ سے ہے۔  
جہاں تعلیم کے اونچے معیار اور کردار کی بلندی کی توقع کی جاتی ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے اور اسے بڑھاوا دیا جاتا ہے۔

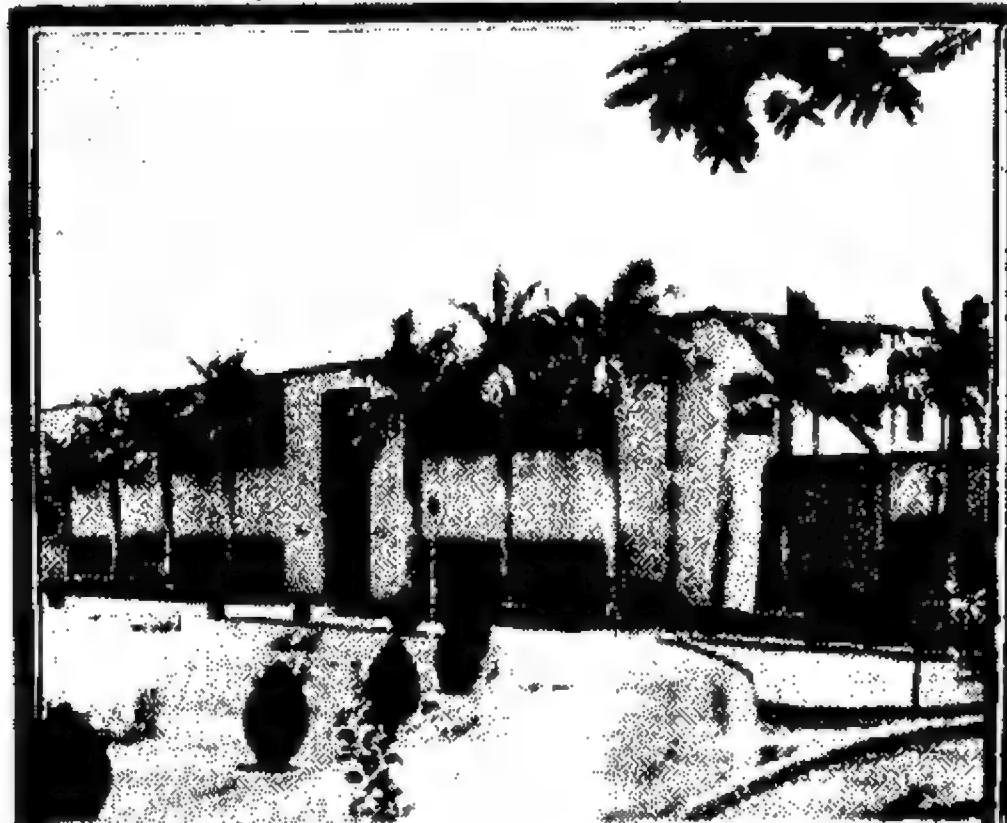
جہاں ہر طبقے اور ہر فرقے کے ہر فرد کے لئے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

اور جہاں دنیا بھر کے مختلف ممالک کے رہنے والے مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذاہب میں یقین رکھنے والے طلباء ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں اور ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔

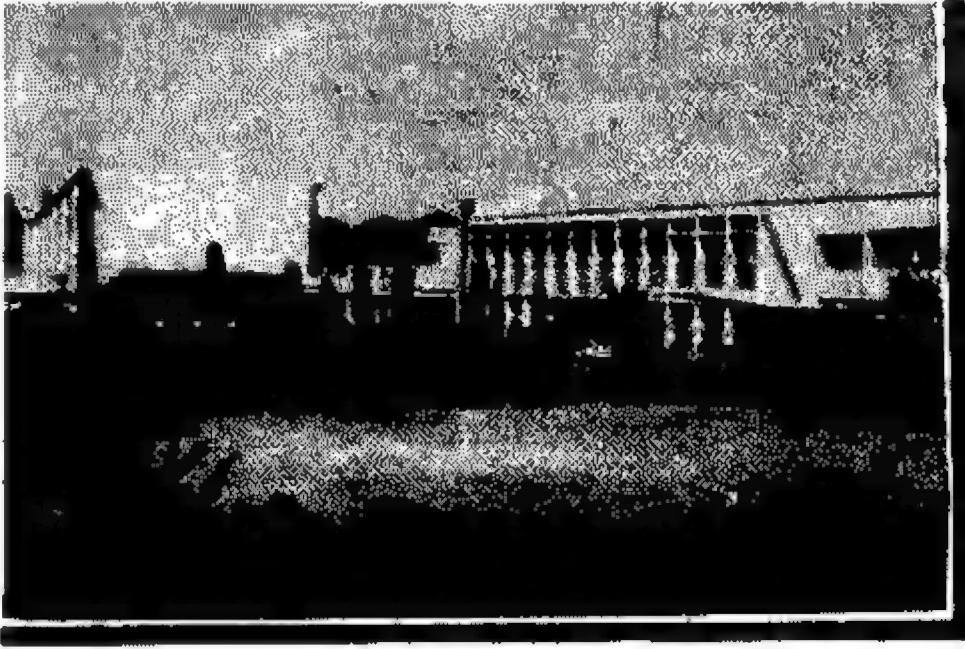
جو انسانیت، کشادہ دلی، عقل و فہم، آزادی ضمیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سب سے بڑی پہچانی یہ ہے کہ اس کو ملک کے اندر جو ایک مقام ملا ہوا ہے وہ اس کے نام یا کسی مخصوص کردار کی وجہ سے نہیں بلکہ

ذاکر حسین انجینئرنگ کالج، مسلم یونیورسٹی







### یونیورسٹی پالی ٹیکنک کالج علی گڑھ

میں طالب علموں کو اتنی شائستگی، تہذیب اور خاموشی سے اتنے لمبے عرصے تک بیٹھے ہوئے نہیں پایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ علیگڑھ کے طالب علموں کا کردار ملک کے دوسرے طالب علموں کے لئے ایک سبق ہے۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ علیگڑھ میں اس وقت جبکہ پورے ملک کی یونیورسٹیاں ہنگاموں اور تشدد کا گڑھ بنی ہوئی تھیں، پوری خوبی کے ساتھ کام چل رہا تھا۔ یونیورسٹیوں کو آزادی دینے کا اصول ایک عمدہ اصول ہے لیکن اگر کوئی یونیورسٹی سب سے زیادہ آزادی کی مستحق ہے تو وہ ہے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (سیٹھ شمیم، ۲۹ جنوری ۱۹۶۹ء)

اور سچائی جیسے بلند اقدار کی آئینہ دار ہے۔  
جو اپنے اسلامی ہونے پر اور ہندوستانی ہونے پر  
فخر محسوس کرتی ہے جو ہندوستانی کلچر کی آفاقیت اور سیکولر  
نظریات کا میرٹا جانتا نمونہ ہے۔

اور جس کے بارے میں ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، ڈاکٹر  
پی بی، گجیندر گڈکر اور ڈاکٹر ڈی، ایس کوٹھاری جیسی عظیم  
شخصیتوں نے ان الفاظ کا اظہار کیا ہے۔

"یہ میری دلی خواہش ہے کہ یہ یونیورسٹی علم کی عظیم بلندیوں  
کو چھوئے، اخلاقی رہنما ثابت ہو اور آپ میں سے ہر شخص علیگڑھ  
کا گروہ کویت ہونے میں فخر محسوس کرے۔ یہ میری سب سے بڑی  
خواہش ہے کہ یہ یونیورسٹی پوری دنیا میں اپنی بلند تعلیم اور  
اخلاق کی وجہ سے ممتاز ترین حیثیت حاصل کر لے۔"  
(ڈاکٹر رادھا کرشنن ۱۹۶۰ء)

یونیورسٹی کا نوڈکیشن (تقسیم اسناد کی تقریب) سے  
خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر پی بی۔ گجیندر گڈکر نے کہا کہ اب  
تک انہوں نے کم از کم پندرہ یونیورسٹیوں کے کانوونکشنز  
سے خطاب کیا ہے لیکن انہوں نے کہیں بھی اتنی بڑی تعداد



محمد اکرام اللہ خاں  
پبلک ریلیشنز آفیسر  
علی گڑھ  
مسلم یونیورسٹی  
علی گڑھ  
(یو پی)

"یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اس یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے تعلیم کے میدان میں پچھلے پچاس برسوں میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ یونیورسٹی کا ماضی عظیم ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل عظیم تر ثابت ہوگا۔" (۱۹۶۲ء)

علیگندہ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے وقت کی نبض کو پکڑ لیا اور ماضی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارے چاروں طرف کی دنیا تیزی سے بدل رہی ہے" اور اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ہمارے ذہن بھی اپنے آپ کو ان تبدیلیوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

آج سے سو سال پہلے انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے دوسری زبانوں کی بہترین سائنسی کتابوں کے اردو ترجموں کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لئے تحریک شروع کی۔

دسمبر ۱۸۸۵ء میں سر سید نے علیگندہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی لکھا۔

"سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک اہم مقصد ہندوستان میں پیداوار کے بہتر طریقوں کا تعارف کرانا ہے۔"

جس سے ملک کے عام لوگوں کی حالت بہتر ہو سکے۔  
سائنسی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ایک خط میں لکھا۔

"سوسائٹی کا ایک اہم مقصد ہندوستان کے باشندوں کو میکانکس کی تعلیم دینا ہے۔ ایک ایسا علم جس کے ذریعہ وہ یورپ کے نئے اوزاروں اور ایجادات کا استعمال سیکھ جائیں گے اور جن کا استعمال ہندوستان کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

سر سید نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انہیں زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرایا۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں محمدن ایگلو اور نیشنل کالج کی بنیاد رکھی اور یہ ہی کالج ۱۹۲۰ء میں علیگندہ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔

جب کالج کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا تب انہوں نے کہا "آج ہم جو بیج بوری رہے ہیں کل وہ ایک بڑا درخت بن جائے گا، جس کی شاخیں ہر گد کے درخت کی طرح زمین میں نئی اور مضبوط جڑیں بکھیریں گی۔ یہ کالج ایک وقت میں شاید جو یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے اور اس کے طلباء ملک کے اس کونے سے اس کونے تک آزادانہ علمی جستجو، کشادہ دلی، برداشت، اور اونچے اخلاق کو پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔"

## علیگندہ کالج میں طلباء کی تعداد

۶۱۸۸۰	۶۱۸۸۱	۶۱۸۸۲	۶۱۸۸۳	۶۱۸۸۴	۶۱۸۸۵	۶۱۸۸۶	۶۱۸۸۷	۶۱۸۸۸
۷	۸	۱۳	۱۳	۲۳	۲۰	۲۷	۲۷	۳۰
۸	۸	۱۴	۱۴	۲۴	۱۹	۲۳	۱۹	۳۹

(انتخاب عالم اتاریخ درستہ العلوم علی گڑھ ۱۳۵۰ء)

## مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم غیر ملکی طلباء کی تعداد

مرد	عورت	کل
۱۱۳	۲۰	۱۳۳
۲۵	۵	۳۰
۲۱	۲	۲۳
۲۴	۲	۵۱
۸	—	۸
۹	۲	۱۱
۸	۲	۱۰
۱	—	۱
۲	—	۲
۶	۱	۷
۱	—	۱
۳	۱	۴
۳	۱	۴
—	۱	۱
۵	۱	۶
۱۱	—	۱۱
۱۱	—	۱۱
۴	—	۴
۲	—	۲
۱	—	۱
۲	—	۲
۲	—	۲
۲	—	۲
۲	—	۲
۱	—	۱
۱	—	۱
۱	—	۱
۱	—	۱

میزان ۳۵۲

ماضی کی کھڑکیاں کھولنے پر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ لندن اینگلینڈ میں کالج کی تمام سالانہ رپورٹیں مندرجہ ذیل اعداد سے شروع ہوتی تھیں۔

یہ کالج ایک قومی ادارہ ہے جو مسلمانوں نے اپنی قوم کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قائم کیا ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا اور مغربی سائنس و ادب کی تعلیم دینا ہے۔ لیکن اس ادارے کا کردار کیتھولک ہے (یعنی سکولر) اور یہ تمام طبقوں اور قوموں کے لئے کھلا ہوا ہے، ہندوؤں کو بھی وہی درجہ حاصل ہے جو مسلمانوں کو۔

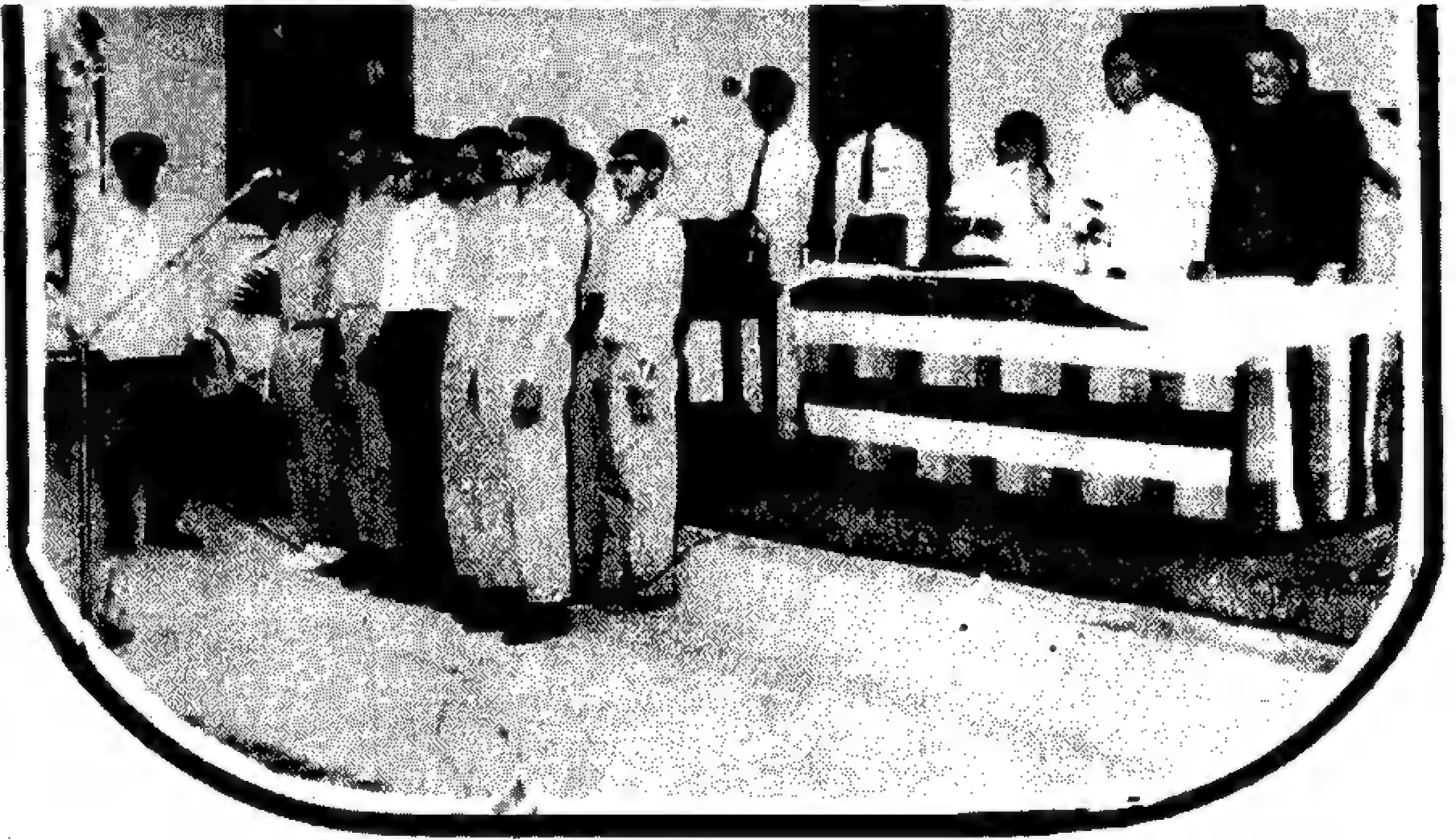
(۱۹۸۵ء کی سالانہ رپورٹ سے اقتباس جسے میننگ کینی کے اعزازی سکریٹری سید احمد نے پیش کیا۔) جناب ایٹوری پر ساری یونیورسٹی کے پہلے گورنر تھے جناب جے، سی، چکرورتی اور ہندوؤں کا شمار یونیورسٹی کے پہلے ممتاز ترین استادوں میں ہوتا تھا۔ پہلا سپانسر مہاراجا آف پٹالہ کو پیش کیا گیا۔ مہاراجا بنارس، مہاراجا پٹالہ اور مہاراجا جے کشن داس نے یونیورسٹی کو بڑے بڑے عطیے دیئے جنہیں شکریے کے ساتھ قبول کیا گیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے یونیورسٹی تمام میدانوں میں تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ پچھلے چار برسوں میں ترقی کی رفتار بہت ہی تیز رہی ہے اور اسی نئے میں یونیورسٹی میں بہت سے قابل ذکر اضافے ہوئے ہیں۔

پورے ملک اور پوری دنیا کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے بھی اس سال دو سو سالہ برسیاں اور ایک پانچ سو سالہ برسی منائی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی سو سالہ برسی بہت دھوم دھام سے منائی گئی جس میں دنیا بھر میں رہنے والے اردو کے قدردانوں نے حصہ لیا۔ گاندھی خستہ دہی کی تقریبات تمام حال چلتی رہیں۔ اور گورنمنٹ کی پانچ سو سالہ برسی بھی بہت

اردو ٹانجہ شہر ماگست ۱۸۵۶ء





احمدی نابینا اسکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک تقریب

سلائی اور ایکٹرڈنگ انجینئرنگ میں پروڈکشن کے نئے شعبوں کا اضافہ کیا گیا، میڈیکل کونسل آف انڈیا نے ایم، بی، بی ایس کے کورس کو مان لیا۔ بی، ایس، سی کی ڈگری کو بحریہ میں ایکٹرڈنگ اور میڈیکل انجینئرنگ میں داخلے کے لئے قبول کیا جانے لگا۔ یہ سب مسلم یونیورسٹی کی موجودہ ترقی کے چند نمونے ہیں۔

خواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے لئے شاندار عمارت تعمیر کی گئی، اس میں اسپتال اور ۳۲۵ طلباء کا ہوسٹل تعمیر کیا گیا۔ لڑکیوں کے پولی ٹیکنک اور علم الحساب کے شعبوں کے لئے علیحدہ عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ ۲۶۰ لڑکیوں کے لئے اور ۸۵۰ لڑکوں کے لئے علیحدہ ہاسٹل تعمیر کئے گئے۔ سرسید احمد خاں کے گھر کی مرمت کی گئی۔ اس کے علاوہ آرٹ فیکلٹی میں اضافی تعمیرات کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ یہ سب وہ کام ہیں جن کے لئے یونیورسٹی جتنا بھی خر

ہی جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔

ان چار برسوں میں منگوسنگ اور سوشیولوجی کے دو نئے ڈیپارٹمنٹ قائم کئے گئے، آرٹ فیکلٹی کو دو حصوں یعنی سوشل سائنسز اور آرٹس میں تقسیم کیا گیا، بزنس مینجمنٹ میں پوسٹ گریجویٹ کورس اور ڈاکٹریٹ یونانی میڈیسن کا تین سالہ کورس شروع کیا گیا، پکڑوں کے ڈیزائن، پکڑوں کی

### مسلم یونیورسٹی میں طلباء کی اقامت گاہیں

ایس ایس ہال۔ آفتاب ہال۔ وی ایم ہال۔  
سیلمان ہال۔ ایم۔ ایم ہال۔ اس مسعود ہال۔  
یادو حسن ہال۔ محمد حبیب ہال۔ این آئی ایس ہال  
عبد اللہ ہال۔ سرود جی نائیڈو ہال۔

## مولانا آزاد لائبریری

۱۹۷۲ء

۲۲۵۶۵۱

کتابوں کی کل تعداد

۲۲۵۰

قلمی نسخے

۷۰۰۰

ممبر شپ

۲۷۵۰۰۰ روپے

سالانہ بجٹ ۱۹۷۱-۷۲ء

محسوس کرے کم ہے۔  
پچھلے چند برسوں میں یونیورسٹی کی فہم ترقی کا اندازہ  
ان چند اعداد و شمار کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

۱۹۷۱-۷۲ء

۱۹۷۲-۷۳ء

۷۵۵

اساتذہ کی تعداد ۲۲۰

۲۲۵

ریسرچ اسکالرز ۲۱

۷۲۲۲

طالب علموں کی مجموعی تعداد ۳,۶۱۳

۸,۹۰,۰۰۰ روپے

لائبریری کا بجٹ

۳,۸۶,۳۸۱

لائبریری میں کتابوں کی تعداد ۷۵,۲۹۰

(۳۱ مئی ۱۹۷۰ء تک)

۱۹۷۲ء کے بعد مندرجہ ذیل شعبوں اور نئے قلمی

مرکزوں کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔

فیکلٹیز :- قانون، کامرس، طب (میدین) تھیولوجی اور

سوشل سائنس (سماجی علوم)

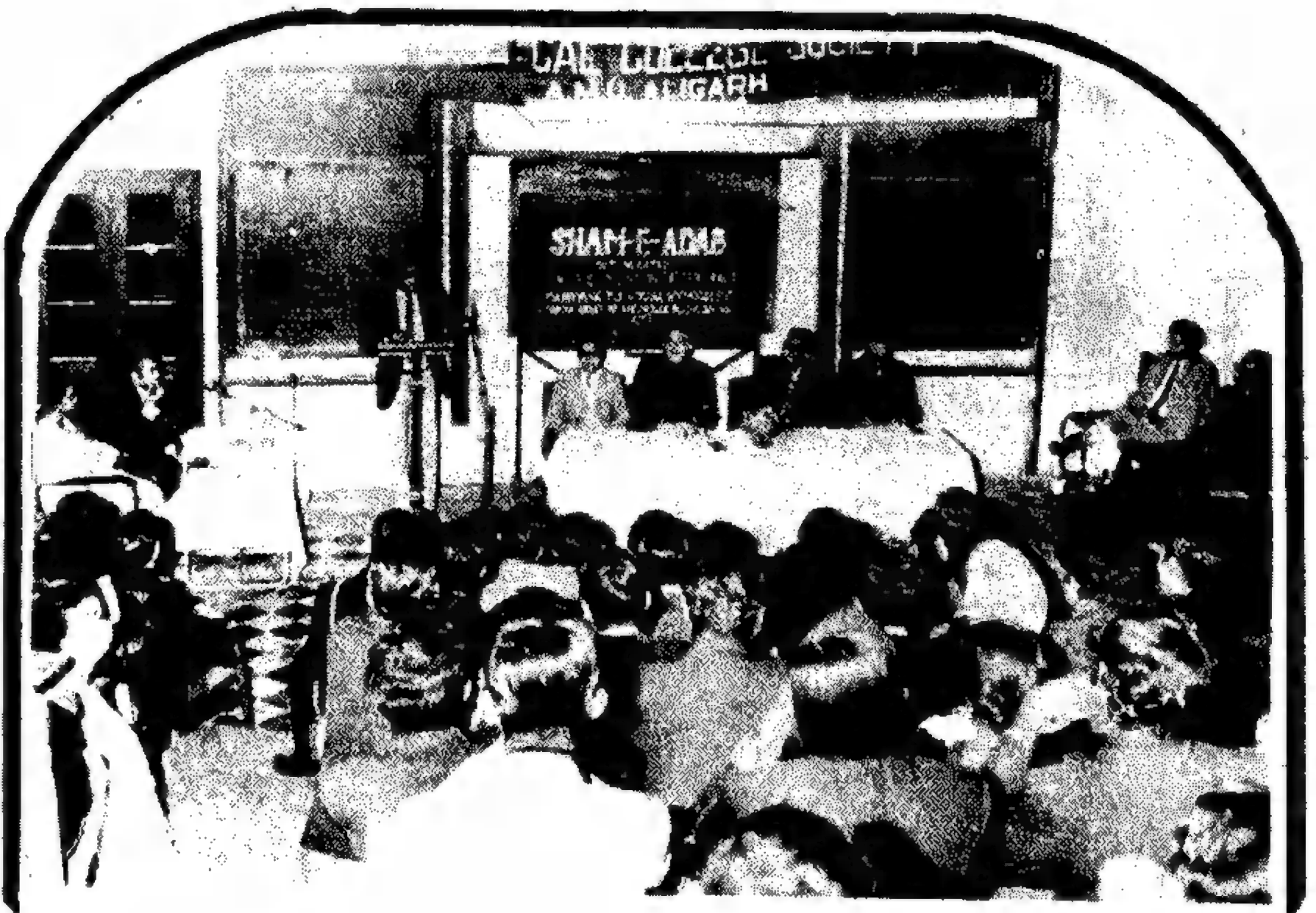
سینٹر اور انسٹی ٹیوٹ :- انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک  
اسٹڈیز، عام تعلیم کا سینٹر، تاریخ کی ادنیٰ تعلیم کا مرکز، مغربی  
ایشیا کے علوم کا مرکز۔

ڈیپارٹمنٹ :- سوشیولوجی، لائبریری سائنس، ایپلائڈ  
سائنس اور ٹیکنالوجی۔

یونیورسٹی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہاں

کا اقامتی کردار ہے۔ اس طرح طلباء کو نہ صرف پڑھنے کا بلکہ

مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں سالانہ جلسہ کے موقع پر "شام ادب"



# سرسید کی موت پر یورپین لیڈی کا مرثیہ

منجملہ ان بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس بزرگ عظیم (سرسید کی وفات) پر لکھے گئے چند اشعار ایک یورپین لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیتے ہیں جو ہر نظری دنیا میں شاید پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اسلئے ہم اس بیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

”ایک تنادہ درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اکی سا بیٹا شاخیں جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں، صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی اور انہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، ان کے سایہ میں بجز زمین اصلاح پا گئی۔“

”بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلے نکلے اور خوبصورت نو بہاؤں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس دیرین ریگستان کو گلزار بنادیا۔ روؤ! اب شاہانہ درخت کے نئے کہ اجل نے اس کو گرا دیا ہے۔“

”غم کرو مگر امید کے ساتھ! کیونکہ اس کی ہری بھری کھوپڑی جو اس کی ساہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اس کی قبر کے گرد ملہا رہی ہیں۔ جن نو بہاؤں کو اس نے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھلک رہے ہیں۔ یہ نو بہاں بھی اسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی دیرانہ کو گلزار بنا جائیں۔“

”حیات جاوید“ حصہ اول ۲۴۵-۲۴۶

اگست کو کندھے سے کندھا ملا کر قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، یا عید ملن اور ہولی ملن کا تہوار مناتے ہیں، تب قومی ایکتا اور دل کر رہنے کا جذبہ تمام فضا کو رنگین بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہم گنگا اور جمنہ کے سنگم پر سرسوتی کو نہیں دیکھ پاتے اسی طرح ہم یونیورسٹی کے سب سے زیادہ خوبصورت پہلو یعنی بلند اخلاق اور کشادہ دلی کو نہیں دیکھ پاتے، اور جس پر سب لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ ہے اس کا ”اقلیتی کردار“ یا جو کچھ بھی ہم اسے کہیں۔

اس لئے ہماری خواہش ہے کہ یہ مختلف رنگوں کے خوشبودار گلاب جو یونیورسٹی کی عمدہ آب و ہوا میں پرورش پا رہے ہیں، غلط فہمی اور تعصب کی گرم ہواؤں کا شکار ہو کر پامال نہ ہو جائیں۔

ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے۔ زیادہ تر استاد اور دوسرے آفیسر بھی یہیں رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے طالب علموں اور استادوں کے درمیان بہادرانہ اور دوستانہ رشتے قائم ہیں۔ استاد اپنے طالب علموں سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں اور طالب علم اپنے استادوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔

یہاں صرف تکنیکل اور بنیادی تعلیم پر ہی زور نہیں دیا جاتا بلکہ لڑکے کی اخلاقی اور روحانی تعلیم پر بھی پورا پورا دھیان دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے اندر اخلاقی اصول انسان دوستی اور برداشت کا مادہ پیدا کر سکے جو تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری بہت سی ایسی قدیمیں ہیں جنہیں قائم رکھنے کے لئے ہم ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ بہت سے میلے اور فنکشن کرائے جاتے ہیں۔ جب تمام طلباء ۲۶ جنوری یا ۱۵



# کالج کی صرائف



سلسلہ میں  
موشنکٹ رہنما  
اشوک ہست  
علی گڑھ  
مسلم  
یونیورسٹی  
کے  
جلسہ  
تقسیم اسناد  
کے  
موقع پر

(ازم محمدا احمد صاحب، معلم مدرستہ العلوم علیگڑھ)

خیال کرتے ہیں۔ حسن اتفاق سے پریسیڈنٹ صاحب خواجہ کبیر  
کے خطوط کا فائل میرے ہاتھ لگ گیا تھا جسکو میں ہدیہ ناظرین  
کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلحاظ دہائی وہ اپنے طرز کا نرالا خط تھا۔  
جس کا اندازہ خود ناظرین کریں گے۔

جناب پریسیڈنٹ صاحب! ورنڈرس کیٹی — تسلیم!  
جناب کو معلوم ہے کہ آجکل تقریریں کے طلباء اپنے لئے کسی نہ کسی

کالج کی زندگی بھی آج کل ایک عجیب قسم کے پھل  
میں گنتی ہے۔ بہت سے پڑھنے کے شوقین اس شور و شغب  
سے گھبرا کر جنگل کا راستہ لیتے ہیں تاکہ وہاں اس سے محفوظ رہ کر  
اپنی پڑھائی میں مصروف رہیں۔ برخلاف اس کے بہت سے ایسے  
ہیں جو کالج کی زندگی کا لطف اس غل غپاڑہ میں سمجھتے ہیں اور  
اس میں حصہ لینا کالج لائف کے مقاصد کا ایک بہترین مقصد

اشوک ہست یونیورسٹی کے ذمہ داروں کے ساتھ



پوزیشن کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ کچھ اگر کریکٹ، ہاکی یا فٹ بال کی کپتانی کے لئے کوشش کر رہے ہیں یا اس کی خواہش میں ہیں تو دور مری ڈائنگ ہال، فلار یا ہاؤس کی سیر مائٹری کی فکر میں ہیں کچھ لوگ ان تمام کھیلوں کے سکرٹری بننے کی خواہش کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں تو ٹینس کی سکرٹری شپ کا انتظار کر رہے ہیں اور زیادہ تر جھٹا ایسا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ دیکھئے ان کی قسمت ڈائنگ ہال، مسجد یا ہاؤس

وہ اسکیں پیش کرتا ہوں جو اس فرقہ بن نزع کے بارے میں میرے دماغ میں منڈلا رہی ہیں اور اس سے جناب پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ عہدہ مذکور کے لئے مجھ سے زیادہ کوئی بھی موزوں نہیں ہے۔ آخری فیصلہ جناب کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔ جناب والا! قریب قریب ہر جگہ جہاں بھی پھری دال کا دور دورہ ہے۔ اس قسم کی صدائیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو کہ منہ سے نکلتی ہیں۔ اور دوسری وہ جو کسی باجہ سے

## اقامتی کردار کا نمونہ

### سرسید ہال

مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داران اور  
عہدہ داران (جو اساتذہ اور طلباء  
پر مشتمل ہیں)



میں سے ان کو کس طرف لے جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے معزز و مقتدر عہدوں کے لئے وہی لوگ تجویز ہوں گے جن کے حقوق بہت زیادہ ہوں۔ اس لئے کالج کے موجودہ عہدوں سے ترجمہ کو بالکل مایوسی ہے مگر بحیثیت کالج کے ایک ممبر ہونے کے میں ان حقوق کو بخوبی محسوس کرتا ہوں جو کالج کے مجھ پر واجب ہیں اور اس لئے کالج کی خدمت کا ایک ایسا ذریعہ منتخب کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگوں کے حقوق بھی پامال نہ ہوں اور میں بھی اس بارگراں سے سبکدوش ہو جاؤں جو کام کہ میں نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ وہ کالج کی صدائوں کی نگرانی کرنے کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس عہدہ سے میں نہ صرف اپنے لئے اقتدار و پوزیشن حاصل کروں گا بلکہ اس سے میں کالج کے طلباء کی ان عام شکایتوں کو بھی رفع کر سکوں گا جو خواہ مخواہ ان یا اور ایسے ہی شور کرنے والی جماعت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں جناب کے روبرو

بد قسمتی سے کالج کی چہار دیواری کے اندر صرف اول الذکر سے کام لیا جاتا ہے اور آخر الذکر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ چند اہم محسوس ہوتا اگر منہ سے نکلی ہوئی صدائیں مریلی اور دیکش ہوتیں مگر افسوس ہے قصداً ٹھروں سے اجتناب کیا جاتا ہے اور اکثر غلط ٹرننگ لینے کی کوشش کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ماہران فن موسیقی جن کی تعداد یہاں کثرت سے ہے اور فن مذکور کے مزاج جو کہ قریب قریب سب ہیں اس فن پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر کس قدر بیگم ہوں گے۔ میں ان کے محسوسات کو مد نظر رکھ کر ان لوگوں کی صدائیں پہلے خود سنوں گا اور جس وینڈر کی آواز کان کے پردے پر برا اثر ڈالنے والی ہوگی اس کو احاطہ کالج میں گھسنے کی اجازت نہ ہوگی یا کم از کم اپنے پڑوسی کی مدد سے جو تال و سر میں یہ بٹولی رکھتے ہیں اور جو کہ اپنے زمانہ کے تان سین ہیں۔ ایسے لوگوں کی آوازیں سننے والے کی کوشش

کروں۔ لہذا یہ سب سے زیادہ مقدم فرم ہو گا کہ جس قدر انگریزی چیزیں بھی کالج کے اندر فروخت ہونے کو آئیں ان کا ایک نہایت محض امداد نام رکھ دیا جاوے۔

حامیان امداد کو کس قدر گراں گزرتا ہو گا جبکہ ٹینس کے بچے دوست کرنے والا نہایت سب سے ترقی سے کہتا ہوا گزرتا ہے بلڈ راکٹ بلڈ مرمت باٹ والا۔ راکٹ والا۔ ملا۔ باٹ والا یہ حرکت اگر صرف ایک ہی تک محدود

کروں گا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھوں گا کہ ہر ایک دینڈر کا ٹراس کے مال کی مناسبت سے ہو۔ پیشی چیزیں فروخت کرنے والوں کا ٹریٹمنٹ انہیں چیزیں فروخت کرنا والوں کا ٹریٹمنٹ ہو۔ جس دینڈر کے پاس دونوں طرح کی چیزیں ہوں اس کی صدا میں دونوں طرح کے ٹریڈوں کے مگر ٹریڈ ہوگی کہ جس قسم کی چیز زیادہ ہوگی اسی طرح کا سر لمبا امداد دہری طرح کا سر چھوٹا ہو یہ بھی خیال رکھا جائے گا کہ تازہ مال کے



ہوتی تو کچھ برج نہ تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر بھی اس پیشہ والے میں سب سے اپنی پختایت کر کے اس اوٹ پٹا بولی کا انتخاب کیا ہے۔ مجھ کو ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں اردو کی اس بے ادبی کو دیکھ کر کوئی جلتی قہقہہ میں نہ آجائیں اور اس کو زد و کوب کر بیٹھیں۔ جس سے کہ کالج کی شہرت کو صدمہ پہنچے۔ شکر ہے کہ ابھی تک اس کی کوئی نظر قائم نہیں ہوئی۔ مگر ہر چیز کی احتیاط لازمی ہے اور جلد سے جلد اس بولی کا سنبھالنا ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ چونکہ اس کا پیشہ کھیل سے تعلق رکھتا ہے لہذا اس کی صدا بھی کھلونا کی شکل میں نکلتی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو زبان ہی دنیا میں ایک زبان ہے جو اس قسم کی بے سرو بے پاؤں کی بولیوں کے لئے تہہ مشق بنائی جاوے۔ میں اس مناسبت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا اور اس کی جگہ ایک ایسی زبان دوں گا جو

واسطے زور دار آواز میں اور باسی مال کے لئے ہلکی آواز میں ٹریٹمنٹ ایسا کرنے سے گھر کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے خواہجہ کے کل حالات معلوم ہو سکیں گے۔ اگر یہاں ان لوگوں کی حالت ٹھیک نہ ہو سکی تو مجھ کو لکھنؤ سے ایسے پھری دالے بلا لئے جائیں گے جو کہ اس فن کے استاد ہیں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا تو نہ معلوم کتنے اور پیدا کرے گی مگر اس مٹی گڑھ میں جہاں انگریزی کی بوجھ درجہ ساگنی ہے ایسے لوگوں کا خود بخود پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے اس انگریزی کی برہی نے تو تمام چیزوں کے نام انگریزی میں تبدیل کر دیئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انڈیے کی مٹھائی کو اسٹیلنج اور ناریل کی مٹھائی کو کوکوٹ سے موسوم کیا جاتا ہے میں نے اردو آب و ہوا میں پرورش پائی ہے اور اس عمر کو پہنچا ہوں۔ میں نہایت ناشکر گزار ہوں گا اگر میں اس کے حقوق کو پوری طور پر تسلیم نہ کروں اور اس کی خدمت کی انجام دہی میں کوتاہی



## رقبہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کا رقبہ ۶۶۳ ایکڑ  
میدان کی کمیٹی کا رقبہ ۱۹۵ ایکڑ  
کل رقبہ ۸۵۸ ایکڑ

بذات خود ایک کھونا ہوئی۔

جناب والا! صبح کے وقت نہایت خوشنودری پہنچے ہوئے مکھن والا مکھن چاہئے صاحب کی صدا لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ میں نے اس قوم کے صوفی اسی ایک شخص کو اپنی آواز کے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ صنعت ہجے سے اپنی صدا کو شعر کی صورت میں نکالتا ہے۔ میرا فرض ہوگا کہ اس کو بتاؤں کہ شاعری میں صوفی صفت ہجے ہی ایک ایسی صنعت نہیں ہے جس سے کہ اشعار بنتے ہیں بلکہ ادب ہی بہت سی صنعتیں ہیں اور اگر ان کا لحاظ رکھ کر اشعار بننا جائیں تو بہت بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شاعروں کی یہاں کمی نہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ان تک جس قدر میری رسانی ہے کسی دوسرے کی نہیں۔ ان کے مشوروں سے نامزد ہوا تھا کہ اس کی صدا میں وہ حالات پیدا کی جاسکتی تھے کہ جو سننے خوش ہو اور دل بہلے۔ برخلاف اس کے کس قدر ناگوار ہوتا ہے جب موچی جو نتا سٹے گا صاحب جو نتا کی صدا لگاتا ہوا نکلتا ہے۔

جناب والا! اگر اس کے ہجے پر غور کیا جاوے تو بہتر ہی مترشح ہوتی ہے۔ اگر الفاظ کے خارج کو دیکھا جاوے تو غلط۔ اگر آواز کا خیال کیا جاوے تو درست۔ غرض کسی لحاظ سے بھی اس کی صدا قابلِ سماعت نہیں ہے۔ بعض افراد بد ہنری کی انتہا کر دیتے ہیں جبکہ لفظ جو تا پر بلاوہ زیادہ زور دے

۱۹۲ اردو ڈائجسٹ ہمارا اگست ۶۷

بھیٹتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آج میرے برابر صوفی کا ٹھیک عروج جائزہ لاکوئی نہیں ہے۔ میں آسانی سے ان لوگوں کو صوفی کے اصلی عروج بتلا سکوں گا اور ساتھ ہی ادب بھی سکھلاؤں گا۔ ان کے ہجے کی اصلاح کروں گا۔ مجھ کو یقین ہے کہ میری اس کامدوانی سے ان کی آواز ملائم پڑ جائے گی اور بغیر ہار جھوٹے یہ لوگ گزر جایا کریں گے۔ یہ تعجب ہے کہ نان خطائی والا جو اکثر کالج کے مدعو ہیں۔ نان خطائی۔ چلتا۔ تاہو پھر تاہو۔ بورڈنگ میں گھسنے نہیں پاتا۔ وہم کالج کے ہسپتال میں ماہر امراض کان کی ضرورت پڑ جاتی۔ اپنی مدد کے نکلنے میں ایڑی تک کا زور صرف کر دیتا ہے۔ میں دل میں کہا کرتا تھا کہ کاش اس کو اقتصادیات کے علم سے واقفیت ہوتی تو وہ سمجھتا کہ اس کی محنت اس کے نفع سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اس سے اس قدر زور سے آواز نکالنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میری آواز کو بچے دھڑ سے سن کر اپنی اپنی ماؤں سے پیسے مانگنے لگتے ہیں اور میرے ان کے پاس پہنچنے تک وہ دروازہ پر پیسے لے تیار رہتے ہیں اور اس طرح میں اپنا بہت سا وقت پس انداز کر سکتا ہوں۔ جواب اس قدر معقول تھا کہ مجھے اپنے خیالات کی غلطی تسلیم کرنا پڑا مگر چونکہ بورڈنگوں کے اندر کسی کی مائیں نہیں بھی ہیں اس لئے کڑخت آواز کے ساتھ اس کا یہاں آنا گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ آواز کی کڑختی اس کی ابھی ادب خستہ نان خطائیوں کو شائقین کے من سے الگ رکھے۔ لہذا اپنی آواز کی شرط کے ساتھ اس کو اند آئے کی اجازت ملنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شرط پر خود وہ تیار ہے کیونکہ اکثر باروں کے پیچھے اپنے منہ ہی منہ میں اپنی صدا کے ساتھ گشت کرتا ہوا پایا گیا ہے۔

قیرنی کے پیالے والے کا بھی ایک خاص وقت معین ہے۔ ہمیشہ ساڑھے بارہ بجے دن کو شیشی بچ کی صدا لگاتا ہوا تیزی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ ہدایت اللہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء اور اس چانسلر ڈاکٹر طیم کے ہمراہ سر سید احمد خاں کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے

ہے۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی آواز بہت اصلاح طلب ہے۔ یہ اپنے گاہکوں کو غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا اور ان کے ارادہ کرتے کرتے پوچھیں گئے کہ لے لو جھل ہو جاتا ہے جناب لالا! اسکی رفتار اور آواز سننا لینے کا فرض بھی میں اپنے اوپر ہی ہوں گا۔

جناب والا! اس قدر رکھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اب موقع ہے کہ آپ کی توجہ اس زبردست شخصیت کی طرف جمع کرادوں جو آج تمام خواجہ والوں کی ناک اور سچ تو یہ ہے کہ سب کی لالچ رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ کالج اس صیغہ میں کہیں کا بدنام ہو چکا ہوتا۔ کھانا کسی تعریف کی ضرورت نہیں رکھتا۔ "پان بیٹھا پان" کی صدا کس قدر صاف اور کس قدر بھلی معلوم ہوتی ہے کہ سننے والے دل سے تعریف کرتے

سے گزرتا ہے مجھ کو اس کے سانس پر کس قدر رشک آتا ہے جبکہ ایک ہی سانس میں اس کو دس دس کمرہ لے کر تا ہوا دیکھتا ہوں تیز رفتاری بھی غضب کی ہے۔ جب آواز دو چار پانچ کمرہ آگے سے لوٹتا ہے اس کی لمبی سانس اس کی صدا کو کبھی صاف طور سے معلوم نہیں ہونے دیتی۔ اکثر اس کو کسی کمرہ پر بیچ و فروخت کی گفت و شنید کے لئے بیچ بیچ میں سانس توڑنا پڑتا ہے اس کا قول ہے کہ میں "شیر بر بیج" کہتا ہوں مگر کوئی بھی اس صدا کو نہیں سمجھتا اور اکثر نئے حضرات صرف اس کے پیچھے چلنے والے مزدور کے نوکر سے اس کے مال کا پتہ معلوم کرتے ہیں، بزنس بہت زیادہ سمجھ رہا ہے اور اگرچہ اس کو تیز چلنا پڑتا ہے مگر اس بات کی احتیاد رکھتا ہے کہ مالک سے پانچ کمرہ پیچھے چلتا ہے تاکہ مالک کے ساتھ اس کو بھی اس قدر نہ لوٹنا پڑے جتنا کہ وہ لوٹتا

ہیں عام لوگوں کے لئے سوائے آواز کی خوبی کے اور کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکتا مگر اپنے محاکمہ کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کرتا ہے اور ان کے خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کرتب کرتا ہے۔ کبھی وہ کسی پیادہ پلٹن کا سپاہی بن کر قواعد کرتا ہے اس کے لئے کسی جمہور کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کا کام بھی بولی بول کر جوہی کرتا جاتا ہے۔ کبھی کسی ہٹے اٹھارے کا پہلوان بن کر طرح طرح کے ڈنڈ اور داؤں بیچ دکھاتا ہے اور کبھی انگریزی کی اے۔ بی۔ سی۔ ڈی شروع سے آخر تک فر فر سنا جاتا ہے۔ اتنی سمجھ بھی رکھتا ہے کہ موقع اور محل کو پہچانے اور اپنی تمام حرکات اسی وقت کرتا ہے جبکہ اس کو علم ہو جاوے کہ اس کا گاہک ان سے خوش ہو گا۔ اکثر نگار محنت کے بعد اس نے دماغ کو فرحت پہنچانے میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھانی نے چھوٹوں بڑوں سب میں ہر دلچیزی اختیار کی ہے۔ ہر دلچیزی کے اعتبار سے غلام حسین کا نمبر بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں کھانی کے اوصاف میں سے ایک وصف بھی نہیں۔ تاہم اس میں ایک دل ہے جس کی وجہ سے اس نے دوسرے کے دلوں میں گھر کر رکھا ہے۔ اس کا ہر ایک شخص پر اعتبار ہے اور اگرچہ بعض اوقات اس کو نقصان ٹھٹھا پڑا ہے مگر زبان پر کبھی شکایت کو نہیں لاتا اور اپنے پرانے بنائے ہوئے اصولوں پر برابر کار بند ہے۔ یہ باتیں اس کی زندگی ہی تک ہیں کیونکہ جو بچہ اس کے ساتھ پھرا کرتا ہے اور جو آئندہ اس کا جانشین ہو گا بڑا کوتاہ دل ہے اور اگر کوئی اس کے خواہجہ میں ہاتھ ڈال دے تو رو دیتا ہے۔ غلام حسین اور کھانی دوسرے خواہجہ والوں کے لئے مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک شخص ہر دلچیزی اختیار کر سکتا ہے اور گاہکوں میں ہر دلچیزی خواہجہ والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

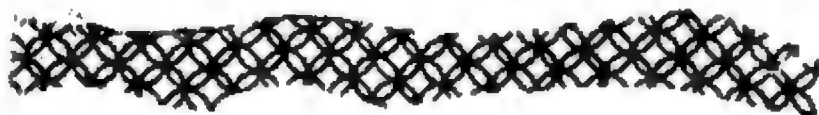
ملانی والے سے مجھ کو جس قدر نفرت ہے اتنی کسی شخص

سے نہیں۔ یہ بات ضرور سہکاس کا رت گریزوں میں بہت ہی زیادہ لطف دیتا ہے مگر جاڑوں میں اس کی آواز بھی سردی کا اثر کر جاتی ہے اور بیمار ڈالنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ گریزوں کے دنوں کے علاوہ جب کبھی بھی وہ برت فروخت کرتا ہوا پایا جادے تو ہمارا فرض ہے کہ فوراً ہی اس کے مال کو تلف کر دیں۔ مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے بچے اور ادوں کا لحاظ رکھ کر کوئی قانونی کارروائی ہم پر نہ ہو سکے گی۔ جناب دلا قبل اس کے کہ اس عریفہ کو ختم کروں اس گندی کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اکثر ٹینسل بیدلا چینیلی کہتا ہوا بڑی تکلیف کے ساتھ اپنے تھکے ہوئے اعضا کو گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔ اگر اس کا کہنا ٹھیک ہے کہ اس کی ٹرکا ایک بڑا حصہ کالج میں تیل بیچتے ہوئے گزرا تو کالج کا یہ فرض ہے کہ اپنے پرانے کاروباری کی اس کی ضرورت کے وقت مدد کرے اور اس کے رہنے کو کالج کے احاطہ ہی میں کوئی دکان بہت ہی سستے کر ایہ پر دے دے۔ تاکہ باقی حصہ زندگی بھی وہ کالج ہی میں نیل بیچ کر کاٹے۔

جناب دالا اس قدر بکھنے کے بعد میں اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ مندرجہ بالا کام بہت آسان معلوم ہوتے ہیں مگر ان لوگوں کے لئے جو ظاہر بہت کچھ ہیں لیکن دل لگا کر کام کرنے کا سبق ان کے استاد نے ان کو نہیں سکھایا۔ اس میں کا ہر ایک جزو ایک ہم عظیم ہے اور تمام کام اسی وقت سرانجام پاسکتے ہیں جبکہ کام کو نیلے ظاہری نام نمود کو چھوڑ کر ہم تن اس کام میں معروف ہو جاویں۔ آخر میں مجھ کو امید ہے کہ جناب دالا امیری مرصداشت کو قبول فرماویں گے۔ میں ہوں جناب کا تابع دار۔ ”بواہوس“

(ماخوذ: از علی گڑھ ملتعلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء)

(جلد نمبر ۱۳۔ شمارہ نمبر ۱۲)







# علم کے اسی سوختے بارے میں



## مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے

رہی ہیں۔ لوگوں کے ذہن سیکڑوں برس پرانے رواج اور جہالت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ رنگ خوردہ اعتقاد اور بوسیدہ جذبات کسی بھی قسم کی تبدیلی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مذہب کے دشمنوں نے اس جنگ میں مذہب کو اپنا سب سے خطرناک ہتھیار بنالیا۔ علم، عقل و دانش اور مذہب میں کہیں بھی کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے سامنے اس کو اسی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ نعرہ لگایا گیا کہ نئی تعلیم مذہب کے خلاف ہے اس لئے نئی تعلیم حاصل کرنا اپنے مذہب سے دور ہٹنا ہے۔

”آج مغربی تعلیم ہماری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہے اور ہم قدرتی طور پر جب بھی تعلیم کے بارے میں سوچتے ہیں ہمارا اشارہ اس کی طرف ہوتا ہے۔ آج ہمارے لئے ان تکالیف، مشکلات اور مخالفت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے جو ان لوگوں کو پیش آئیں جنہوں نے جدید تعلیم کو ہم تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف ایک نئی راہ پر ایک نئے سفر کا آغاز کیا تھا بلکہ انہیں ہر قدم پر انجانی رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ انہیں بھی ان تمام طاقتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ہر دور میں ہر جگہ نئی تبدیلیوں اور ترقی کی مخالفت کرتی

## پتہ جو ابرال نہی

وہ (سر سید) ہندوؤں کے خلاف یا فسقہ

پرست نہیں تھے، انہوں نے بار بار اس بات پر زور

دیا کہ مذہبی اختلافات کو کوئی سیاسی یا قومی اہمیت

نہیں دینی چاہئے انہوں نے کہا۔ کیا تم سب ایک

ہی ملک میں نہیں رہتے ہو؟ یاد رکھو کہ لفظ ہندو

مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں ورنہ ہمارے

ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی ایک

ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ (تلاش ہند)

علم کو ان رُکاوٹوں کا مقابلہ مختلف اوقات

میں مختلف ملکوں میں کرنا پڑا ہے۔ یورپ

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں اس دور سے

گزر رہا تھا کہ مشرق میں یہ دور ۱۹ویں صدی

میں شروع ہوا۔ ہندوستان کے ہندو ۱۸ویں دور

میں پہلے داخل ہوئے اور جلد ہی اس سے گزر گئے۔

مسلمانوں میں یہ دور دیر میں شروع ہوا اور اس

کے ختم ہونے میں بھی زیادہ وقت لگا۔ لیکن آخر

میں تبدیلی چاہنے والی اور ترقی کی طرف بڑھنے

والی طاقتوں کو فتح حاصل ہوئی اور علم دشمن

طاقتوں کو سمجھ بھنپنا پڑا۔ جہاں تک مسلمانوں کا

سوال ہے بلا کسی ہچکچاہٹ کے یہ بات کہی جاسکتی

ہے کہ اس نئی روح کو بھونکنے میں سب سے بڑا

ہاتھ اس یونیورسٹی کے روح رواں کا تھا جو

باطل کی یہ جگہ یہاں علی گڑھ میں لڑی گئی اور

علی گڑھ نئی طاقتوں کی فتح کی جیتی جاگتی نشانی

بن گیا۔

۱۹۹۱ء ڈائجسٹ ماگست ۱۹۹۱ء

”سر سید نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج

ہی نہیں بلکہ ایک علمی و سماجی مرکز قائم کیا تھا جو

نئے زمانے کی نئی روح سے پوری طرح ہم آہنگ

تھا۔ اور اس مرکز کی مرکزی شخصیت خود سر سید

تھے جن کے چاروں طرف اس وقت کے چند بہترین

عالم جمع ہو گئے تھے۔ شاید ہندوستان کا کوئی دوسرا

اخبار یا رسالہ ایک پوری نسل پر اس طرح اثر انداز

نہیں ہوا جیسے کہ سر سید کا ”تہذیب الاخلاق“

سر سید نے اس رسالے کی اشاعت انگلینڈ سے

والیسی کے بعد شروع کی۔ اس میں زیادہ تر وہ

اور ان کے رفقاء ہی لکھتے رہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا

کہ اس رسالے ہی کے ذریعے جدید اردو کی بنیاد

پڑی۔ اس اردو کی بنیاد جو مشکل سے مشکل

جدید خیالات کو بہت آسانی سے ادا کرنے میں

کامیاب رہتی ہے۔ شاید اس وقت کوئی بھی ایسا

پڑھا لکھا مسلمان نہیں ہوگا جو اس رسالے سے

متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید دور کے سب سے عمدہ

اردو مصنفوں اور شاعروں نے یہیں پرورش

پائی۔ یہاں اسلامی فکر نے ایک نیا انداز ایک

نیا موڑ اختیار کیا۔ حالانکہ جدید اردو شاعری

لاہور میں پیدا ہوئی لیکن اسے بڑھنے اور ترقی

کرنے کا ماحول یہیں ملا۔ محمد نواز کیو کمیشن کا لقرنی

کے اجلاسوں میں نئے انداز کی غزلیں پڑھی جاتی

تھیں۔ یہاں اردو تقریر کو ترقی کرنے کا پہلا

پلیٹ فارم ملا۔ اس وقت کے اور آنے والے

وقت کے زیادہ تر اچھے مقرر یہیں کی پیداوار ہیں۔“

(انگلش سے۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۱ء)

کوکانو کمیشن سے خطاب کرتے ہوئے)

ملیگٹو مسلم یونیورسٹی نمبر

# اللہ اکبر اللہ اکبر

پروانہ رودلوئی

ہے جس نے مسلمانوں کو صدقے کی روٹیوں پر زندگی بسر کرنے سے روکا اور قومی زندگی میں برابر کا حصہ دار بنایا۔

آج اسی یونیورسٹی پر چاروں طرف سے ایک یلغار سی ہو رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی شدھی کی جائے کوئی کہتا ہے کہ اسے سیکور بنایا جائے اور کسی کا مطالبہ ہے کہ اسے ایک قومی ادارہ بنادیا جائے، کچھ لوگ یونیورسٹی کو پاکستانی ادارہ بھی کہتے ہیں لیکن میں نے اپنے دور ذرہ قیام کے دوران تعلیم کے اس گہوارہ میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا اس کی بنیاد پر ہی کہوں گا کہ مسلم یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی ہی رہنا چاہیے۔ کیونکہ ہندوستان کی یہی ایک واحد یونیورسٹی ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے سیکولرزم کا عملی تصور پیش کیا۔ جو ہندوستان میں پاکستان کا آئہ نہیں بلکہ قوم پروری اور وطن نوازی کا مرکز ہے، جو اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک قومی ادارہ ہے اور جس کی ہر اینٹ اور جی خاک کا ہر ذرہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ خدا کے لیے تعصب، تنگ نظری اور نفرت کی عینکیں اٹا کر مجھے دیکھو اور مجھ سے انصاف کرو۔

بھیکم پور نے گزر کر جب ہم وکٹوریہ گیٹ کے سامنے جا کر کھاسوٹ میرے ذہن میں علی گڑھ کے قومی شاعر

مجاز کے ترانہ کے یہ مصرعے گونج رہے تھے۔  
جوا بریہاں سے اٹھے گا  
وہ سارے جہاں پر برے گا  
ہر جوتے رواں پر برے گا  
ہر کوہ گراں پر برے گا

ایسا لگتا تھا کہ مجاز وکٹوریہ گیٹ کی آخری چوٹ پر کھڑا ہوا چلا چلا کر یہ ترانہ سنا رہا ہے اور اس احساس نے میرے سازِ دل کے ہر تار کو جھنجھوڑ دیا، میں نے دل ہی دل میں کہا۔  
”واقعی یہاں سے اٹھنے والا ہر ابر سارے جہاں پر برستا رہا ہے اور برے گا۔ واقعی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، ایک بحر ہے کراں ہے جس سے اپنے اور پہلے سب سیراب ہوتے ہیں، ایک منارہ نور ہے جسکی کرنیں زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور واقعی مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے ساتھ کروڑ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن

جوا بریہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برے گا

ہر جوتے رواں پر برے گا ہر کوہ گراں پر برے گا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۷۰ء



نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر انصاف پسند انسان کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے جو قربانی بھی دی جائے کم ہے۔

میں نے اپنے قیام کے دوران مسلم یونیورسٹی کے چپریہ کو دیکھا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سبزہ زار پر رہے ہیں، اس کا اسٹریٹیجی ہال نالہ وشیون میں مصروف ہے اس کی مسجد اپنی حرمت کے تحفظ کی ضمانت طلب کر رہی ہے، اس کا سرسید ہال کسی بوڑھے فقیر کی طرح سر جھکائے ہوئے سکیاں بھر رہا ہے، اس کے باغیچوں کے پھول گل چینوں کے خوف سے کانپ رہے ہیں، اس کی کلیاں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا رہی ہیں اور اس کا باغبان مصلحت پسندی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

گدی دل کی بات کھل کر نہیں کہتا، ایکٹ کے مخالفین بھی چپ ہیں اور اس کے حامیوں کی زبان بھی بند ہے بقول شاعر

آئینہ حیران، دریاں دم بخود احباب چپ  
جسکو دیکھو بزمِ جاناں میں وہی خاموش ہے  
لیکن کہیں کہیں یہ خاموشی ٹوٹی بھی، سرسید احمد کے عاشق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر چانسلر پروفیسر خلیق احمد تقی نے جنہیں سرسید احمد کی ذات اور تحریک سے دلی لگاؤ ہے کھل کر ایکٹ کی حمایت کی۔ دوسری طرف یونیورسٹی یونین کے سکریٹری عارف محمود خاں نے کہا ایکٹ نے نہ صرف مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کیا ہے بلکہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کی خود مختاری کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یونیورسٹی مرکزی وزارت تعلیم کا ایک شعبہ بن کر رہ جائے گی، انہوں نے مطالبہ کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو باقی رکھنے کے لیے اس کا انتظام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں رکھا جائے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



علی گڑھ کالج کے مشہور قومی رہنما علی برادران جنہوں نے  
تحریکِ خلافت چلائی

اگر تاج محل ایک بادشاہ کی اپنی ملک سے غیر فانی محبت کا شاہکار ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک فقیر منش انسان کی اپنی ملت، اپنی قوم اور اپنے ملک سے محبت کی علامت کی یادگار ہے۔ اس یادگار کو باقی رکھنا صرف مسلمانوں ہی کا

۱۹۸۱ء روڈ بجٹ ہما اگست ۷۲ء

## مسلم یونیورسٹی کا پہلا گریجویٹ

ایشوری پر سادہ یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ تھے۔  
اور جے، اسی، چکرورتی، پنڈت دشنو شنکر کا شمار  
یونیورسٹی کے پہلے ممتاز ترین استادوں میں ہوتا تھا۔

نواب صاحب چھتاری کی عمر اب تقریباً ۸۴ سال  
ہے۔ ان کی روایتی مونچھیں سفید ہو چکی ہیں لیکن سر کے  
بال ابھی تک سیاہی مائل ہیں، قوت بصارت پر زیادہ آپٹ  
نہیں آئی ہے لیکن سماعت کی قوت کافی متاثر ہو چکی ہے۔

علی گڑھ کالج اولڈ بوائز کے بانی  
مولانا محمد علی جوہر

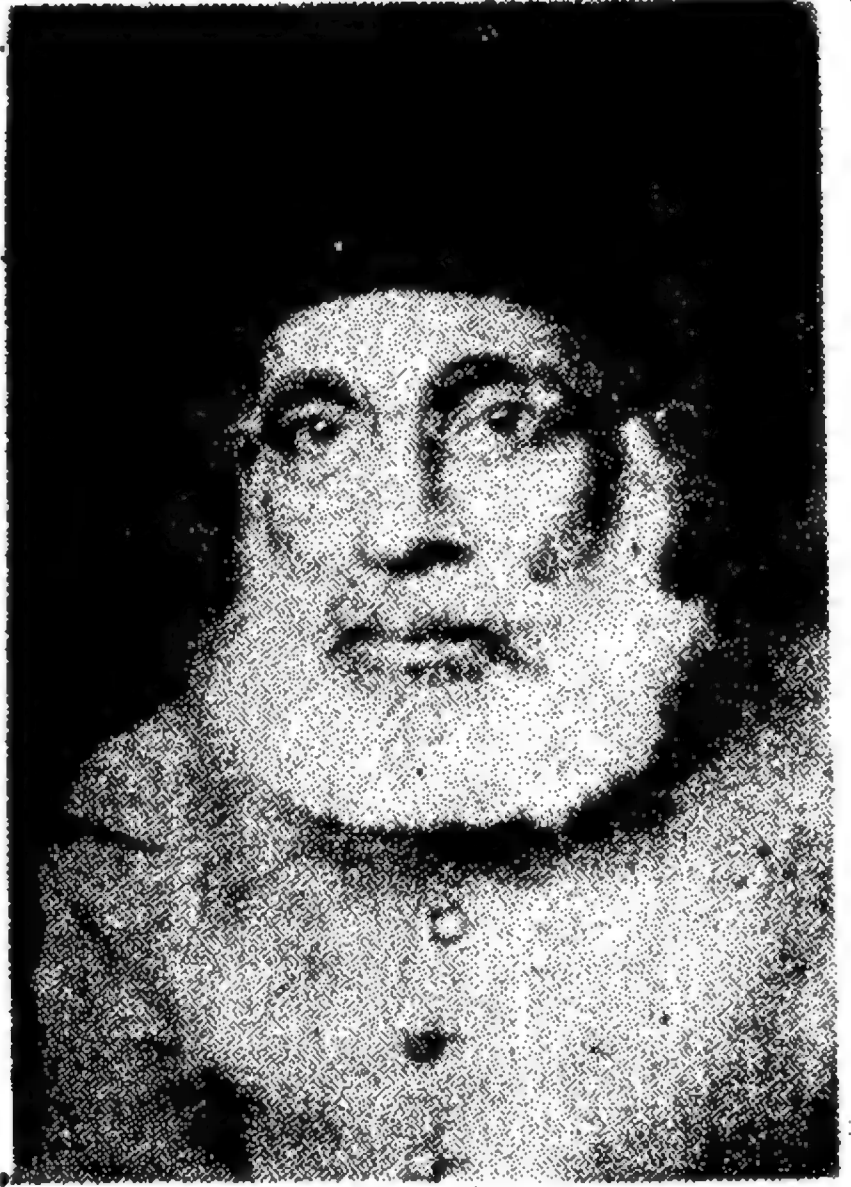


میں نے عمارت محمود سے کہا آپ کے جذبات نیک ہیں آپ کے  
خیالات پرکشش ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ کوئی سرسید نہیں  
جو ایک خاکہ بنائے اور اپنی ادراپیوں اور پراپیوں کی شدید مخالفت  
کے باوجود اس خاکہ میں عمل کارنگ بھرے۔ کاش  
ہندوستان کوئی اور سرسید پیدا کر سکتا، کوئی اور محسن الملک  
آتا اور وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے  
نئی راہیں تلاش کرتا۔ ملاقاتوں کے اس سلسلہ میں ایک  
اور طالب علم لیڈر جاوید حبیب سے بھی ملا ہوا ہر وہ بھی  
ایکٹ سے بے چین اور مضطرب ہیں، وہ بھی اس کے جوں  
کے جوں نفاذ سے ہزاری کا اظہار کرتے ہیں اور جب وہ  
اپنے مخصوص انداز میں ایکٹ پر رک رک کر بحث کرتے  
ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس ایکٹ کے ذریعہ جمہوری قدروں کو  
تباہ کر دیا گیا ہے تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک  
پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن انہیں امید ہے کہ ایکٹ کے مخالفوں  
کا حلقہ وسیع ہونے کے ساتھ ہی حکومت اس میں مزید  
ترمیم کر کے اسے قابل قبول بنانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔  
لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہوا میں حافظ سید احمد خان  
آٹ چھتاری کی کونٹھی پر پہنچا۔ موصوفتھوڑی دیر بعد ہی  
دہلی جا رہے تھے، ان کے صاحبزادہ ابن میاں نے ہم لوگوں  
سے دل کھول کر باتیں کیں لیکن ان کا بھی یہ اصرار تھا کہ  
سب باتیں صیغہ راز میں رہیں۔ آٹ دی ریکارڈر باتوں کو  
یہاں قلم بند کروں تو عہد شکنی ہوگی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دوں گا  
کہ وہ بھی ایکٹ سے مطمئن نہیں نظر آ رہے تھے خاص طور  
پر کورٹ میں معطلان کی نمائندگی ختم کیے جانے کی وجہ سے  
وہ خوش نہیں تھے۔ ان سے تقریباً نصف گھنٹہ کی ملاقات  
بڑی دلچسپ رہی موصوفتھوڑی نے ہماری درخواست پر  
"صورت زارت کے لیے" نواب صاحب چھتاری کو باہر آنے کی  
زحمت دی۔

ایڈیٹر انچسٹ، ہماگت، ۱۹۹۰

تعمیر میں حصہ لیا ہے جسے گزشتہ پچاس برسوں میں ہر روز پر  
اپنی رائے کا اظہار بے باکانہ کیا ہے اس کی خاموشی کھلتی  
ہے اور کہنے لگی کیونکہ انکے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ  
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام  
ایک مرگ ناگہانی اور ہے  
اور چند روزہ زندگی کے سکون کے لیے خوشی کو  
رہنا بنانا ان کے لیے مفید ہو گا نہ ملت کے لیے۔ ان  
سے مل کر میں سوچنے لگا کہ مستقبل کا مورخ علی گڑھ مسلم  
یونیورسٹی پر ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کی شکل میں گرنے والی بجلی  
کی تباہ کاریاں قلم بند کرے گا تو وہ یہ بھی لکھے گا کہ نواب  
صاحب چغتاری زندہ تھے لیکن انہوں نے اس ایکٹ

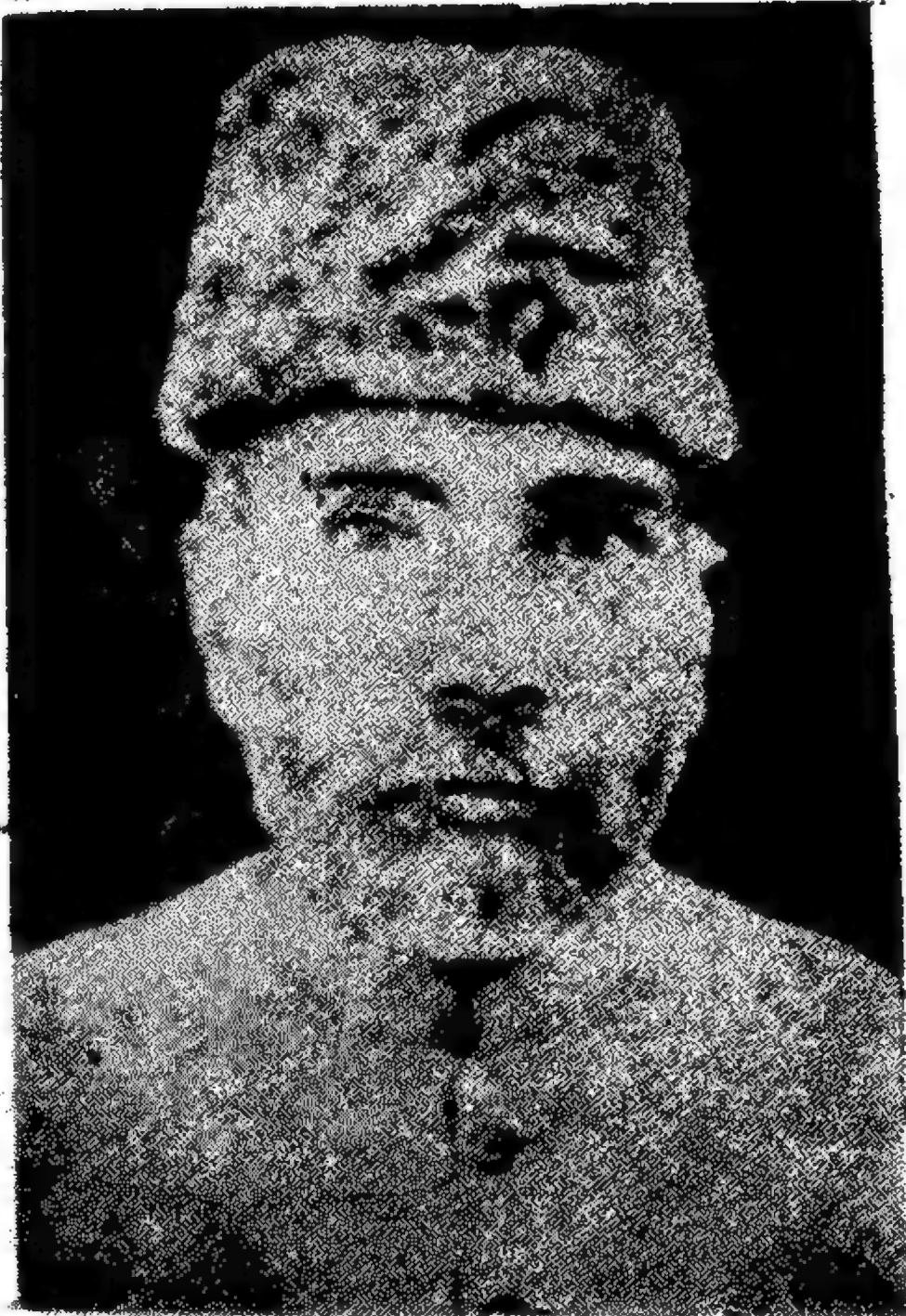
مولانا ظفر علی خاں علیگ مرحوم



مولانا سید فضل الرحمن حسرت موہانی  
علیگ

دہلی یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر ہیں لیکن چانسلر کا عہد صرف  
نمائش ہے اس لیے یونیورسٹی کے نظم و نسق میں اس کا  
کوئی دخل نہیں رہ گیا ہے، ہاں کسی زمانہ میں یونیورسٹی  
کے ہر شعبہ میں ان کی بات سنی جاتی تھی اور اس پر عمل بھی  
ہوتا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے خاموشی کی راہ  
اختیار کر لی ہے اور اس اصول پر عمل کرنے لگے ہیں کہ ایک  
خاموشی ہزار بلائیں مالتی ہے لیکن ان کی یہ خاموشی میرے  
لیے بھان روچ بن گئی۔ اگر کوئی سرکاری افسر  
موقع پرست انسان، ترقی اور خطا بات کا خواہاں اپنی  
ملت پر آنے والی تباہی کو دیکھ کر خاموش رہے تو اس کی  
خاموشی قابل فہم ہوگی لیکن نواب صاحب چغتاری کی طرح  
کا انسان جس نے اپنے خون اور پسینہ سے مسلم یونیورسٹی کی

۲۰۰ اے ڈی ایچٹ ہماگست ۷۷







سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان علیگ

کی اچھائی یا برائی میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اور  
آئندہ کی نسلیں ان کے اس سکوت کو طرح طرح کے معنی  
پہناتیں گی۔۔۔ نواب صاحب سے مل کر تھکی اور بڑھ  
گئی۔۔۔ جس پیاس کو بجھانے کے لیے میں ملی گدھایا  
ستھا اس کی شدت نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں سوچنے لگا  
کہ اب میری پیاس کون بجھائے گا، پانی موجود ہے لیکن کوئی  
نہیں پلاتا۔۔۔ افسوس ملت اور سربراہانِ ملت پر  
یہ وقت آگیا ہے کہ ان کے لبوں پر مصلحتوں کی مہریں ثبت  
ہو گئی ہیں ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں، ان کے دل رد  
ہے ہیں، اور ان کے سینوں میں اضطراب کا بحر بے کراں  
لہریں مار رہا ہے لیکن وہ خاموش ہیں۔۔۔ اور اپنے

ڈاکٹر سر محمد اقبال علیگ مرحوم

اضطراب کو ظاہر نہیں کرتے، کیا وہ ہمیشہ خاموش رہیں گے؟  
یہ سوال نے کہیں نواب صاحب سے رخصت ہوا۔ اور خود  
کو مولانا آزاد لائبریری کی دستوں میں گم کر دیا۔

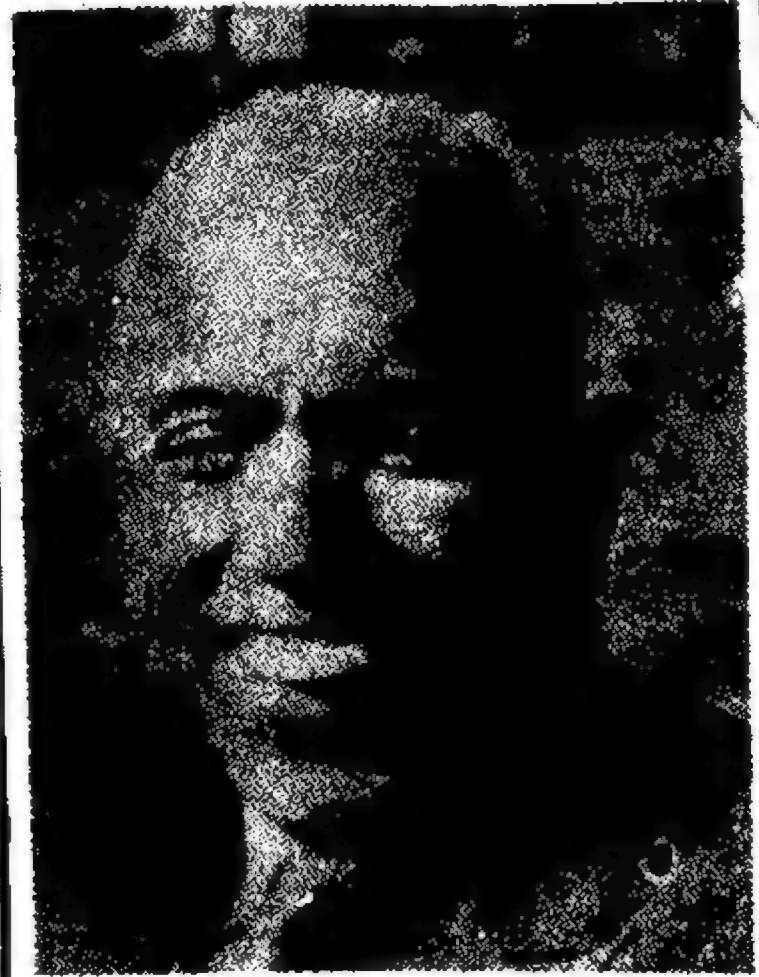
لائبریری میں ہمیں نے اپنا زیادہ وقت سرسید روم  
اور وقار الملک لائبریری میں گزارا۔ سرسید روم کے نگراں  
فرخ جلالی سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کی عدم موجودگی  
میں چارٹوں، نقشوں، تصاویر اور سرسید مرحوم کی مینر،  
کرسی اور صوفہ سیٹ نے مسلم یونیورسٹی کی پوری تاریخ  
بیان کر دی۔ وقار الملک کی لائبریری کی سیاہ پردوں میں  
لبیٹی ہوئی الماریاں ماحول کو سوگوار بناتے ہوئے تھیں۔  
جب لائبریری کے نگراں نے ان پردوں کو ہٹایا تو شیشے کی  
تاہوت نما الماریوں میں علم و فن کی آن گنت نقشیں بکھری



کالج کی طرف روانہ ہو گیا اور میڈیکل کالج کے مختلف شعبوں کو دیکھتا ہوا اسٹریچی ہال واپس آ گیا۔ اسٹریچی ہال سے ملحقہ مسجد نے مجھے صدادی "اللہ اکبر اللہ اکبر" نماز جمعہ کا وقت تھا، ہزاروں طلباء مسجد پہنچ چکے تھے، نماز سے پہلے میں نے سر سید احمد کی قبر پر حاضری دی، جن کے پہلو میں ان کے بانیں جانب ان کے بڑے صاحبزادے سید محمود اور دائیں جانب ان کے رفیق محسن الملک کی قبریں ہیں، راس مسعود اور ڈاکٹر ضیا المہین بھی سر سید کے پہلو ہی میں ابدی تیند سو رہے ہیں، محمود منزل کے ان بانیوں پر ہر وقت رحمت باری کی بارش ہوتی رہتی ہے میں چاہتا تھا کہ جو بیاس اب تک کسی سے نہ بچھ سکی تھی وہ یہاں بچھاؤں، جن سوالوں کا جواب اب تک کسی نے نہ دیا تھا وہ ان سے پوچھوں۔۔۔ اور ان سے کہوں کہ جس قوم کو آپ نے اپنی کوششوں سے سر بلندی عطا فرمائی تھی وہ پھر ڈوب رہی ہے، اور تنگوں کا سہارا بھی نہیں مل پا رہا ہے۔ گھر کے چراغ گھر کے تیل ہی سے گروں کو آگ لگا رہے ہیں اب ملت کیا کرے؟ پوری قوم خاموشی سے ڈوب رہی ہے کیونکہ بولے تو زبان کٹتی ہے۔ میں آپ کے علی گڑھ میں کردار کے غازیوں کی جستجو میں آیا تھا لیکن یہاں تو گفتار کے بھی غازی نہیں ملے۔۔۔

میں بڑی دیر تک سر سید احمد خاں کی قبر کے سامنے کھڑا رہا۔۔۔ ۱۸۵۷ء کی خوزیری کے مناظر میسری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق وقت کی تیز ہواؤں سے اڑنے لگے۔ بہادر شاہ کی جلاوطنی درختوں سے لگتی ہوئی شاہزادوں کی نعشیں، شاہزادیوں کے پاؤں کے چھالے اور ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور محتاجی کے مرقع آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔۔۔ پھر مسلمانوں کی عظمت کے لیے سے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



ہندوستان کی شہرہ معروف شخصیت  
شیخ محمد عبداللہ علیگ

ہوتی نظر آئیں۔۔۔ یہ کرتے پر لکھا ہوا قرآن شریف ہے، یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن کا نسخہ ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کی تحریر میں قرآن کا نسخہ ہے، یہ ناریل کے پتوں پر لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب ہے، قدیم مخطوطات کے اس قبرستان میں گیتا، رامائن، قرآن مجید صدیوں پرانے طفرے، مثنویاں اور فرمان دفن ہیں۔ یہ انمول ادبی خزانہ آزاد ہندوستان میں شاید اب کسی کی توجہ اپنی طرف نہ پہنچ سکے گا۔ کیونکہ اب علم دفن کے سانچے بدل چکے ہیں اور علم و ادب کے اس گہوارہ کی بنیادوں کو کچھ اس طرح بدلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں کہ آنے والے زمانہ میں چند "سربھروں" کے علاوہ ان کا کوئی اور قدر دان نہ رہ جائے گا۔

علم دفن کے اس قبرستان سے نکل کر میں میڈیکل





ڈاکٹر سید محمود مرحوم، جنہیں علی گڑھ میں تعلیم کے دوران  
لڑکے "عمود قوم" کے نام سے پکارتے تھے

رہنما ہوا کہ ہمارے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ مگر اپنی قوم  
کو دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ایسے پست و تاریک  
گروہ میں گرا ہوا پایا جس سے نکلتا حال معلوم ہو رہا تھا۔  
مگر ہمت نہیں ہاری!

"مدرسہ قائم کرنے کا خیال آپ کے دل میں کب پیدا  
ہوا؟" میں نے دوسرا سوال کیا اور جواب ملا۔ "لندن  
ہی میں میں نے مدرسہ کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام  
تجویزوں کو پورا کیا جہاں تک کہ جس نقشہ پر آپ اس کالج  
کو جو آب یونیورسٹی ہے، کی عمارتوں کو بننا ہوا دیکھتے ہیں  
یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا۔ لندن ہی میں اس کام  
کو جو نہایت اہم تھا شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیے  
ہندوستان میں پہنچکر اول کے مطابق میں نے تہذیب  
الاخلاق جاری کیا۔ دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم

ایک دیوانہ اٹھا۔ یہ تھا سید احمد خاں اور اب میں عالم تصور  
میں سید احمد خاں سے مخاطب تھا۔ سید صاحب  
قدر کے بعد آپ کے احساسات کیا تھے؟ اور مجھے جواب  
ملا۔ قدر کے بعد محکوم اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا مال و بسا  
کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا تھا۔  
چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا آپ یقین کیجئے  
کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔  
اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مردتی  
کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر  
میں خود کسی گوشہء مافیت میں جا بیٹھوں۔ میں نے قومی  
بہتری کے دواصول مستحکم طور پر قائم کر لیے ایک تعلیم دوسرا  
انگریزوں سے اصلی اتحاد اور دوستی ۱۸۵۸ء میں ایک  
اسکول مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس زمانے میں کسی قسم  
کے اسکول کا وجود نہ تھا، پھر میں غازی پور گیا جہاں میں  
نے ایک اسکول قائم کرنے کی بنیاد ڈالی جس میں اردو انگریزی  
عربی، فارسی پڑھائی جادے۔ ۱۸۶۳ء میں سائنسنگ  
سوسائٹی قائم کی۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے اضلاع  
شمال و مغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن  
میں جا کر تعلیم پانے کو منتخب کیا۔ مجھے موقع ملا کہ میں بھی لندن  
جاؤں اور تعلیم و تربیت کے ان طریقوں سے واقف ہوں  
جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسے اعلیٰ درجہ کی ترقی  
پائی۔ میں وہاں گیا، وہاں رہا اور جو دیکھا سو دیکھا۔  
اور جو سوچا وہ سوچا۔ میں نے صرف اس خیال سے  
کہ کیا رائے ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز  
کا سفر اختیار کیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب کبھی علمی  
مجلسیں دیکھیں۔ جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے۔ جب کبھی  
عمدہ پھول دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص  
کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنی ملک اور اپنی قوم یاد آتی اور نہایت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر





### مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اکیڈمک جلوس کا ایک منظر

روز سالگرہ ملائے معظمہ قرار دی چنانچہ میں خود اور بعض مہمان اس تاریخ پر علی گڑھ میں آئے اور مدرسہ کھولا اسی وقت میں نے پیشینہ لینے کا قصد کیا اور اوسط ۱۸۷۶ میں علی گڑھ میں آگیا اس وقت طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی۔ اسکول جو ۱۸۷۵ء میں انٹرسنگ پڑھائی کے لیے کھولا گیا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں ایف اے کی پڑھائی تک اور ۱۸۸۱ء میں بی۔ اے اور ایم اے کی پڑھائی تک ترقی کر گیا۔ اسکول کی بنیاد کا مختصر ہال سننے کے بعد میں نے سرسید کی روح سے پوچھا آپ کی زندگی میں مسلم یونیورسٹی کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن بعد میں آپ کے اس خواب کو آپ کے رفقاء نے پورا کر دکھایا لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کے ذہن میں مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حیثیت کیا تھی۔

ہوئی اور کمیٹی خواست گار ترقی تعلیم مسلمانان اس کا نام رکھا۔ ۱۸۷۲ء میں چندہ تین لاکھ کے لیے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا نام محمدن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا۔ دسویں جنوری ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں کمیٹی نے متعدد تجویزیں منظور کیں (۱) علی گڑھ میں جو زمین پرانی چھاؤنی فوج کی بے کار پڑی ہے تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ ملے لی جاوے (۲) سکریٹری کو اجازت دی گئی کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں تعمیر مدرسہ کا خرچ نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی یا چندہ خالص تعمیر کا صرف کیا جاوے۔ ۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سکریٹری نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اس زمین کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ۲ مئی ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں اس کمیٹی نے جو بنارس میں تھی تاریخ افتتاح مدرسہ ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء

## میرالدین حبیبی

سابق سفیر ہندوستان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

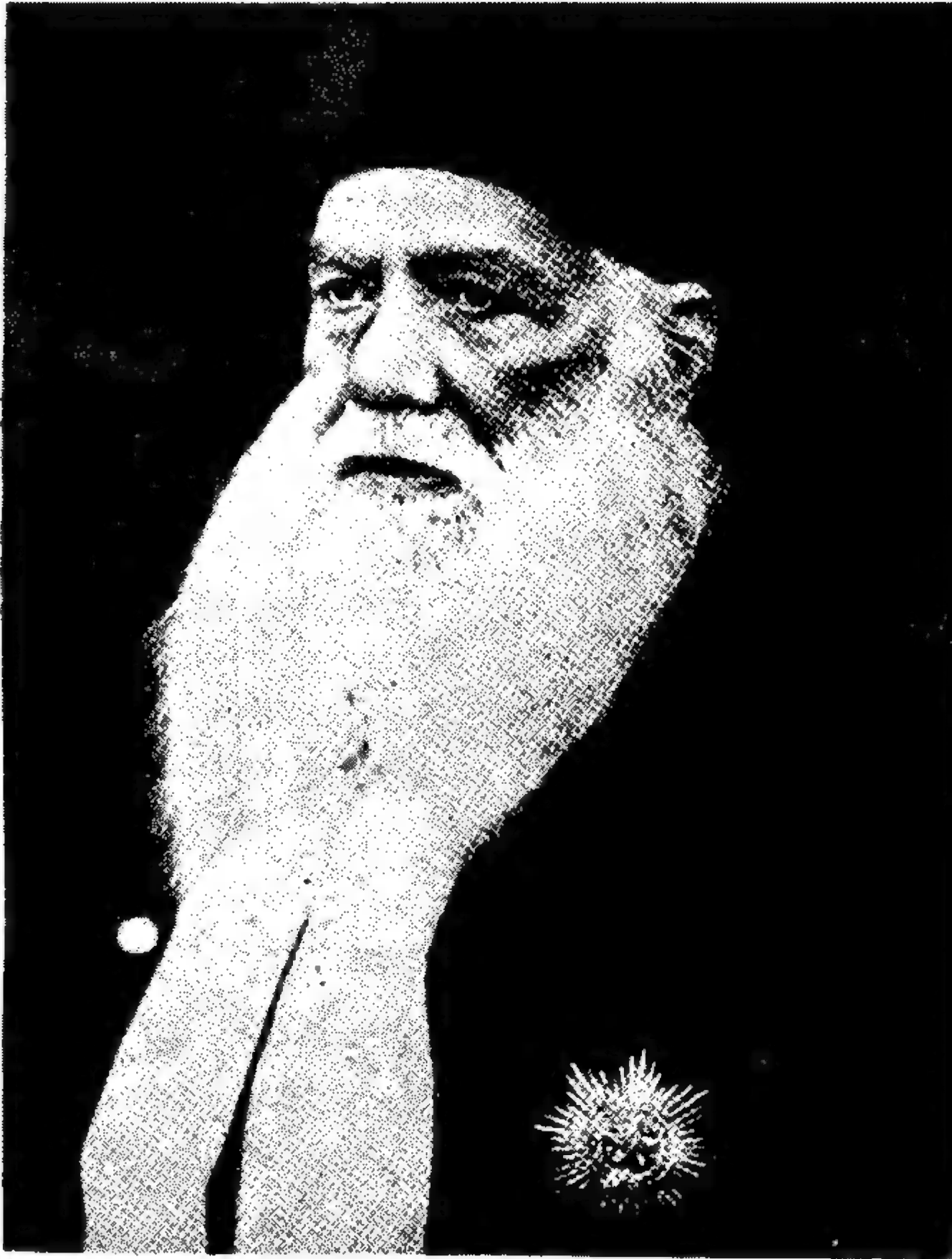
بنارس ہندو یونیورسٹی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی  
جیسے قومی اداروں کا وجود (جنہیں حکومت ادا دینے  
کا فیصلہ کرے) ہمارے سیکولر ازم کو معنی اور مقصد  
عطا کرنے کی اولین شرط ہے۔

ہوتی۔۔۔ ہماری یونیورسٹی مثل مسلمانوں کی پڑائی  
یونیورسٹیوں کے شاہنشاہ وقت کی طرف سے نہ ہوگی بلکہ  
وہ ایک قومی درس گاہ ہوگی، قوم کی ضروریات کے مطابق  
قوم کی طرف سے ہوگی! اسکے ساتھ ہی ایک اور آواز گونجی،  
"اللہ اکبر الشاکر۔۔۔" اس آواز نے سارے ممبروں میں  
کی ایک روسی دوڑادی ہاوریں آنکھوں نے آنسوؤں کو مان  
کرتا ہوا نماز جمعہ کے لیے مسجد کے صحن میں آگیا۔ ★

موتوں کے بعد تصورات کی دنیا میں ایک آواز  
گونجی۔۔۔ "مدرسۃ العلوم کے طلباء کے دائیں ہاتھ  
میں فلسفہ ہوگا اور بائیں ہاتھ میں نیچرل سائنس اور  
کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پہ" اس جواب  
نے سارے بدن کو جھنجھوڑ دیا اور میں نے آخری سوال  
کے رخصت ہونے کا ارادہ کیا میں نے پوچھا مسلم یونیورسٹی  
کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال تھا؟ اور مجھے جواب  
ملے۔۔۔ "میں اپنے دوستوں کو کئی مرتبہ بطور وصیت  
کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرسۃ العلوم کا جو حال ہو سو ہو  
مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکلے اور لوگوں کے قبضے میں  
چلا جائے، بری طرح یا کھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی  
چلانے والی ہو۔ میں عقیدت سے سر جھکا کر واپس ہونے  
کیلئے مڑا مگر میرے ذہن میں ایک اور آواز گونجی یہ آواز سنی  
سید محمود مرحوم کی۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا اور بغور اسی آواز  
کو سننے لگا۔۔۔ "بجرا سمن کے کہ گورنمنٹ نگران حال  
رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اس دارالعلوم  
میں نہ ہونی چاہیے" اسی کے ساتھ ایک اور آواز بلند

ہندت جواہر لال نہرو  
مسلم یونیورسٹی میں  
وائس چانسلر  
ہائوس کی ایک  
یادگار تصویر جہیں  
آپ سابق وائس  
چانسلر میرالدین  
حبیبی لارکے  
خلایان کے افراد  
کو بھی دیکھ سکتے  
ہیں





# یہی سرسید

(صابر علی)

کے دادا، سید ہادی شاہ عالم کے دربار کے امراء میں شامل تھے۔ سید احمد خاں کے والد سید حقی کا بھی دربار شاہی میں بڑا درسخ تھا۔ اکبر شاہ ثانی ان کو ”بھائی متقی“ کہہ کر کھارتے تھے۔ بادشاہ کو ان پر

سید احمد خاں ۵ رذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ہمارے اکتوبر ۱۸۱۵ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد عرب سے پہلے ہرات میں اور پھر وہاں سے اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان آکر آباد ہو گئے۔ سید احمد خاں



اعتماد تھا کہ انھوں نے ان کو وزارت کی پیشکش کی  
مگر سید حقی نے معذرت کرتے ہوئے اپنے بچائے  
سید احمد کے نانا خواجہ فرید الدین کا نام پیش کر دیا۔  
سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء بیگم خولہ  
فریدی کی سب سے بڑی بیٹی تھیں، وہ صرف قرآن مجید  
اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں  
لیکن بچوں کی تربیت میں انھیں بڑی مہارت  
حاصل تھی۔ ان کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی  
کردار نے سید احمد خاں کی زندگی اور انداز فکر پر  
بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ایک مرتبہ سید احمد خاں نے کسی

آخری منل تاجدار بہادر شاہ ظفر مرحوم جن کے دربار سے سرسید علیہ الرحمۃ کو جو ادالہ دار و جنگ  
کا خطاب ملا تھا



## یونیورسٹی کا پہلا سپانسر

پہلا سپانسر مہاراجا پٹیل کو پیش کیا گیا۔

مہاراجا بنارس، مہاراجا پٹیل اور راجا جے کش

داس نے یونیورسٹی کو بڑے بڑے عطیے دیئے تھے۔

ملازم کے تھپڑ مار دیا، اس پر ان کی والدہ نے فوراً ان کو گھر سے باہر کر دیا اور تین دن کے بعد اس شرط پر واپسی کی اجازت دی کہ ملازم سے معافی مانگیں۔

سید احمد علی والد کے انتقال کے بعد سید احمد خاں کو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی سلطنت کی زبوں حالی ان کے پیش نظر تھی اس لئے انھوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کر لی جائے۔ سب سے پہلے سید احمد خاں نے عدالت میں کام کیا ان کے خالو مولوی غلیل اللہ خاں اس زمانے میں دلی میں صدر امین تھے۔

سید احمد خاں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کو اپنی کچہری میں پریکٹس کی اجازت دے دیں۔۔۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اور پھر کام سیکھنے کے بعد ان کو کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ ابھی سید احمد خاں نے بہت تھوڑے ہی دنوں کام کیا تھا کہ مسٹر سر رابرٹ دلی میں جج ہو کر آئے۔ سید احمد خاں کو وہ پہلے سے پہچانتے تھے۔ اس لئے یہ جب ان سے ملنے کو گئے اور ان سے نوکری کی درخواست کی تو انھوں نے ان کو عدالت میں سیشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن جب

سید احمد خاں نے اس کام کو مشکل جان کر انکار کر دیا تو کمشنری کے دفتر میں ان کو نائب منشی کا عہدہ تفویض کر دیا گیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۸۵۷ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور وہ ۴۴ اردسمبر کو مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے۔ مگر ارجنوری ۱۸۵۷ء کو وہاں سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری آ گئے۔ سید احمد خاں یہاں چار سال تک منصف رہے۔

۱۸۵۷ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری آئے تو چند روز کے لئے دلی بھی آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے دادا کا خطاب ان کو ملنا چاہئے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا، لیکن سید احمد خاں کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب احسن اللہ خاں نے لکھ کر پیش بھی کیا تھا، لیکن بادشاہ نے اس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ اس طرح آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار سے.... جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب انھیں ملا۔

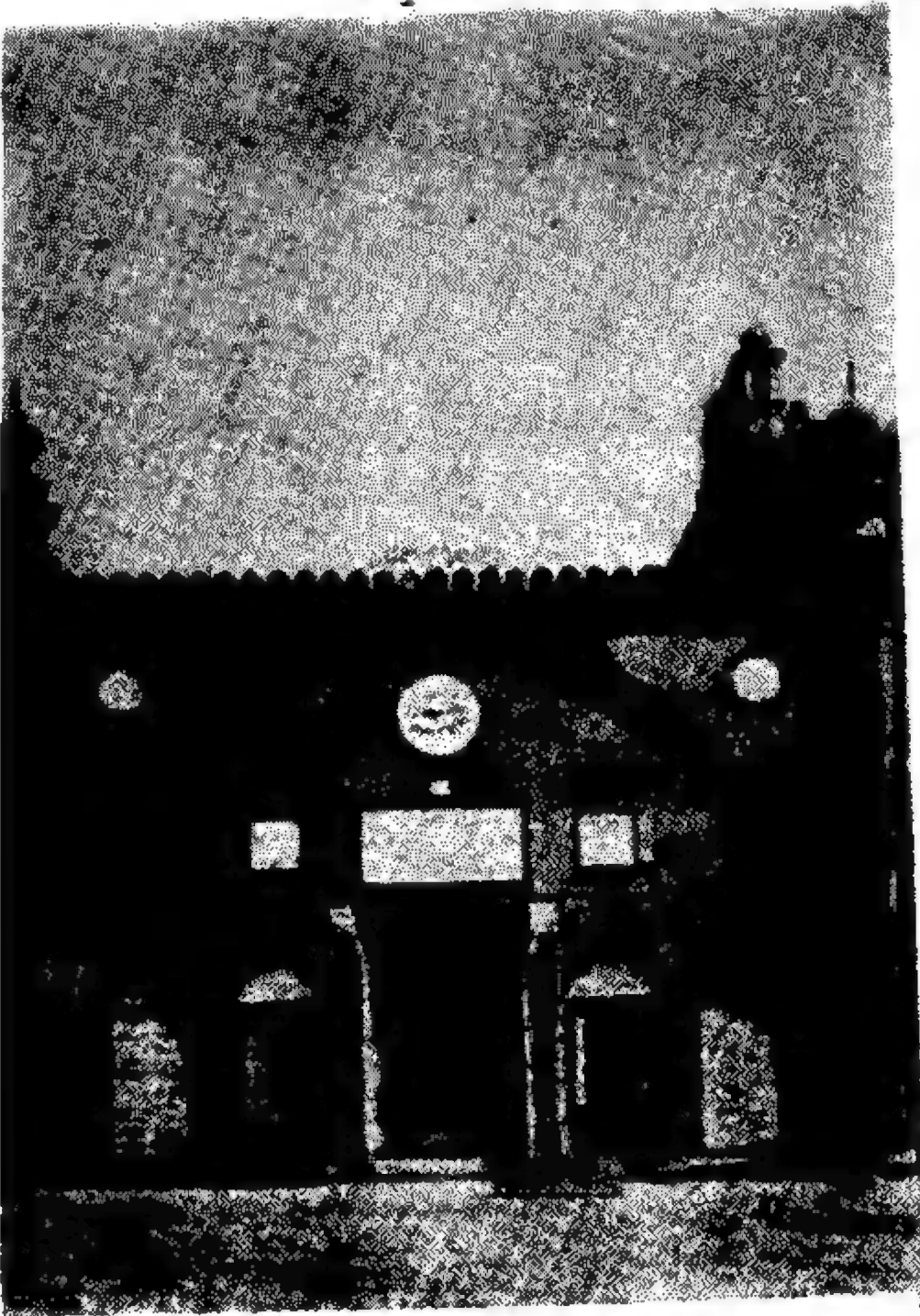
سید احمد خاں کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا۔ ”آثار الصادقہ“ ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی دلی کی منصفی کے زمانے میں لکھی تھی، جس میں دلی کی تاریخی عمارتوں کا حال تحریر کیا ہے۔ یہ کام انھوں نے جس محنت اور جانفشانی سے کیا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ قطب مینار کے اکثر کتبوں کو پڑھنے کے لئے انھوں نے

پارٹ تک بندھوائے۔ اس کتاب کا ترجمہ  
رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے انگریزی میں کیا  
اور سید احمد خاں کو سوسائٹی کا انگریزی فیلو  
بھی مقرر کیا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کتاب کا فرانسیسی  
ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن  
بڑے اہتمام سے دلی اور کراچی سے شائع ....  
ہو چکے ہیں۔

جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہوئی تو سید  
احمد خاں اس وقت بمبؤر میں تھے۔ وہاں  
انھوں نے قریبا بیس انگریزوں کی جان بچائی۔  
بغاوت کے دوران میں ان کو ضلع بمبؤر کا انتظام  
بھی سپرد کیا گیا تھا۔ انھوں نے امن و امان  
قائم کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن کامیاب نہ  
ہو سکے۔ بالآخر خود بھی بھاگ کر میرٹھ پہنچے وہاں ان  
مصیبتوں کا حال سن کر جو ان کے خاندان پر پڑی تھی  
دل گئے۔ ان کے سارے قریبی رشتہ دار مارے جا چکے  
تھے۔ خود ان کی والدہ اصطبل میں روپوش تھیں۔  
ان کو کئی دن تک پینے کو پانی نہ ملا۔ سید احمد خاں ان  
کو میرٹھ لائے۔ مگر وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکیں  
اور چند ہفتوں میں رحلت فرما گئیں۔ اس وقت  
سید احمد خاں کی عمر ۴۴ سال تھی۔

بغاوت کے بعد سید احمد خاں کو خیر خواہی کے  
صلے میں حکومت نے ایک بہت بڑا تعلقہ دینا چاہا  
جس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے اوپر تھی مگر انھوں  
نے قبول نہیں کیا۔ انگریزوں کی طرف سے عوام  
ہندوستانیوں خصوصیت سے مسلمانوں پر جو ستم  
ڈھائے گئے تھے ان کا سید احمد خاں پر بڑا گہرا اثر  
پڑا وہ خود کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے میں قبل از وقت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



مزار مبارک سر سید علیہ الرحمۃ

بوڑھا ہو گیا

۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ  
مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت  
کے جذبات میں اور تیزی آگئی۔ انھوں نے انگریزی  
تعلیم کی شدت سے مخالفت شروع کر دی۔ سید احمد خاں  
جو کہ حالات کا بخور مطالعہ کر رہے تھے وہ اس نتیجے پر  
پہنچے کہ سب سے پہلے انگریزوں کو مسلمانوں سے  
جو بدگمانی ہے اس کو دور کرنا چاہئے اور ساتھ  
ہی ساتھ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف ترغیب  
بھی دی جائے تاکہ ان پر علم کے دروازے کھولیں  
جن توہمات میں وہ اسیر ہیں اس سے سہائی پائیں



## بال کرشن گوکھلے

گوکھلے جب ۱۹۱۹ء میں ایم اے ادا کالج آئے تو طلباء نے ان کا اتنا پر جوش استقبال کیا کہ ان کی گاڑی اسٹیشن سے خود کھینچ کر لائے۔ گوکھلے نے یہ منظر ادیبوں کے لڑکوں کا قومی جذبہ دیکھتے ہوئے کہا۔  
 اب میں ایک سرحد آدمی کی طرح مردوں گا۔  
 کیونکہ مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے ملک کی آزادی یقینی ہے۔  
 (۵ فروری ۱۹۱۹ء)

اور نکتہ و افلاس دور ہو کر ان کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔

چنانچہ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کی تحریر کا یہی مقصد تھا۔ اس میں یہ ظاہر کیا کہ بغاوت کی ذمہ داری ہندوستانیوں پر نہیں بلکہ خود انگریزوں پر ہے۔ انگریز ہندوستانیوں سے خود کو اتنا دور رکھتے تھے کہ ہندوستانیوں کے مسائل سمجھنے کا ان کو موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اور جب بھی رعایا اور حکومت کے درمیان خلیج پیدا ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ بغاوت ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جب اس رسالے کا ترجمہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو ایک محشر مچا ہو گیا۔ سکریٹری امور خارجہ سیلی بیٹن نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو غلط کار کئے والے باغی کو گرفتار کیا جائے۔ لیکن پارلیمنٹ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ ایسے حالات میں جب کہ ذرا سے شبہ میں پھانسی کی سزا دینی ایک عام بات تھی۔ یہ سید احمد خاں جیسے ہی جری اور حق گو کا کام تھا کہ بغاوت کے متعلق حکومت کو

مورد الزام بنائے۔

سید احمد خاں کی بیوی کا انتقال ۱۸۷۱ء میں مراد آباد میں ہوا۔ جنھوں نے دو بیٹے سید حامد سید محمود اور ایک صغیر سن بیٹی امتا العزیز چھوڑی تھی۔ اس وقت سید احمد خاں کی عمر ۳۳ سال اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ ان کے اجاب نے اصرار کیا کہ دوسری شادی کر لیجئے لیکن انھوں نے شادی نہیں کی اور اپنی بقیہ زندگی کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔

سید احمد خاں نے اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ لیکن بغاوت کے بعد تو ان کی یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نفرت کو دور کرنے میں بڑی مشکلات حائل تھیں مگر سید احمد خاں نے تمام مشکلات اور دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان کے پائے نبات کو کوئی لغزش نہیں آئی

۱۸۷۴ء تک سید احمد خاں غازی پور میں تعینات تھے وہاں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا کام انگریزی علوم کی کتابوں کا اردو میں منتقل کرنا تھا۔ وہیں انھوں نے ایک مدرسہ بھی کھولا جو بعد کو کٹورہ پانی ماسکول کہلایا۔ سن مذکور میں ہی سید احمد خاں غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ اور پھر وہاں آکر انھوں نے ہندوستان کے واسطے، مسلمانوں کے واسطے اور علی گڑھ کے واسطے جو کچھ کیا اسے میں یہاں نہیں بیان کروں گا۔ کیوں کہ اس سے آپ اور ہم سب واقف ہیں۔

# بیگ کیپی کی سفارشات کا خلاصہ (ماخوذ)



مرکزی وزیر خیر الرحمن علی احمد

**وزیر عظمیٰ شریعتی اندرا گاندھی نے مرکزی وزیر جناب**  
فخر الدین صاحب کو اس سلسلے میں مجاز کردیا اور انہوں نے  
پدمستے پر حمد کرنے کے لئے علی ظہیر، ہمایوں کیر، سیدین  
بید الرحمن خاں شردانی، جسٹس فہیل احمد، جسٹس بشیر احمد،  
پروفیسر ایم۔ ایم بیگ اور ظفر احمد صدیقی صاحبان پر شتل ہلیک  
کیپی بنادی۔ کیپی نے ستمبر ۶۸ء میں اپنی سفارشات مسلم وزیر  
کو پیش کر دیں۔

اس فخر الدین کیپی جسے بیگ کیپی بھی کہتے ہیں کی  
سفارشات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) مسئلہ کے ایکٹ میں کم سے کم مداخلت کی جائے  
صرف ایسی ترمیمات کی جائیں جن کا کیا جانا اشتہوری ہے  
یکساں قانون بنانے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یونیورسٹی  
کی اصل حقیقت اس کا مخصوص کردار ہے۔

(۲) ایکٹ کی دفعہ ۱ میں حسب ذیل ضمنی دفعہ  
بڑھائی جائے۔

باجو کسی عدالت فیصلہ، ڈگری یا آرڈر کے علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی مسلمان اقلیت کی قائم کردہ سمجھی جائے گی،  
اور اس کا نظم و نسق دستور کی آرٹیکل ۲۹، ۳۰ کے مطابق ہوگا۔  
(مندرجہ بالا سفارشات، رپورٹ کی مدد کی حیثیت  
رکھتی ہے۔ پیریم کورٹ کے فیصلہ اور ستمبر ۱۹۶۸ء کے بعد سے مرکزی

ملی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

معداً بجٹ ہماگست ۱۹۷۲ء ۲۱۱

## علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

### اقامتی ہالوں کے پروڈسٹ

برائے سالہ ۱۹۷۲ء

ڈاکٹر منیر احمد، سرسید ہال، مسٹر حمید اہاشمی  
آفتاب ہال، پروفیسر مسعود حسن سلیمان ہال، ڈاکٹر  
ایس آفتاب زیدی، وقار الملک ہال، ڈاکٹر  
کمال الدین محسن الملک ہال، ڈاکٹر مسز رضیہ خان  
عبداللہ ہال، مسز سکینہ حسن، مسز جینی ٹائیڈو ہال،  
ڈاکٹر لس کے جوہری، ہادی حسن ہال، ڈاکٹر حبیب  
رسول، اس مسود ہال، پروفیسر عبدالماجد صدیقی،  
محمد حبیب ہال، ڈاکٹر ہرش رائے دادہ این آر  
ایس سی۔

اضافہ کر دیا گیا تھا کیونکہ ان کو کم کرنے کی سفارش کی تھی  
وائس چانسلر کی تقرری کے سلسلے میں بھی کمیٹی نے مثبت  
سفارشات کی تھیں۔

(۵) دفعہ ۸ کی رو سے یونیورسٹی کے عہدیداران، وائس  
چانسلر، چانسلر وغیرہ کسی بھی فرقہ کے ہونے سے بچنے کی کمیٹی نے یہ سفارش  
کی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے پیش نظر یہ معصوم نہیں  
ہے۔ یونیورسٹی کے عہدے داران مسلمان ہی ہونے چاہئیں۔  
(۶) مسلم یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے بارے میں  
کمیٹی نے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اس پر اصرار نہیں  
کیا تھا کہ کوئی غیر مسلم کورٹ کا ممبر نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اساتذہ  
کی نمائندگی کو بھی مان لیا تھا مگر کمیٹی نے یونیورسٹی کورٹ کی  
تشکیل کے سلسلے میں جو تجویز پیش کی تھی اس میں اس بات کو  
محوظ رکھا تھا کہ ہر حال میں یونیورسٹی کورٹ میں غلبہ مسلمانوں کے  
نمائندوں کا رہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے سلسلے میں کمیٹی  
نے علاوہ دیگر چیزوں کے حسب ذیل سفارشات کی تھیں:

- (الف) رجسٹرڈ گریجویٹس کے ۱۵ نمائندے۔
- (ب) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے۔
- (ج) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تین نمائندے  
یونیورسٹی کورٹ میں لئے جائیں۔
- (د) اس کے علاوہ کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ریاست  
مجلس قانون ساز کے ۱۶ نمائندے لئے جائیں جن کو مسلمان  
ممبران اپنے میں سے منتخب کریں۔ اس کے لئے پورے ملک کو  
چار منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر منطقہ کے چار ممبروں  
پانچ ممبران پارلیمنٹ جنہیں مسلمان ممبران پارلیمنٹ  
اپنے میں سے منتخب کریں۔ لئے جائیں۔
- کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ایجوکیشنل کمیٹی کورٹ کے  
منتخب کردہ اراکین ۸۰ ہونا چاہئیں۔ جو یونیورسٹی کے ملازم  
نہ ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

حکومت کے طرز عمل نے مسلم یونیورسٹی کے حقیقی کردار کے  
بارے میں شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے پیش نظر یونیورسٹی  
ایکٹ میں اس کی وضاحت ضروری ہو گئی۔ اس قسم کی وضاحت  
کوئی نئی بات نہیں۔ ہاں کورٹ کے فیصلوں کے بعد مرکزی اور  
صوبائی حکومتوں نے بار بار اصل قانون میں اس قسم کی دفعہ  
کا اضافہ کیا ہے۔

- (۳) کمیٹی نے تیسری اہم سفارش دفعہ ۱۱ الف کے  
سلسلہ میں کی تھی۔ مجوزہ بل میں یونیورسٹی کو اختیار دیا گیا تھا  
کہ ۱۵ میل کے اندر کالجوں یا تعلیمی اداروں کا اہتمام کر سکتی ہے  
یا انہیں یونیورسٹی کے مراعات کا مستحق قرار دے سکتی ہے۔  
کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ دفعہ ۱۱ الف منسوخ کر دیا  
جائے۔ اس سے یونیورسٹی کا اعلیٰ و اقامتی کردار بڑھ جائیگا۔
- (۴) مجوزہ بل میں دزیٹر کے اختیارات میں بہت زیادہ



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(ترمیمی)

## ایکٹ ۱۹۷۲ء

### حکومت کا نقطہ نظر

دفعات ہی میں ترمیم کی گئی ہے اس یونیورسٹی کے لیے جو قانون بنایا گیا ہے اس میں زیادہ تر تبدیلیاں ایسی ہیں جن کا تعلق قواعد و ضوابط سے ہے جنہیں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ (پھر بھی اگر کسی وقت یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل یہ محسوس کرتی ہے کہ تعلیمی مفاد یا یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر قواعد و ضوابط کی کسی دفعہ کو بدلتا یا کسی نئی دفعہ کا اضافہ کرنا ضروری ہے تو کونسل اپنی تجاویز یونیورسٹی کے وزیر یعنی بھارت کے ماسٹر پتی کو منظوری کی غرض سے پیش

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء  
اس قانون کی جگہ لی ہے جو ۱۹۶۵ء میں اس یونیورسٹی کے لئے ہنگامی طور پر وضع کیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ گجندہ رگدہ کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ان سفارشات پر مبنی ہے جو اس نے یونیورسٹیوں کے انتظام و انصرام سے متعلق سرکار کو پیش کی ہیں۔ اس ایکٹ میں علی گڑھ یونیورسٹی کو بڑی حد تک خود مختاری دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس ایکٹ میں بڑی ہچک موجود ہے۔ سابق ایکٹ کی صرف چند

کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے تعلیمی فروغ کی خاطر جب کبھی بھی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوگی تو وہ ایکٹ میں ترمیم کئے بغیر، جس کے لئے کہ پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہے لائی جاسکتی ہیں۔ آج کے دور میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے بیشتر حصوں میں تعلیمی رجحانات اور انداز فکر کے جو تقاضے رونما ہوئے ہیں انہیں کے پیش نظر موجودہ ایکٹ میں بچک پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ ذیل میں ترمیم شدہ ایکٹ کی چند اہم خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

**تاریخی کردار۔** اس ایکٹ میں یونیورسٹی کے تاریخی کردار کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے مستقبل کی تعمیر کے لئے جدید تعلیمی خیالات و نظریات کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے ۱۹۲۰ کے ایکٹ کے آغاز میں عبارت شامل ہے: تعلیمی اور اقامتی ادارے کی حیثیت سے علی گڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام ضروری ہے اور سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء (۱۸۶۰ء کی دفعہ ۲۱) کے تحت رجسٹر شدہ محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن ناٹو دونوں ایسوسی ایشنوں کو توڑنا ہے اور مذکورہ یونیورسٹی کو ان دونوں سوسائٹیوں اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے تمام حقوق اور املاک منتقل کر دینی ہیں۔

اسی ایکٹ کی دفعہ چار کا تعلق محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے توڑنے اور یونیورسٹی کی تمام املاک کے منتقل کرنے سے ہے۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے آغاز کی عبارت یا دفعہ چار کو اس نئے ایکٹ میں بالکل جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں یونیورسٹی کے قیام سے متعلق جو اغراض و مقاصد پیش کئے گئے تھے انہیں بدستور باقی رکھا گیا ہے۔

**یونیورسٹی کے اختیارات۔** یونیورسٹی کے قیام کا ایک مقصد مشرقی علوم اور اسلامیات کو فروغ دینا اور اسلامی دینیات

و مذہبیات کی تعلیم دینا نیز اخلاقی اور جسمانی تربیت دینا ہے جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے سیکشن ۵ (۲) میں مذکور ہے۔ یونیورسٹی کا یہ حق بدستور باقی رکھا گیا ہے۔ مزید برآں ایک اور کلاز کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے یونیورسٹی کو مذاہب، تہذیب اور بھارت کی ثقافت کے مطالعوں کو فروغ دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ بات گنجند گز کر کمیٹی کی ایک مخصوص سفارش پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ یونیورسٹی پہلے ہی عربی، فارسی، سنسکرت یا پراکرت اور پالی ایسی کلاسیکی زبانوں کی تعلیم دیتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اردو، ہندی اور دیگر جدید بھارتی زبانوں مثلاً تامیل، تیلگو، ملیالم اور بنگالی کی تعلیم پر کافی توجہ دی جا رہی ہے۔ یونیورسٹی نے اپنی تاریخ کا شعبہ اور متعدد دیگر شعبے بھارتی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دے رہے ہیں اور وہ اپنی توجہ بالخصوص اس موضوع پر صرف کر رہے ہیں کہ بھارت کی مشترکہ ثقافت کے فروغ میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا ہے۔ لہذا اگر اس ایکٹ میں مذاہب اور بھارت کی تہذیب و ثقافت کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے تو یہ عین مناسب ہے۔ شعبہ دینیات کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق شیعہ دینیات سے ہے اور دوسرے کا شنی دینیات سے۔ یہ دونوں شعبے بدستور قائم رہیں گے اور دینیات کی تعلیم اور تحقیق کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ شعبہ عمرانیات میں ایک شعبہ اسلامی تعلیمات کا بھی ہے جس میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصابات پڑھائے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی کے موجودہ اختیارات میں کچھ اہم اضافے درج ذیل ہیں۔

(۱) یونیورسٹی کی مسجد کے گرد ۲۵ کلو میٹر کے احاطے میں تحقیق و تعلیم کے لئے خاص مراکز، خصوصی لیبز، لائبریریاں اور دیگر ایسے یونٹ قائم کرنا جو یونیورسٹی کی رائے میں اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہوں گے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

(ب) بجنہ گڈارکیشن ایجوکیشن کیشن کی سفارشات کے مطابق تعلیمات کے کسی بھی شعبے کو ایک خود مختار شعبہ قرار دینا (ج) دیگر یونیورسٹیوں، اداروں یا تنظیموں میں کام کرنے والے اساتذہ کو یونیورسٹی میں کسی مقررہ مدت کے لئے بطور استاد مقرر کرنا۔

ان اختیارات سے یونیورسٹی کو اپنی تحقیقی سرگرمیوں اور پدمگرموں کو بڑھانے اور طریق تعلیم اور امتحان کے طریقوں میں مزید اصلاح و بہتری لانے میں مدد ملے گی۔

یونیورسٹی کو کچھ اضافی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں جو عام نوعیت کے ہیں۔ ان کا تعلق یونیورسٹی کے ملازمین میں ڈسپلن کو بڑھانے اور مرکزی سرکار کی منظوری سے یونیورسٹی کے لئے اخلاک کے حصول و انتظام اور دوسرے ادارے سے ملنے والے یونیورسٹی کا اقامتی کمرہ دار۔ یونیورسٹی کے سابق لیکچرر سیکشن ۱۲ (الف) میں یہ مذکور ہے کہ یونیورسٹی کی مسجد کے ۱۵ میل کے ارد گرد واقع کالجنوں اور اداروں کو یونیورسٹی اپنے ساتھ ملحق کر سکتی ہے تاہم یونیورسٹی نے اپنے ساتھ کسی کالج کا الحاق نہیں کیا۔ موجودہ ایکٹ میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہے کہ یہ دفعہ نکال دی گئی ہے۔ ایسا بجنہ گڈارکیشن کی سفارشات کے مطابق ہی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ تعلیمی اداروں کو وعدائی اور اقامتی کمرہ دار کو بقرار رکھنے کا تعلیمی نقطہ نگاہ سے بڑی حد تک جواز موجود ہے۔ وعدائی اور اقامتی کمرہ دار کی حامل یونیورسٹی میں تعلیمی انداز نظر کا فروغ اور نئے نئے تجربات بڑی آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح سے امتحان کے نظام میں بڑی اصلاح ہو سکے گی اور طلبہ کے کام کا مسلسل جائزہ لیا جاسکے گا۔ وعدائی اور اقامتی طرز زندگی کا فروغ اسی قسم کے اداروں میں ہو سکتا ہے۔

اس سیکشن کے نکل دینے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یقینی طور پر اعلیٰ تعلیم کے ایک مرکز کی حیثیت سے فروغ دیا جائے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

گاہ اور یہ ادارہ اس قسم کے غیر محنت مندانہ دباؤ سے محفوظ رہ سکے گا جس کا کہ اکثر غیر اقامتی اور الحاق کرنے کا حق رکھنے والی یونیورسٹیاں شکار ہو جاتی ہیں۔

وزیر کے اختیارات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈیڑھ کے اختیارات کم و بیش وہی ہیں جیسا کہ دیگر مرکزی یونیورسٹیوں میں ہیں۔ البتہ اس ضمن میں دو تبدیلیاں قابل ذکر ہیں۔

(۱) ڈیڑھ کو پہلے یونیورسٹی سے متعلق کسی بھی معاملے کے بارے میں تحقیق کرانے کا اختیار حاصل تھا۔ لیکن اب یہ اختیار محدود کر دیا گیا ہے اور اب ڈیڑھ یونیورسٹی سے متعلق صرف ایسے امور کی تحقیقات کر سکتا ہے جن کا تعلق یونیورسٹی کے انتظامی امور اور مالیات سے ہوگا۔

(ب) ڈیڑھ کی طرف سے کسی معائنہ یا تحقیقات کے ارادے کی اطلاع پانے پر یونیورسٹی کو یہ حق ہوگا کہ اگر وہ اس سلسلے میں کوئی عرضداشت پیش کرنا مناسب سمجھے تو کر سکے اور ڈیڑھ کو اس درخواست پر اس سے قبل کہ وہ کوئی معائنہ یا جانچ کرانے خود کرنا ہوگا۔

اس امر کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ ڈیڑھ ایسے دیگر اختیارات کو بھی بروئے کار لاتے جو قواعد و ضوابط کی روشنی میں استعمال کئے جاسکتے ہوں۔ (چونکہ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کو نئے قواعد و ضوابط وضع کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے اس لئے اب تو یہ ملے کرنا یونیورسٹی کا کام ہوگا کہ کن امور کے سلسلے میں ڈیڑھ کو مزید اختیارات دیئے جانے چاہئیں۔)

یونیورسٹی کے افسر۔ پہلے یونیورسٹی کے چانسلر کا انتخاب کونٹ کیا کرتی تھی۔ اب (قواعد و ضوابط میں) یہ درج کیا گیا ہے کہ اس کی تقرری ایگزیکٹو کونسل کے سفارش کردہ پنل میں سے، جو تین افراد سے کم لوگوں پر مشتمل نہیں ہوگا۔ ڈیڑھ کیا کرے گا۔ چانسلر یونیورسٹی کے بہترین مفادات میں اپنے اخلاقی اختیار



## اصلی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہی تو

اگر اس کی اصلی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہی تو ایسے چنار ٹر سے کچھ فائدہ نہیں جو ہم کو ہمارے اصلی اختیار سے محروم کر دے کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ گاڑی ہرگز نہیں چلے گی جس میں دو عملی ہوگی اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہوگا تا وقتیکہ ہم کو ہماری قومی ضرورتوں کے موافق انتظام کرنے کا موقع نہ ملے گا۔  
(شیخ محمد عبداللہ مرحوم)

کا استعمال کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور کسی گروہ یا گٹ کے ساتھ اس کا کسی بھی قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات میں وزیر کے ذریعے تقرری بہترین حل ہے۔ چانسلر کو کوئی انتظامیہ ذمہ داری یا اختیارات سونپنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ لہذا یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ کورٹ کا ممبر نہیں ہوگا۔ پرد چانسلر کی تقرری بھی وزیر ہی کیا کرے گا اور چانسلر کی عدم موجودگی میں وہ ڈگریاں عطا کرنے کے لئے منعقدہ یونیورسٹی کی کانووکیشنوں کی صدارت کیا کرے گا۔

وائس چانسلر کی تقرری کے طریقہ کار اور اس کے اختیارات و فرائض کو ضوابط میں درج کر دیا گیا ہے۔ البتہ قانون میں اس بات کا خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے کہ وائس چانسلر یونیورسٹی کا سب سے بڑا ایگزیکٹو اور اکیڈمک آفیسر ہوگا اور یونیورسٹی کے معاملات کی عام نگرانی اور کنٹرول کرنے کا کام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ لہذا اس قانون کی نوجو

کے کام کاج کو چلانے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی گئی ہے اور ماسوائے ترمیم کے اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکے گی۔

خزانچی کا عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اور اسکی جگہ اب ایک فنانس آفیسر ہوا کرے گا۔ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے اب تقریباً ۹۹ فیصدی رقم چونکہ سرکاری خزانہ سے ملتی ہے اس لئے یہ فردی ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں دوپہ پیسہ ہوں گی تقرری باقاعدہ طرز پر کی جانی چاہئے اور وہ ایگزیکٹو کونسل کے کنٹرول کے اندر ہونا چاہئے۔ ایک منتخب خزانچی کا عہدہ ایک فرسودہ عہدہ بن کر رہ گیا تھا کیونکہ جب یونیورسٹی کی آمدن کی رقم کو جمع کرنے کی ذمہ داری کورٹ پر تھی تو وہ چندہ دینے والوں کے مذاہنوں پر مشتمل تھی اور یہ واجب بھی تھا کہ یونیورسٹی کی اکاؤنٹس ہر پانچ اور اس کے مالی امور پر کسی ایسے شخص کا اختیار ہو جو کورٹ کی طرف سے چنا گیا ہو۔

یونیورسٹی کی اتھارٹیاں۔ اسٹوڈنٹس کونسل کے نام سے ایک نئی اتھارٹی اس ایکٹ میں شامل کی گئی ہے اس کونسل کو طلباء کے تعلیمی کام سے متعلقہ معاملات مثلاً انہماکات کے ڈھانچے، تعلیم کے طریقے، یونیورسٹی کی مشترکہ زندگی اور یونیورسٹی میں معاون نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں ایگزیکٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل سے سفارشات کرنے کا اختیار ہوگا۔ ڈسپلن (نظم و ضبط)، ہیڈ کوارٹر، ادبی اور شعبہ جاتی سوسائٹیوں، ہوسٹلوں کے انتظامات وغیرہ سے متعلق تمام مضامین کو اسٹوڈنٹس کونسل کے سامنے اسکی رائے حاصل کرنے کے لئے رکھا جائے گا۔

اس مد کے تحت ایک اور اہم تبدیلی کا تعلق کورٹ کے اختیارات سے ہے۔ مجبوراً اگر کسی نے اپنی رپورٹ میں تجویز کیا ہے کہ کسی یونیورسٹی میں درجہ دار تنظیم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یونیورسٹی اپنی کارپوریٹ باڈی کے ساتھ اسی صورت میں بہترین طریقہ سے کام کر سکتی ہے جبکہ ہر متعلقہ عنصر ہر طرف

پر فیصلہ کرنے کے عمل سے وابستہ ہو۔ لہذا ایک اعلیٰ گورننگ  
بازی مقرر کرنا کسی یونیورسٹی کے بہترین مفادات میں نہیں ہوگا  
اس کے برعکس ایک ایسا ادارہ قائم کرنا حق بجانب ہو سکتا  
ہے جس میں اساتذہ اعلیٰ طلباء نیز ایسے لوگ شامل ہوں جو طلباء  
کے یونیورسٹی چھوڑنے پر ان کے امکانی آجروں سے ہوں تاکہ  
وہ تعلیم کے نصاب اور اس سمجھ کے بارے میں جو یونیورسٹی  
کو اختیار کرنی چاہیے، اپنا مشورہ دے سکیں۔ سابق طلباء کے  
ایماندہ بھی شامل ہونے چاہئیں کہ یونیورسٹی کے مستقبل  
اور پیروں کے ساتھ ان کا جذباتی تعلق ہونا ایک قدرتی بات  
ہے اور وہ مفید مشورہ دینے کے لئے اپنے تجربے کو ہمیشہ استعمال  
کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے ایکٹ  
میں کھٹ کھٹ سے دلیل اختیارات دیئے گئے ہیں:-

(۱) یونیورسٹی کی اہم پالیسیوں اور پروگراموں کا مذاقہ و ترمیم  
جاگروہ یا کمیٹی کی ہر چار سالہ ترقی کیلئے اقدامات تجویز کرنا۔  
(۲) یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ، سالانہ حساب کتاب  
اور اس کی آڈٹ شدہ رپورٹیں پر غور کرنا اور ان کے بارے  
میں ریزولوشن پاس کرنا۔

(۳) مشورہ کئے جانے جو بھی معاملہ اس کے پاس بھیجا  
جائے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اور مشورہ دینا اور۔

(۴) قواعد و ضوابط میں مندرجہ دیگر فرمیں کو انجام دینا۔  
گڈ گورننس کے لئے اختیارات کی روشنی میں  
یونیورسٹی ایجوکیشن کوونسل کا نام بدل کر پرنسپل ایجوکیشن باورڈ رکھا  
جلا رہا ہے کیونکہ سامانہ طرز پر زیادہ سے زیادہ ممکن حد  
تک غیر مرکزیت ہونی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہیل  
میل پیدا کرنے کی غرض سے کسی دوسری شخص کو ایجوکیشن معاہدہ  
میں اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

کوونسل کو حاصل ایکٹ ایک اختیارات کو غیر مرکزیت کر کے  
انہیں جیکوز (شعبات) ڈیپارٹمنٹ آف اسٹیلیز، ایڈوانس

اسٹیلیز وغیرہ کو دے دیا گیا ہے۔ اب یہ کوونسل یونیورسٹی کا  
سب سے بڑا ایکٹ ایک ادارہ ہوگی اور اسے مختلف فیکلٹیوں،  
(شعبات) کے درمیان تال میل پیدا کرنے اور یونیورسٹی  
کی ایکٹ ایک پالیسیوں پر کام نگرانی کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔  
اب ایک فنانس کمیٹی یونیورسٹی کی ایک اتھارٹی بنی۔  
یہ محسوس کیا گیا ہے کہ تمام مالی معاملات ایجوکیشن کوونسل کے دائرہ  
اختیار میں ہونے چاہئیں۔ لہذا فنانس کمیٹی کو یونیورسٹی کی  
ایک اتھارٹی کی بجائے ایجوکیشن کی ایک ذیلی کمیٹی بنا دیا ہے  
قواعد و ضوابط اور آرڈی نیٹس کی تشکیل۔  
قواعد و ضوابط اور آرڈی نیٹس تیار کرنے کے طریقہ کار میں  
سمجھوتہ بندی کر دی گئی ہے۔ اب ایجوکیشن کوونسل کو وزیر کی  
ذخامندی سے نئے یا مزید قواعد و ضوابط مرتب کرنے یا موجودہ  
قواعد و ضوابط میں ترمیم کرنے یا انہیں منسوخ کرنے کا اختیار  
حاصل ہوگا جن بات کے بارے میں قواعد و ضوابط اور آرڈی

### اسلامی کیرکٹر بدلتا نہیں چاہتے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو اسلامی تہذیب  
کا مرکز بتائی جاتی ہے، اس کے  
اسلامی کیرکٹر کو بدلتا نہیں چاہتے  
مسلم نے دنیا کی تہذیب میں ایک  
نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس  
کے مطالعے کے لئے ہندوستان  
کی ہر بڑی یونیورسٹی میں خاص شعبہ  
کھولا جانا چاہئے۔ مسلم یونیورسٹی  
علی گڑھ کو خاص طور پر اس کا مرکز  
دینا چاہئے۔ (ڈاکٹر گوپال سنگھ)

نہیں تیار کئے گئے ہیں ان کی فہرستوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔  
اضافی دفعات۔ ایکٹ میں درج ذیل اہم دفعات بھی شامل کی گئی ہیں:-

(۱) اساتذہ اور افسروں کے ماسوائے یونیورسٹی کے ملازمین کے لئے ایک ثالثی ٹریبونل مقرر کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

(ب) یونیورسٹی کے کسی افسر یا اہلکار کے فیصلوں کے خلاف یونیورسٹی کے ملازموں اور طلباء کو ایگزیکوٹو کونسل کے پاس اپیل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(ج) کسی ایسے طالب علم یا کسی امتحان کے کسی ایسے امیدوار کو جس کا نام یونیورسٹی کے رجسٹر سے کاٹ دیا گیا ہو اور جسے ایک سے زیادہ برسوں کے لئے یونیورسٹی کے امتحانات میں بیٹھنے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو، ایگزیکوٹو کونسل سے اپیل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(د) نیک نیتی سے کی گئی کارروائی کے لئے یونیورسٹی کے افسروں اور ملازموں کو قانونی چارہ جوئی سے تحفظ دلانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

قوانین:- (۱) یونیورسٹی کی کورٹ، یونیورسٹی کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں تعلیمی برادری کے مختلف شعبوں سے تعلقات رکھنے والے اہلکار، جن میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیاں وضع کرنے والے افراد، اساتذہ، طلباء اور سماج کے دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں یونیورسٹی کی موتی موتی پالیسیوں اور پروگراموں میں تبادلوں، خیالات اور نظر ثانی کرنے، اس کی اصلاح اور ترقی کی تدابیر تجویز کرتے نیز یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ اور سالانہ حساب کتاب پر اظہار خیال کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً مل بیٹھتے ہیں۔ بنیادی امور پر کورٹ کی بحث یونیورسٹی کو سماج کی ضرورتوں اور تقاضوں

کا احساس دلاتی ہے۔ لہذا کورٹ کو بحث و مباحثہ ہی تک محدود ہونا چاہیے اور اسے یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیے کہ ایگزیکوٹو اور ایکٹنگ کونسلوں یا یونیورسٹی کی دوسری تعلیمی باڈیوں کے فیصلوں کو رد کر دے۔

تریمی قانون مجریہ ۱۹۷۲ء ایک سو بیس اراکین کی ایک کورٹ فراہم کرتا ہے اس میں ایکس ایکسٹو اراکین مثلاً وائس چانسلر، پرووائس چانسلر اور فیکلٹیوں کے ڈین اسٹوڈنٹس کونسل کا پیرمینٹ اسٹوڈنٹس ویلفیئر کا ڈین، الابریری اسٹوڈنٹس یونین پریذیڈنٹ، پرائز اور تمام سابق وائس چانسلر شامل ہوتے ہیں۔ شعبوں اور کالجوں کی نمائندگی کے لئے اس میں نائے کالج،

طبیہ کالج اور پولی ٹیکنک کے پرنسپل اور شعبوں کے ۱۶ سربراہ ہوں گے۔ یہ نمائندگی سپنارٹی کے مطابق مختلف فیکلٹیوں کو

باری باری مناسب طور پر دی جائے گی۔ شعبوں کے سربراہوں اور پرنسپل کے علاوہ پانچ ریڈ اور پانچ بلیک اور باری باری ترقی

کے اعتبار سے یونیورسٹی کے محروموں کی نمائندگی کریں گے۔ تریمی قانون میں ایک بنیادی اہم تبدیلی طلباء کے ۱۵ نمائندوں کی

شمولیت کے معاملے میں کی گئی ہے اسٹوڈنٹس یونین کا صدر اور سکریٹری، اسٹوڈنٹس کونسل کا سکریٹری، اسٹوڈنٹس کونسل کی

طرف سے چنے ہوئے دو اشخاص، تعلیمی امتیاز حاصل کرنے والے طلباء پر مشتمل ایک کونسل کالج کی طرف سے چنے ہوئے پانچ

طلباء اور کچلر کمیٹی، سوشل سروس کمیٹی اور گیز کمیٹی پر مشتمل ایک کونسل کالج کے چنے ہوئے پانچ طلباء کے نمائندے ہوں گے۔ اس طرح

ان تینوں عناصر میں جن پر کوئی بھی یونیورسٹی مشتمل ہوتی ہے۔ معقول توازن رکھا گیا ہے۔ اس میں ذہین طلباء کے نمائندے

ہوں گے۔ غیر نصابی سرگرمیوں، امتیازی حیثیت پانے والوں مثلاً کھلاڑی یا مختلف ثقافتی سرگرمیوں یا سماجی خدمات میں

حصہ لینے والے طلباء کے نمائندے ہوں گے۔ مزید یہاں ان کے نمائندے ہوں گے جو طلباء کے جذبات کی نمائندگی کرنا



چاہتے ہیں۔ تاہم یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ نام نہاد پیشہ ور  
کھبا، کوہ گھسنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ پابندی رکھی  
گئی ہے کہ ایسا کوئی بھی طالب علم مذکورہ بالا کسی بھی ذمرے میں  
طلباء کی نمائندگی کرنے کا مجاز نہیں ہو گا جسے ہائی اسکول یا  
اس کے برابر کا امتحان پاس کئے آٹھ سے زیادہ سال گزر چکے  
ہوں یا پری یونیورسٹی یا اس کے برابر کا امتحان پاس کئے سات  
سے زیادہ سال گزر چکے ہوں یا وہ اس کو دس کے لئے جس کا  
وہ طالب علم ہے مقررہ مدت سے ایک سال سے زیادہ مدت  
لگا چکا ہو۔

یونیورسٹی فنانس میں پندرہ نمائندے ہوں گے جن کا  
انتخاب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ کی روایات کے مطابق  
کرے گی۔ پارلیمنٹ کے دس نمائندے ہوں گے ان میں سے  
چھ کو لوک سمجھا کا اسپیکر اہل چار کو راجیہ سمجھا کا چیرمین نامزد کرے  
گا۔ مزید میں نمائندے علمی کام کر سکتے والوں اور خاص مفاد  
مثلاً صنعت تجارت، ٹریڈ یونین، بینک کاری، انڈیا اعلیٰ کے  
نمائندے ہوں گے جنہیں وزیرٹر نامزد کرے گا۔ ایک خاص گنجائش  
یہ رکھی گئی ہے کہ ان میں سے کم از کم پانچ ہندوستان  
کے ثقافتی اور تعلیمی اداروں کے نمائندے ہوں گے۔ سمجھوتہ گروہ  
کیسٹ کی سفارشات کے مطابق اس ذمرے کے افراد کو وزیرٹر  
نامزد کرے گا اور کچھ چھ نہیں جائیں گے کیونکہ اس معاملے  
میں یہ پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ صنعت، زراعت، بینک کاری  
اور تجارت وغیرہ میں ممتاز حیثیت رکھنے والے اصحاب اس  
قسم کے لوگ نہیں ہوتے جو کسی حلقے سے امیدوار کھڑے ہوں  
ان سے توجہ خواست کرنی ہوگی کہ وہ یونیورسٹی کی کارکردگی میں  
دل چسپی لینے کے لئے شمولیت قبول کریں۔ اگر کوہ سوں کو جدید  
اقتصادی تعاونوں کے ہم آہنگ کرنا مقصود ہے اور اگر یونیورسٹی  
کی تحقیقی سرگرمیوں اور ملک کی اقتصادی و ترقیاتی ضرورتوں کے  
درمیان گہرا رابطہ قائم کرنا مقصود ہے تو ان کا مشورہ نہایت

قیمتی ہوگا۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کہ یونیورسٹی محض نہایت  
نادر ہے، یہ ضروری ہے کہ ایسے بلند مقام اصحاب خصوصاً جن  
کا تعلق صنعت کے پبلک سیکٹر سے ہے۔ یونیورسٹی کے معاملات  
میں عملی حصہ لیں۔ یہ بات سراسر ناقابل فہم ہے کہ کسی سرکردہ  
پبلک سیکٹر ادارے کا سربراہ یا ٹیکنیکل ڈائریکٹر یونیورسٹی میں  
جائے گا اور یونیورسٹی کی کورسز کے انتخاب میں اپنے آپ کو  
بطور امیدوار پیش کرے گا۔ لہذا یہ مناسب سمجھا گیا کہ وزیرٹر کو  
یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ایسے افراد کو نامزد کرے جو نامزد  
ار اکیں میں چیف ریکٹر کا ایک نمائندہ اور چانسلر کی طرف سے  
نامزد تین افراد شامل ہوں گے۔

(۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (تریمی) قانون، یونیورسٹی کو  
۲۱ اراکین کی ایک ایجوکیٹو کونسل فراہم کرتا ہے جس میں  
فائنس چانسلر، پروفیسر فائنس چانسلر، پانچ ڈین، ایک پرنسپل ایک  
پروفیسر، تین ٹیچر (جن کا انتخاب اکیڈمک کونسل کرے گی اور  
ان میں سے کم از کم ایک لیگسلاٹو ہوگا)۔ پانچ افراد (جس کا انتخاب  
متناسب نمائندگی کے اصول پر کوٹ کرے گی اور ان میں  
سے کوئی بھی یونیورسٹی یا اس کے کسی کالج کا ملازم یا طالب علم  
نہیں ہوگا) اور دیگر چار افراد جنہیں وزیرٹر نامزد کرے گا، شامل  
ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۱ اراکین میں سے دس  
فائنس چانسلر اور پروفیسر فائنس چانسلر کے علاوہ یونیورسٹی کے  
اساتذہ کے نمائندے ہوں گے۔ اس کا اصلی مقصد اور نیت  
باب یہ ہے کہ یونیورسٹی کو چلانے کی بنیادی ذمہ داری اساتذہ  
کو دی جانی چاہئے۔

(۳) اکیڈمک کونسل جو یونیورسٹی کی بڑی تعلیمی باڈی  
ہے فائنس چانسلر، پروفیسر فائنس چانسلر، فیکلٹی کے ڈین، مطالعاتی  
شعبوں کے سربراہوں، پرنسپلوں اور انسٹی ٹیوشنوں کے سربراہوں  
سٹوڈنٹس پیپیر کے ڈین، سٹوڈنٹس کونسل کے چیرمین،  
لائبریرین، شعبوں کے سربراہوں سے الگ پانچ پروفیسروں،

شعبوں کے سربراہوں سے الگ پانچ ریڈروں، پانچ پیکر اور پانچ افراد (جو یونیورسٹی کی ملازمت میں نہیں ہوں گے اور ان کے خاص علم کی وجہ سے ایڈمک کونسل انہیں بطور شریک کا منتخب کرے گی مگر اس شرط کے ساتھ کہ کسی ایک فیکلٹی کو سوچنے ہوئے موضوعات سے وابستہ دوسرے زیادہ افراد کو نہیں لیا جائے گا) ایک پروفیسر جسے وائس چانسلر نامزد کرے گا اور پراکٹر پر مشتمل ہوگی۔

ایڈمک کونسل کے اراکین کی میعاد تین سال سے جیسی کہ ترمیم سے پہلے قانون میں تھی، کم کر کے دو سال کر دی گئی ہے تاکہ اساتذہ کی باری جلدی آئے اور ہر استاد کو یونیورسٹی کی اس بڑی تعلیمی باڈی کا رکن بننے اور اپنی شرکت سے یونیورسٹی کے تعلیمی امور کو فیض پہنچانے کا موقع ملے۔ گنڈ گڈ کر کیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایڈمک کونسل کا دائرہ کار تنگ کر دیا جائے۔ ایڈمک کونسل کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ پالیسی وضع کرے، مختلف شعبوں میں رابطہ قائم کرے تعلیمی معیار بڑھانے کی اصولی ہدایات دے اور یونیورسٹی کے عام تعلیمی مفاد کا دھیان رکھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون مجریہ ۱۹۷۲ء سے وابستہ ذیلی قواعد کی رو سے ایڈمک کونسل کو یہ خاص ذمہ داری دی گئی ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیوں کی نگرانی کرے اور طریق تعلیم، کالجوں میں مربوط تدریس تحقیقی کام کو فروغ دینے اور تعلیمی معیار بڑھانے میں رہنمائی کرے۔ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ مختلف شعبوں میں رابطہ پیدا کرے اور ایسی کمیٹیوں یا بورڈوں کا تقو کرے جو مختلف شعبوں میں ارتباط کی بنیادوں پر نئے منصوبے ہاتھ میں لیں۔ ایڈمک کونسل کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ عام تعلیمی افادیت کے معاملہ پر خود غور کرے یا کسی شعبہ یا ایگزیکٹو کونسل کی طرف سے اسے یہ کام کرنے کو کہا جائے تو کرے تعلیم کے نصاب، ممتحنوں، امتحانی پرچہ مرتب کرنے والوں وغیرہ

کے ناموں یا ممتحنوں کی بورڈوں اور تحقیقی مقالوں کی منظوری دینے کے معاملات ایڈمک کونسل کے پاس نہیں جائیں گے۔ (۱۶) یونیورسٹی کے علمی شعبوں (فیکلٹیوں) کو زیادہ آزادی دی گئی ہے تاکہ تدریسی اور تحقیقی سرگرمیوں کے درمیان ربط باہم رہے اور تحقیقی منصوبوں پر باہمی نظم و ضبط کے طریق کار کو فروغ ملے۔ اب ان شعبوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر ذیلی شعبہ کی طرف سے سفارش کردہ کورس کی منظوری دے سکتے ہیں اور اس میں پیدا کرنے یا ختم کرنے کی سفارش کر سکتے ہیں۔ اس میں شعبوں میں ریڈروں اور پیکر اور کو زیادہ نمائندگی دی گئی ہے اور دوسرے شعبوں کے لیے ایڈمک کونسل کے نامزدگان فراہم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱۷) ترمیمی قانون، ہر ڈیپارٹمنٹ (ذیلی شعبہ) کو ایک ایڈوانسٹ برائٹ فراہم کرتا ہے جو اس ڈیپارٹمنٹ کے چار ریڈروں اور چار پیکر اور، متعلقہ مضامین پڑھانے والے دو افراد اور دو ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔ بورڈ کو جو کام تفویض کئے گئے ہیں ان میں مطالعہ کے لئے کورسوں کی سفارش، ممتحنوں کی تقرری، تحقیقات کے لئے موضوعات کی منظوری، ریسرچ کے لئے پروفیسروں کی تقرری ادا شدہ گریجویٹ واپس گریجویٹ مطالعات و تحقیق کے حوالہ کو بلند کرنے کی تدابیر کرنا شامل ہیں۔ (۱۸) ہر اس تدریسی ڈیپارٹمنٹ میں، جہاں اساتذہ کی تعداد بیس سے زیادہ ہوگی، اب ایک ڈیپارٹمنٹل کمیٹی بنائی جائے گی جو اس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ، متعلقہ فیکلٹی کے ڈین ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسروں، چار ریڈروں اور پیکروں پر مشتمل ہوگی، جو اس ڈیپارٹمنٹ کے ہوں گے اور ہر ذیلی شعبہ کی باری سے لئے جائیں گے، مشتمل ہوگی۔ ڈیپارٹمنٹل کمیٹی اساتذہ کی نئی اسامیاں نکالنے یا ختم کرنے یا ان کا دورہ بڑھانے کی سفارش کرے گی اور اس ڈیپارٹمنٹ نیز اس کی کارکردگی سے متعلق عام تعلیمی مفاد کے معاملات پر غور کرے گی۔ جس



## مولانا محمد علی

مزدت اس امر کی ہے کہ قومی قومی جہتیں اہم نہیں  
اس وقت ملک میں موجود ہیں جب کہ ریٹوں پر وہ ہیں جو ملک  
میں ایک ایسی بددست ایک نیشن کیلئے کہ شیوں کو قومی جذبہ کے  
مطابق کاروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑے یا صاف اہلکار کو پانچ روپے  
اس کاغذ کو قومی کاغذ نہیں سمجھتے نہ قوم کی آواز کا ان پر اثر چلے  
میں ہونے پر ان کو قومی نیشن کو سب سے بڑا حصہ لینا پڑیگا اور ان کے  
اسلئے مناسب جانا کہ دیسی نیشن کو پہلے سے متعلقہ قومی مسائل  
الگوئی یا اختیار اور ذی اقتدار جماعت جیسا کہ اصل لایا ہے قوم کے  
ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ اپنی جماعت میں تمام خالی جگہوں کو بھی ہی خود  
کرتی ہو قومی جذبہ کے سرسرخ لاف کاروائی کرنے کے لئے قومی حالت  
میں قوم کی اگر سکتی ہے ۱۹۷۱ کے لئے صرف وہ ہیں کھلی ہیں اور نیشن  
کرے اور اس جماعت سے اپنے جذبہ و احساسات کا اظہار کرے  
PASSIVE RESISTANCE سے مقابلہ کرے (پہلے قومی)

اس وجہ سے نہیں بننا چاہتا کہ اسے اس میں دھپی نہیں دینا چاہتا  
ذمہ داریاں سنبھالنے کا شوق نہیں یا کافی عرصہ تک وہ انتظامیہ  
ذمہ داریاں لے کر چکا ہے، ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کئے  
جانے کی پیش کش قبول کرے سے انکار کر سکتا ہے۔

(۹) یونیورسٹی میں پروفیسروں، ریٹروں اور لیکچراروں  
کے تقرر کی سفارشات کرنے والی سلیکشن کمیٹی کی ساخت میں بھی  
تبدیلی کی گئی ہے۔ اس وقت تک فیکلٹی کاؤن سلیکشن کمیٹی کا  
رکن ہوا کرتا تھا۔ اب متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ سلیکشن کمیٹی کا  
رکن ہوا۔ کمیٹی کے اہلکار اکیڈمی کو ایگزیکٹو کونسل ایک پیل میں  
سے نامزد کرے گی۔ اس پیل کے ناموں کی سفارش اکیڈمی  
کونسل متعلقہ شعبوں میں ان افراد کے خاص شغف یا علمی استعداد  
کو ملحوظ رکھ کر کرے گی۔ ایک سال سے کم مدت کی عارضی اسٹیبل  
کے لئے الگ سلیکشن کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ دیسی کمیٹی فیکلٹی

تدریسی ڈیپارٹمنٹ میں اساتذہ کی تعداد میں سے زیادہ نہیں  
ہوگی ڈیپارٹمنٹل کمیٹی کے فرائض خود وہ ڈیپارٹمنٹل سربراہ ہونگے  
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون ۱۹۷۱ء سے  
پہلے کوڑتین سال کے لئے یونیورسٹی کا چانسلر منتخب کرتی تھی  
(۷) دانش چانسلر کا تقرر کم از کم تین افراد کے پینل  
میں سے وزیر کرے گا اور ان میں افراد کا انتخاب ایک کمیٹی کریگی  
جو خود تین افراد پر مشتمل ہوگی۔ کمیٹی کے دو اراکین ریگزیٹو کونسل کے  
کے مقرر کردہ ہوں گے مگر ان میں سے کوئی بھی یونیورسٹی کا لائبر  
یا کونسل ایگزیکٹو کونسل یا اکیڈمی کونسل کا رکن نہیں ہوگا۔ کمیٹی  
کے تیسرے رکن کو وزیر نامزد کرے گا۔ دانش چانسلر کی میعاد  
پانچ سال مقرر کی گئی ہے۔ اب تک یہ میعاد چھ سال ہو کر تین تین  
تہم اب اسے دوسری بار بھی مقرر کیا جاسکے گا۔ اب تک کے  
دستور کے مطابق وہ باہر تفری نہیں ہو سکتی تھی۔

(۸) اب تک ہر ڈیپارٹمنٹ آف سٹڈی کا سربراہ جو  
لیکچرر تھیں ہوا کرتا تھا، برتری کے اعتبار سے اپنی باری سے  
دو سال کے لئے فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔  
اسی طرح پہلے یہ قاعدہ تھا کہ ہر ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ایک  
پروفیسر ہوا گا اور پروفیسر نہ ہونے کی صورت میں ریٹرو ہی سربراہ  
ہوگا۔ لیکن اب ترمیمی قانون کی رو سے ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہی  
برتری کی بنا پر یا خود فیکلٹی کا ڈین نہیں بن سکے گا اور اس کے  
جائے دانش چانسلر ہی فیکلٹی کے پروفیسروں میں سے کسی ایک  
کو تین سال کے لئے ڈین مقرر کرے گا۔ ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ  
دانش چانسلر کی سفارش پر پروفیسروں میں سے کسی ایک کو ایگزیکٹو  
کونسل کی سفارش پر مقرر کرے گا۔ جن ڈیپارٹمنٹوں میں  
صرف ایک پروفیسر ہے۔ ان میں ایگزیکٹو  
کونسل کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ دانش چانسلر کی سفارش پر پروفیسر  
یا ایک ریٹرو کو ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کر سکے گی۔ یہ بھی دانش  
رکھی گئی ہے کہ کوئی بھی پروفیسر یا ریٹرو ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ





لوک بھا کے اسپیکر جناب جی، ایس، ڈھلوں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے  
مسلم یونیورسٹی کے چند طلباء کے درمیان

ڈین، ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ اور دانش چانسلر کے ایک نامزدین  
پر مشتمل ہوگی۔

(۱) قانون میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ یونیورسٹی کے  
ہر استاد یا تقرر ایک تحریری معاہدے پر ہوگا اور معاہدہ کا مضمون  
کے مطابق وضع کیا جائے گا۔ یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ  
یونیورسٹی کسی پروفیسر یا ریڈ کو جزوقتی بنیادوں پر کسی یونیورسٹی  
یا کسی ادارہ میں ساتھ ساتھ کام کرنے کی اجازت ایسی شرائط کے  
تحت دے سکتی ہے جو آرڈی نینس کے ذریعہ مقرر کی جائیں گی۔  
ترمیمی قانون کے تحت جسٹس ہر زمرے کے افراد کی مکمل اور  
آخری وقت تک کی برتری کے مطابق فہرست تیار کرے اور  
اپنے پاس رکھے۔

(۱۱) یونیورسٹی کے لئے اساتذہ کی ایسوسی ایشن اور  
فیر تدریسی عملہ کی ایسوسی ایشن بنانے کے لئے بھی گنجائش رکھی

گئی ہے۔ ایسی ایسوسی ایشنوں کے آئین اور فرائض اور دائرہ  
کار بذریعہ آرڈی نینس مقرر کیے جائیں گے۔

(۱۲) ایجوکیشن کمیشن نے یہ سائے ظاہر کیے ہیں کہ اسٹوڈنٹس  
یونین کو جماعت سے باہر یونیورسٹی کی زندگی میں طلباء کی شرکت  
کا ایک اہم ذریعہ پیش کرتی ہے۔ اگر یونین ٹھیک ڈھنگ سے  
منظم ہوں تو خود انتظامی اور خود ضبطی میں مدد دیتی ہیں۔ لہذا  
قانون میں یونیورسٹی کے لئے اسٹوڈنٹس یونین کی گنجائش رکھی گئی  
ہے۔ اس کی ترقی سے یونیورسٹی کے ہر طالب علم کو اس کا ممکن فائدہ  
کیا جائے گا۔ مزید برآں اسٹوڈنٹس یونین کی جزیل کونسل ہوگی۔ یہ  
فیصلہ ڈیننس کے ذریعہ کیا جائے گا کہ کونسل میں طلباء کی تعداد  
کتنی ہو اور اس کی تشکیل کس طرح کی جائے۔ اسٹوڈنٹس یونین اور  
جزیل کونسل کے اختیارات کا تعین بھی آرڈی نینس کے ذریعہ  
کیا جائے گا۔ (بشکریہ محکمہ اطلاعات گورنمنٹ آف اٹلیا)



# مسلم یونیورسٹی شعلوں کی ترغے میں ایکٹ ۱۹۷۲ء مخالفین کا نقطہ نظر

”اپنی مدد آپ کرو“ یہ ایک نہایت عمدہ اور  
آزادہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں  
کا اور انسانوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے  
کا جوش اس کی ترقی کی بھی بنیاد ہے اور جب یہ جوش بہت  
سے لوگوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت  
اور مضبوطی کی جڑ ہے۔ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے  
ظرفی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے  
بزرگوں کی کمائی کھورے۔  
سر سید احمد خاں  
خدا کے بعد مسلمانوں کی حالت گمے لگی تھی۔ ایسے  
وقت میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کیلئے  
سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمدن ایگلو اور نیشنل کالج  
کی داغ بیل ڈالی۔ بلاشبہ یہ کالج مسلمانوں کے لئے قائم  
کیا گیا تھا مگر اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ اس کے ذریعے  
سے ہندو مسلم کی تفریق کی جائے۔ بقول سر سید احمد خاں ”مجھ

کو بیدار فہم ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج  
ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم  
کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو کالج قائم کرنے کا ہوا یہ ہے  
کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے  
تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے  
سے باز رکھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں بیٹیاں لگتی تھیں  
اس واسطے یہ امر فردی خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے  
کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی  
جاسکتی ہے۔ فرض کرو دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک  
بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس  
کی تندرستی زوال پذیر ہے۔ پس اس کے دوسرے بھائی کا  
فرض ہو گا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کرے اور اس  
کی مدد کرے۔“

اس طرح ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد رکھی گئی تاکہ

مسلمان تعلیم حاصل کریں اور خود کو اس قابل بناسکیں کہ دوسری قوموں کے روش بدویشن کوڑے ہو سکیں۔ غیر مسلم جنہوں نے اس اطوار سے کئے گئے تعلیمات دیتے رہے وہ بھی اس سے حقیق تھے اس لئے اس کا لچ کے قیام کے وقت یہ بات پیش نظر تھی کہ ہر مسلمان طالب علم کے لئے نہ صرف اسلامی تعلیم کا انتظام ہو بلکہ اسے اسلامی تربیت بھی دی جائے۔ اس ماحول کو ایسا رنگ دیا جائے جو اسلامی ماحول کہلانے کا مستحق ہو مگر اس در سگاہ کے دروازے غیر مسلموں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان دروازوں کے کھلے ہونے کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ یہ در سگاہ مسلمانوں کے لئے قائم نہیں کی گئی۔

مسلمانوں کا یہ عزیز ترین ادارہ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء کے تحت محمدان ایجوکیشنل کالج سے دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اس ایکٹ نے یہ بات صاف طور پر واضح کر دی کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی اقامتی درس گاہ ہے۔ اس ایکٹ کی کئی دفعات نے اس بات کا اظہار کر دیا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ و بقا کے لئے تعمیر کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ جو سامنے اختیارات کی مالک ہے اس کا ممبر صرف مسلمان ہو سکتا ہے۔ اسلامی رہنمائی کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی۔ کورٹ کی ممبری کا نظام اس طرح قائم کیا گیا تھا کہ اسے نہ صرف ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہو بلکہ اس کا تعلق ہندوستان کی ملت اسلامیہ سے زیادہ سے زیادہ برقرار رہ سکے۔ کورٹ متفق ہو کر اپنے کسی ممبر کو وائس چانسلر نامزد کرتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۱ء: ۱۹۵۱ء میں مسلم یونیورسٹی کانیا ایکٹ پاس کیا گیا۔ اور ایکٹ ۱۹۲۰ میں کافی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ کورٹ کی ممبری کی یہ قید ختم کر دی گئی کہ کورٹ کا ممبر صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے اور یہ نظام عدم برہم کر کے

۲۲۴ اور دفعہ ونگٹ جاکست ۲۰۱۲

اس طرح تبدیل کر دیا گیا کہ کورٹ کی نمائندہ حیثیت ملت اسلامیہ سے ہٹ کر حکومت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور کورٹ حکومت کا ماتحت ادارہ بن گیا۔ وائس چانسلر کے تقرر کا حق وزیر تعلیم صدر ممبر ریہند کوڑے دیا گیا جو کورٹ کی نہیں بلکہ یونیورسٹی کی انتظامیہ کی سفارش پر کرتے تھے۔ اسلامی تعلیم یونیورسٹی کے ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری نہیں رہ گئی۔ اس طرح سے مسلم یونیورسٹی کے اقامتی کردار اور نام کے علاوہ باقی تمام امور میں تبدیلیاں کر دی گئیں جن کے حصول کے لئے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تئیں دھن کی بازی لگادی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان جو ۱۹۴۷ء کے اندر ہنگامہ حالات سے خوفزدہ تھے۔ ان بنیادی تبدیلیوں پر منہ سے آدھی بھال سکے۔

مسلم یونیورسٹی آرڈیننس ۱۹۶۵ء: ایک ایسے دور میں جبکہ پورے ملک میں تشدد اور بے راہ روی کی ہوائیں چکراتی پھرتی تھیں۔ طلباء میں بے چینی اور عدم اعتماد بڑھتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ملک کی زیادہ تر یونیورسٹیاں بند ہو چکی تھیں لیکن مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا رویہ پرسکون تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا ججندر گدگرنے کہا: ”صرف اتنا ہی نہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کو کاروبار پر مشغول رہا بلکہ حسی گڑبگڑ اس وقت بھی بلا کسی خلل کے اپنا کام جاری رکھا جب کہ یہ تکلیف دہ منظر نگاہوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا کہ متعدد معاصر یونیورسٹیاں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ یونیورسٹی کی خود مختاری ایک بہترین اصول ہے مگر صرف اس وقت جب اسے اس کا استحقاق ہو۔ اگر کسی یونیورسٹی کو خود مختاری کا حق حاصل ہے تو وہ مسلم یونیورسٹی کا کر سکتے ہیں۔“

۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کو یونیورسٹی کے چند ذمہ داروں نے طلباء کی عزت کو لٹکا رکھا۔ انہیں ایسا قہر اٹھانے پر مجبور کر دیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ میں

ہیڈ کوارٹر مسلم یونیورسٹی لاہور



مسلم یونیورسٹی کے گورنر بھیا ناک شعلہ رقص کرنے لگے۔ اس واقعہ کو مہاراجہ بنا کر حکومت نے پھر مداخلت کی تاکہ اسکے بنیادی کردار کو ہی ختم کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کو ٹھکراتے ہوئے حکومت نے یونیورسٹی پر ایک آرڈیننس نافذ کر دیا اور کچھ ہی دنوں بعد اس آرڈیننس کو مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۵ء کی شکل دیدی گئی۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۵ء ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت کوش کی تھوڑی بہت حیثیت باقی تھی مگر ایکٹ ۱۹۶۵ء کے ذریعے اس کی تبدیل کر دیا گیا یعنی اب کورٹ کے ممبر نامزد ہونے لگے اسی کے ساتھ کورٹ کے سارے اختیارات ختم کر دیے گئے۔ اب کورٹ کو صرف مشورہ دینے کا ہی حق رہ گیا۔ انتظامیہ کے ممبر بھی نامزد کئے جانے لگے۔ حتیٰ کہ ٹرینڈر جو ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت منتخب کیا جاتا تھا ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت اس کا تقرر انتظامیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ یہ قید بھی لگا دی گئی کہ انتظامیہ اپنے سارے اختیارات حکومت کے زیر نگرانی اور کنٹرول میں رہتے ہوئے استعمال کرے گی۔ اس طرح سے مسلم یونیورسٹی ایکٹ خود مختار جمہوری ادارہ نہیں رہا بلکہ اس کا انتظام براہ راست مرکزی حکومت ہند کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور حکومت مسلم یونیورسٹی کے سیاہ سفید کی مالک بن گئی۔

سپریم کورٹ کا المناک فیصلہ :- جمہوریہ ہند میں ۷۰ دے تک صرف مسلم یونیورسٹی ہی مسلمانوں کا اپنا ادارہ رہ گیا تھا۔ اس کے بھی اس طرح چھین لئے جانے پر ہندوستان کے مسلمان پہنچا گئے۔ حکومت نے ان کے احتجاج کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بے کس مسلمانوں کی نظر ہند کے سب سے بڑے عدل و انصاف کے دروازے پر پڑی اور حکومت کے فیصلہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ جمہوریہ ہند کا دستور دفعہ ۲۱ میں کہتا ہے کہ ہندوستان میں ہر قلمی فرقہ

ہندو مسلم یونیورسٹی نمبر

کو اپنے ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق حاصل ہے :- یہ سوچ کر مسلمانوں کو امید تھی کہ قانونی طور سے وہ مسلم یونیورسٹی کو پھر سے حاصل کر سکتے ہیں اور پھر سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا۔

ویر یونیورسٹی :- تو مسلمانوں نے قائم کی اور نہ اس کے نظم و نسق کا کوئی حق انہیں حاصل ہے۔ باوجود اس کے کہ مسلم یونیورسٹی کی پوری تاریخ بتائی ہے مگر ادارہ مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے قائم کیا۔

مہاراجہ کے ایڈوکیٹ جنرل جناب ایچ ایم سیریل کے بقول :- یہ وہ پہلا مقدمہ تھا جس میں سپریم کورٹ نے اپنی اس وسیع المشرقی کورٹ کی جس کو پیش نظر رکھ کر اس نے جناب جج اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے بارے میں فیصلے صادر کئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سپریم کورٹ نے چند نہایت تلک اصلاحی بنیادوں پر جو خود نارست اور غلط ہیں۔ یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ ادارہ اس اقلیت کا نہیں ہے جس نے ایک مسلم یونیورسٹی کے لئے جدوجہد کی اور اسے حاصل کیا اور نہایت دافر مقدار میں اس کو مال اور جائیداد سے نوازا اور باوجودیکہ ۱۹۲۰ء کا ایکٹ صرف مسلمانوں کو اس کا اعلیٰ ترین با اختیار طبقہ قرار دیتا تھا تاہم یہ چیز سپریم کورٹ کی نظر میں مسلمانوں کو اس کے نظم و نسق اور اسے چلانے کا اختیار عطا نہیں کرتی۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کے کسی بھی حق و اختیار کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور اس فیصلہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کی آئینی حیثیت حکومت کے طرف ایک ایسے مملوکہ ادارے کی رہ جاتی ہے جسے وہ کسی بھی وقت اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی شکل دے سکتی ہے۔

موجودہ صورت حال :- ادرا ب ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک طرف سپریم کورٹ کا فیصلہ

یہ کہتا ہے:-

۱۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں نے قائم نہیں کیا۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی کو چلانے اس کے انتظام میں دخل دینے کا کوئی حق مسلمانوں کو نہیں ہے۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی کوئی خود مختار تعلیمی ادارہ نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت ہند کا براہ راست ماتحت ادارہ ہے جو اس کے نامزد افراد کے ذریعہ چلتا ہے اور صرف حکومت کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی حق اس ادارہ کی نگرانی یا در انتظام میں دخل دینے کا نہیں۔ (عبدالصبیر نعیمی)

دوسری طرف مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء جو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری المحاج عبدالرحمن شیرانی کے خیال میں بھی خواہاں یونیورسٹی کی توقعات کے بالکل خلاف

اور سخت مایوس کن ہے یہ بل پارلیمنٹ نے ایسی عجلت سے پاس کیا جس کی مثال ملنا دشوار ہے اور پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے سے قبل کسی کو اس سے دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ بعض

ممبران پارلیمنٹ نے جو ترمیمیں پیش کیں انہیں کثرت آرا سے مسترد کر دیا گیا۔

وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ میں بل پیش کرتے ہوئے جو

تقریر کی اس میں دعویٰ کیا کہ یونیورسٹی کے خصوصی کردار کو برقرار

رکھا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ

اس بل کی مختلف دفعات کے ذریعہ یونیورسٹی کی خصوصیات کو

پامال کیا گیا ہے۔ جملا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ کورٹ۔

ایگزیکٹو کونسل۔ فنانس کمیٹی وغیرہ میں انتخابات کے جمہوری

اصول کو پس پشت ڈال کر نامزدگیوں کی بھرمار کر دی گئی ہے

وائس چانسلر کی نامزدگی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کے

مطابق وہ کم و بیش حکومت ہند بلکہ وزارت تعلیم کا نمائندہ

ہوگا اور پھر اس کے اختیارات میں جو بے جا اضافے کئے گئے ہیں

وہ یونیورسٹی کے جمہوری کردار اور اندرونی خود مختاری —

ایگزیکٹو کونسل۔ فنانس کمیٹی وغیرہ میں انتخابات کے جمہوری

اصول کو پس پشت ڈال کر نامزدگیوں کی بھرمار کر دی گئی ہے

وائس چانسلر کی نامزدگی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کے

مطابق وہ کم و بیش حکومت ہند بلکہ وزارت تعلیم کا نمائندہ

ہوگا اور پھر اس کے اختیارات میں جو بے جا اضافے کئے گئے ہیں

وہ یونیورسٹی کے جمہوری کردار اور اندرونی خود مختاری —

۲۲۱ اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۲ء

(AUTONOMY) دونوں کے لئے سخت مفاد نقصان

رساں ہیں۔ اسی طرح چانسلر اور پروفیسر کی نامزدگی کا طریقہ

بھی نہایت نامناسب جو بر کیا گیا ہے اور اس سے ان ممبروں

کا وقار بالکل ختم ہو جائیگا۔ ڈونرز کو جو اس یونیورسٹی کے بانیوں

میں سے تھے قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے اور کورٹ یا ایگزیکٹو

کونسل کی ممبری کا استحقاق انہیں آئندہ حاصل نہیں رہے گا۔

اسی طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جے بانی ایم۔

اے۔ او کالج نے قائم کیا تھا اور جس کا صدر مسلم یونیورسٹی کا

وائس چانسلر ہوتا ہے۔ کورٹ میں حق نمائندگی غلط کر لیا گیا

ہے۔ کورٹ۔ جن اداروں اور پیشوں (LEARNED PROFESSION ETC.) سے دس افراد کو پارکین منتخب

کرتا تھا اگرچہ اب ان کی تعداد بڑھا کر بیس کر دی گئی ہے۔

لیکن انہیں بھی وزیر نامزد کر لیا۔ اسی طرح پارلیمنٹ کے جو دس

ممبر کورٹ کے ممبر ہوں گے ان میں سے چھ کو اسپیکر لوک سبھا

اور چار کو چیئر مین راجیہ سبھا کا بالترتیب نامزد کریں گے یہ یقیناً

قہری ہے۔ کورٹ کے کل ممبر تقریباً ۱۲۰ ہوں گے جن میں سے

منتخب شدہ ممبروں کی تعداد صرف بیس ہوگی باقی سب باعتبار

اپنے عہدہ کے ایکس ایٹو ہوئے گے یا پھر نامزد منتخب شدہ ممبروں

میں سے ۱۵ اور بوائز ایسوسی ایشن کے نمائندہ ہوں گے

اور ۱۵ طالب علموں کے دراصل طالب علموں کے نمائندہ بھی

برائے نام ہی منتخب شدہ ہوں گے کیونکہ بالعموم ان کے

انتخابات کا طریقہ بالاسطر (INDIRECT) رکھا گیا ہے۔

چانسلر اور پروفیسر کورٹ کے ممبر نہیں ہوں گے ایگزیکٹو

کونسل کے ۲۱ ممبروں میں سے صرف پانچ کو کورٹ منتخب کر لیا

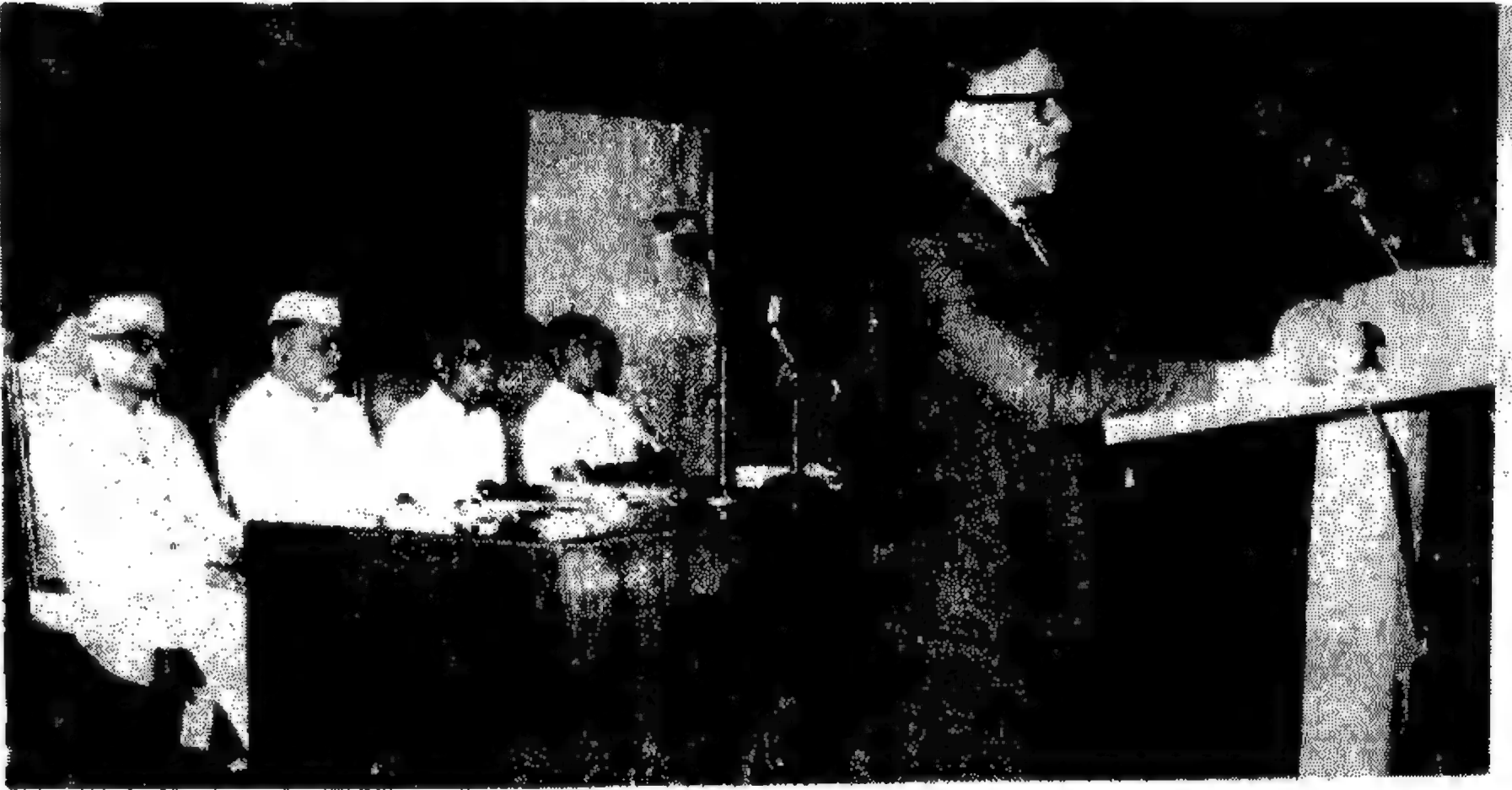
باقی سب ایکس ایٹو یا نامزد ہوں گے۔ کورٹ۔ ایگزیکٹو

کونسل اور ایکٹریک کونسل کے ممبروں کے انتخاب کیلئے

PROPORTIONAL REPRESENTATION کا اصول نہایت

نامناسب ہے۔ تعلیمی اداروں میں اس طریقہ انتخاب کا رواج

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر



گاندھی جینتی کے موقع پر کنینڈی ہال میں جلسہ پروفیسر آء این، سکینہ صدر شعبہ سوشیالوجی تقریر کرتے ہوئے

تھے با اعتبار سینیارنی باری باری سے زمین ہوتے تھے۔ لیکن موجودہ ایکٹ میں وائس چانسلر کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جس پروفیسر کو چاہے بلا لحاظ سینیارنی زمین مقرر کرے اسی طرح شعبہ کا صدر سینئر پروفیسر ہوتا تھا لیکن اب جن شعبوں میں ایک سے زیادہ پروفیسر ہوں گے ان میں وائس چانسلر جس پروفیسر کو چاہے صدر شعبہ مقرر کر سکتا ہے اور جن شعبوں میں صرف ایک پروفیسر ہوگا ان میں وہ اگر چاہے نوکسی ریڈر کو بھی متعین کر سکتا ہے۔ اس میں سینیارنی کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا ہے اور مسئلہ محض وائس چانسلر کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ پروفیسر اور ریڈر کا تقرر جو سلیکشن کمیٹی کرے گی زمین اس کا ممبر نہیں ہوگا حالانکہ وہ اب تک اس کا ممبر ہوتا تھا ہرگز درست نہیں ہے۔

آنریری ریڈر کے عہدہ کو بحال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے بجائے فنانس افسر کا تقرر ہوگا جو یونیورسٹی کا تنخواہ دار لازم ہوگا۔ وہ نہ کورٹ کا ممبر ہوگا نہ فنانس کمیٹی کا اور نہ ایگزیکٹو کونسل کا۔ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے آنریری

سیکرٹری ایم اے، اڈ کالج۔ کالج کے مالیات جاگیدار اور اوقاف کالنگراں ہوتا تھا یونیورسٹی کے قیام کے بعد یہ اختیارات آنریری ریڈر کو منتقل ہو گئے تھے ریڈر کو کورٹ منتخب کرتا تھا اور وزیر اس کی منظوری دیتا تھا وہ قوم کا معتمد علیہ ہوتا تھا جس اتفاق کا ایم اے، اڈ کالج کے آخری آنریری سیکرٹری نواب سید محمد علی صاحب مرحوم یونیورسٹی کے پہلے آنریری ریڈر منتخب ہوئے۔ چرچی کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ آنریری ریڈر کے تحت میں فنانس افسر مقرر کیا جائے جو مالیات کی گمرانی کرے انٹرنل آڈٹ کا حکم پہلے ہی سے قائم ہے جو پورے سال حسابات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے بموجب فنانس کمیٹی کے دو ممبر کورٹ کے منتخب کردہ اور دو ریڈر کے نامزد کردہ ہوتے تھے موجودہ ایکٹ کی رو سے نامزد ممبروں کی تعداد تین ہو گئی ہے اور صرف ایک ممبر کو ایگزیکٹو کونسل منتخب کیا کرے گی۔ فیکلٹی کے وہ پروفیسر جن شعبوں کے صدر بھی ہوتے رجسٹرار ریڈر کو یونیورسٹی کی جملہ انتظامی مجلسوں کے



ایجنڈہ کی قسمیں اور رویہ لازم بھیجا کرے گا کیونکہ یونیورسٹی کی آزادی میں بے جا مداخلت نہیں ہے۔

اسٹوڈنٹس یونین کے علاوہ طالب علموں کی ایک کونسل کا قیام تجویز کیا گیا ہے جس کا چیرمین وائس چانسلر کا مقرر کردہ کوئی استاد ہو گا اور جس طرح یونین کے صدر اور سیکریٹری کورٹ کے ممبر ہوں گے اسی طرح اس کونسل کے چیرمین اور سیکریٹری بھی ممبر ہوں گے۔ کونسل کے کاموں کا تعین آرڈی ننس کے ذریعہ کیا جائیگا۔ یونین کے ہوتے ہوئے کونسل کا قیام کیوں ضروری سمجھا گیا یا ایک دفاحت طلب سوال ہے۔

یہ کہنا کہ جب حکومت یونیورسٹی کی مالی امداد کرتی ہے تو اس کا پورا کنٹرول یونیورسٹی پر ہونا چاہیے نادانی پختی ہے اور یونیورسٹیوں کے اندرونی خود مختاری کے مسئلہ اصول کے منافی ہے۔ یونیورسٹی کو تعلیم اور اپنے اندرونی انتظام کے لئے قواعد و قوانین بنانے کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ دنیا کے کسی بھی جمہوری ملک میں حکومت یونیورسٹیوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی ہے۔ بعض حلقوں سے بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی میں صرف آٹھ ہزار طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان میں چھ ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ قلیل تعداد ملک کی ساری مسلم آبادی پر کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اور اگر اس یونیورسٹی کے مخصوص کردار کی ضمانت بھی کر دی جائے تو پورے ملک میں مسلمانوں کا تعلیمی مفاد اس سے کیسے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے نوجوان اور متعدد بیرونی ممالک کے طالب علم بھی تعلیم پاتے اور ہوسٹلوں میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایم، اے، اد کا لیجٹ اسکول کے

قیام ہی کے وقت سے یہاں کی اقامت گاہوں میں طلباء کی ایسی تربیت کی جاتی ہے اور ان میں ایسے برادرانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف پورے ملک بلکہ ان دوسرے ملکوں کے لئے بھی جن کے نوجوان یہاں تعلیم پاتے ہیں نمونہ کا کام دیتے اور بعد کی زندگی میں مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں اس لئے اس ادارہ کا مخصوص کردار نہ صرف ہائی رہنا چاہیے بلکہ باقی ڈرس گاہ کے مقاصد اور حالات زمانہ کے مطابق اسے اس طرح اجاگر کرنا چاہیے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء و باہر جا کر واقعی ہر شعبہ زندگی میں ممتاز اور نامور ہوں۔ دراصل موجودہ ایکٹ بجائے جمہوریت کو بحال کرنے کے جمہوری روایات کو بحال کرے گا اور امریت کے لئے راہ کھولے گا۔

برعکس نیشنل نام زنگی کالور

۱۹۶۵ء کے ایکٹ نے وائس چانسلر کو جو اختیارات تفویض کئے تھے ان سے یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی معاملات میں کیا بہتری ہوئی اس سے ہر شخص واقف ہے اور اس لئے اس بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اب موجودہ ترمیمی ایکٹ کی رو سے وائس چانسلر کو جو مزید اختیار عطا کئے گئے ہیں ان کا نتیجہ یونیورسٹی کے لئے جیسا کہ مفید یا مضر ہو گا اس کا اندازہ کرنا چندال دشوار نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس ادارہ پر مکمل تسلط قائم کرنا چاہتی ہے اور اسٹادوں، طلباء اور اولڈ بوائز کی یونیورسٹی کے نظم و نسق میں آزادانہ شرکت کے بجائے محدود اور مشروط شرکت کو کافی سمجھتی ہے۔ بہر صورت غور طلب امر یہ ہے کہ موجودہ ایکٹ سے یونیورسٹی کو جو نقصان پہونچ گیا اس سے اسے کیسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے اس سوال کا جواب تلاش کرنا یونیورسٹی کے ہر خواہ کا اولین فرض ہونا چاہیے (عبید الرحمن)

●●

# مسلم یونیورسٹی

## سیکولر روایات کا گہوارہ

(بی. پی. محمدیہ میسر پارلیمنٹ)

قانون کا لکچر مقرر ہو گیا

”جیسے ہی میں چھ سال کا ہوا میرے والد نے میرا داخلہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں کرا دیا، اس اسکول میں میرا استاد ایک برہمن تھا، اس زمانہ میں ذات پات کا عہد تھا، بہت زیادہ تھا مجھے دوسرے لڑکوں سے الگ بنایا جاتا۔ دوسرے لڑکوں کے بیٹھنے کے لیے فرش اسکول سے ملتا لیکن مجھے بیٹھنے کے لیے اپنا گاٹا اپنے گھر سے لے جانا پڑتا تھا۔ کلاس میں اندر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ کلاس سے باہر کمر کی کے قریب مجھے بٹھایا جاتا تھا۔ یہ برہمن صاحب دوسرے لڑکوں کو تو ان کی غلطیوں پر ہاتھ سے مارتے تھے، لیکن مجھے ڈنڈے سے پیٹا جاتا تھا چونکہ ڈنڈے کی جوت نہ قابل برداشت تھی۔ اس لیے ایک دن میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے بھی ہاتھ سے ہی مارا کیجئے، اس پر انہوں نے بگڑ کر کہا ”تم پلچھو ہو، میں تمہیں ہاتھ کیسے لگا سکتا ہوں“ اور پھر ایک دن مجھے ماسٹر صاحب نے بڑی گندی گندی گالیاں دیں اور بے طرح مارا۔

”میں نے دوسرے دن اسکول چھوڑ دیا اور قریب کی مٹی میں جو مکتب تھا اس میں اپنی تعلیم شروع کی ماسٹر صاحب نے میں نے درجہ چار پاس کیا۔ یہاں کے مدرس ایک مولوی صاحب تھے۔ یہاں ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں تھا مولوی صاحب نے کبھی مجھ سے نفرت نہیں کی، کبھی مجھے دوسرے لڑکوں سے الگ نہیں بٹھایا، کبھی میرے جسم کو ناپاک نہیں سمجھا۔

”علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد سے میری زندگی کا سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس شاندار یونیورسٹی میں ۱۹۴۸ء میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی۔ ایل ایل بی اور ایل ایل ایم ڈگریاں حاصل کیں۔ اتنا ہی نہیں، اس یونیورسٹی نے مجھے ملازمت بھی دی۔ اور میں اس کے شعبہ قانون میں دستوری

ملیگنڈہ مسلم یونیورسٹی نمبر

”میرے لیے برہمن ماسٹر صاحب کا اسکول، اسکول نہیں بلکہ قتل گاہ تھا لیکن مولوی صاحب کا مدرسہ جیسے میرا اپنا گھر۔ اسی طرح کا ماحول میں نے علی گڑھ میں پایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں ایک لفظ میں کہہ دوں یہ کہ اگر یہ یونیورسٹی نہ ہوتی تو آج کا مور یہ بھی نہ ہوتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا میری زندگی بنانے، سنوارنے اور نکھانے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قومی کردار بنانے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ وہ ہندوستان کی قومی درس گاہ ہے۔ حکومت کو اس معاملہ میں زیادہ دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مسلم یونیورسٹی کوئی فرقہ پرست ادارہ ہے۔ وہ سیکولر روایات کا گہوارہ ہے۔ میری اپنی مثال اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ لکچر شپ کے لیے میرے مقابلے میں ۱۳۶ امیدوار تھے، ان میں زیادہ تر مسلم تھے۔ مگر ان سب میں میرا انتخاب کیا گیا۔ اس لیے میں کسی طرح بھی یقین کرنے کیلئے تیار نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کوئی فرقہ پرست ادارہ ہے۔“

(ماخوذ از ہما نومبر ۱۹۶۶ء)

ادوڈ ایڈٹ ہما گسٹ ۲۲۹







# مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء قطع غریبوں اور علم دشمنی کا

## ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے

(شاہ صدیقی)

ناگروالا نے ریزرو بینک سے ۶۰ لاکھ روپے حاصل کئے۔ وہ پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ فوراً ہی فیصلہ سنایا گیا۔ سزا ملنے کے کچھ مہینے کے بعد ہی دہلی کے ولنگڈن ہسپتال میں اس نے دم توڑ دیا۔ یہ سب کچھ اس تیزی اور پھرتی سے ہوا کہ دیکھنے والوں نے محکمہ انصاف کی کارکردگی پر حیرت سے راتوں رات تلے انگ ربا لی۔ اختتام مقدمے کو جس غیر معمولی تیزی کے ساتھ نپٹایا گیا اس نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ افروز دال میں کچھ کالا ہے۔ آج بھی جب کچھ حزب مخالف کے سربراہان کی اس کانک کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو حکومت انکی کانکوں کا بھانڈا پھوڑ کر دال کی کانک کا معاملہ گول کر دیتی ہے۔

کچھ ایسا ہی مسلم یونیورسٹی بل کے معاملے میں ہوا شاید پارلیمنٹ میں کسی بل کو پیش کرنے اور پاس کرانے میں اتنی زیادہ پھرتی نہیں رکھائی گئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بل تمام مراحل سے گزر کر صدر جمہوریہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ایک بن چکا تھا۔ بل کو نہ تو کسی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا نہ اس پر رائے عامہ جاننے کی کوشش کی گئی جیسا کہ دستور ہے اور جیسا کسی بھی جمہوری نظام میں کیا جانا چاہیے اب اگر لوگ سوچتے ہیں کہ افروز دال میں کچھ کالا ہے تو اس میں ان کا

کیا قصور ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہمدردوں پر فرقہ واریت کا الزام لگانے والے چاہے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔ جب جمہوریت کے بڑے بڑے علمبردار اس غیر جمہوری طریقے سے پاس کئے جانے والے قطع غریبوں اور ایکٹ کی اندھی حمایت کریں تو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑیگا کہ یقیناً وہ فرقہ پرست ہیں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر اس ایکٹ کی حمایت کر رہے ہیں۔

پروفیسر یا کلرک: ہندوستان میں نظام تعلیم کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ یہاں پر پروفیسر کلاسوں میں کلرکوں کی طرح پڑھاتے ہیں طلباء کلرکوں کی طرح پڑھتے اور پانچ سال بعد ایم۔ اے کی ڈگری لے کر کسی بوسیدہ دیمک زرد دفتر میں کلرک بننے کے لئے چلے جاتے ہیں پڑھانے والے کو علم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ علم حاصل کرنے والے کے مستقبل سے ملک کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اسے اگر دلچسپی ہے تو صرف پہلی تاریخ کو ملنے والی تنخواہ سے۔ وہ کلاس میں آتا ہے اپنی دوکان کھولتا ہے اور بچاس منٹ بعد اپنی دوکان سمیٹ کر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان

میں دانش چانسلر کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔  
پروفیسر کچر اور طلباء سب ایک مشین کے کل پروزوں کی  
طرح ہیں جس کا بن دانش چانسلر کے ہاتھ میں ہے صرف  
یہی نہیں۔ یہاں تقرری کے وقت علمی اور تعلیمی میدان  
میں تجربہ رکھنے والے لوگوں پروفیزوں میں کام کرنے والے  
افسروں کو فروقت دی جاتی ہے۔ حال ہی میں اور سے پور  
یونیورسٹی کے آئین میں ترمیم کر کے وہاں کے رجسٹرار کو دانش  
چانسلر بنا دیا گیا۔

لیکن۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس بات پر فخر ہے کہ  
وہ اب تک ان معاملات میں ہندوستان کی تمام دوسری  
یونیورسٹیوں سے مختلف اور منفرد رہی ہے۔ یہاں آج تک  
استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک باپ اور بیٹے کا رشتہ بنا ہوا  
ہے نہ کہ ایک دوکاندار اور گاہک کا یہاں آج بھی جو نیر  
سینئر کی اپنے بڑے بھائی کی طرح عزت کرتا ہے اور سینئر  
اپنے جو نیر کا خیال رکھتا ہے۔ یہاں طالب علم صرف  
ڈگری لینے نہیں آتا بلکہ ایک نئی شخصیت بنانے آتا ہے  
علم حاصل کرنے آتا ہے۔ اور جب وہ یہاں سے نکلتا ہے تو  
اس پر چاہیے وہ ہندو ہو یا مسلمان مسلم یونیورسٹی کی  
پوری پوری چھاپ پڑ چکی ہوتی ہے۔ وہ اس قابل بن  
چکا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی کے  
طالب علم سے کسی بھی میدان میں ٹکڑے سکے۔ اس کی  
بات چیتا رکھ رکھاؤ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے مسلم یونیورسٹی  
کے علمی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ  
وہ ایک اچھا کلرک ثابت نہ ہو لیکن ایسا بہت کم دیکھنے  
میں آتا ہے کہ وہ ایک عمدہ انسان نہ بنے۔

لیکن۔ موجودہ ایکٹ نے یونیورسٹی کے اس امتیازی  
انداز کے اور پر اپنائیت سے بھرپور اس برادرانہ ماحول  
کے اوپر سب سے کاری ضرب لگائی ہے۔ اس ایکٹ کا اثر

یہ ہو گا یونیورسٹی کے پروفیزوں اور استادوں کی حیثیت  
بھی مشین کل پروزوں جیسی ہو جائے گی۔ ان کو چلانے کا  
کھٹکا دانش چانسلر کے ہاتھ میں ہو گا اور دانش چانسلر کا  
کھٹکا مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کے ہاتھ میں۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے  
لیکن جمہوریت صرف نعرے لگانے سے قائم نہیں ہوتی۔  
عمل میں جمہوری طریقہ اختیار کرنے سے ہوتی ہے اور اس  
جمہوریت کے بغیر جمہوری طریقہ عمل کا سب سے بڑا نمونہ  
مسلم یونیورسٹی ایکٹ ہے۔

اب تمام شعبوں کے ڈین (DEAN) بالکل غیر  
جمہوری طریقے سے دانش چانسلر کے ذریعے منتخب کئے جائیں  
گے اور صرف یہی نہیں۔ دانش چانسلر کو اس بات کا بھی حق ہو گا  
کہ وہ جسے چاہے کسی بھی شعبے کا صدر بنا سکتا ہے۔ یعنی اگر  
اب دانش چانسلر چاہے گا تو تمام اہم عہدوں پر جی حضور کہنے  
والے لوگوں کو مقرر کر دے گا۔ اب ترقی کر لے کے نئے پروفیز  
ہو جائے گا کہ دانش چانسلر کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اسی  
طرح دانش چانسلر مرکزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں  
لگا رہے گا۔ اساتذہ دانش چانسلر کی خوشنودی حاصل کرنے  
میں اور طلباء اپنے استادوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں۔  
اس طرح کم از کم ایک فائدہ تو ہو گا کہ علی گڑھ والوں کی محنت  
بہتر ہو جائے گی۔ یونیورسٹی میں کتابوں کی مانگ کم ہو جائیگی  
اور محقق کی مانگ بڑھ جائے گی۔

اسی طرح اساتذہ بہت سے گروپوں میں بنت جائیں  
گے۔ کچھ وہ ہوں گے جو دانش چانسلر کی خوشنودی حاصل  
کرنے کی کوشش کریں گے اور دوسرے وہ جو اس کے مخالف  
ہوں گے۔ کچھ استاد شعبوں کے صدر کے ساتھ ہوں گے تو  
کچھ اس کے پیچھے چھ دانش چانسلر کی خوشنودی حاصل  
کر کے اس کا تخت پلٹنے کے درپے ہوں گے۔ اس طرح مسلم

## مرستیہ کا منار

آپ (مرستیہ احمد خاں) کی تدفین اسی یونیورسٹی کی جات آفس خفا میں مسجد کے بائیں پہلو میں ہوئی ہے۔ مزار سنگ مرمر کا ہے۔ یہ وہی ہستی ہے جو بڑی زندگی میں کئی مزاروں پر عقیدت اور محبت کے پھول چڑھا چکی ہے مگر آج یہی ہستی چند پھولوں کے لئے بھی محتاج ہے۔ پھول تو پھول اس ہستی کے حق میں یہاں دعا کرنے کے لئے بھی بعد نماز جمعہ کوئی نہیں آتا۔ یوں تو ہر جمعہ کو مسجد نمازیوں سے لڑی حزد ہوتی ہے لیکن کوئی بندہ خدا ایسا نہیں جو اس ہستی کے مزار پر فاتحہ پڑھے۔ واقعی یہ بات ہمارے لئے کتنی اندھناک ہے۔ ہستی جس نے اس یونیورسٹی کی بنیاد کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا یہاں تک کہ اس ہستی نے اس یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے ہاتھ تک دھوڑوں کے آگے بھلائے تھے۔ افسوس، افسوس! آج وہی ہستی چند پھولوں کی محتاج ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ہستی کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور اس کی روح کو ابدی تسکین عطا فرمائے۔ (علیم صبا فزیدی بی اے علیگ)

لے لڑنے والی اسٹوڈنٹ یونین سے بھر اڑے گا۔ صرف یہی نہیں۔ اب اسٹوڈنٹ یونین کے عہدہ داروں کا انتخاب عام طالب علم نہیں کریں گے بلکہ پہلے ایک جنرل کونسل آف یونین قائم کی جائے گی جس کے کچھ ممبر عام طلبہ ہوں گے۔ اور کچھ نامزد کئے جائیں گے اور یہ کونسل یونین کے عہدے داروں کا انتخاب کرے گی یعنی ایک بار پھر ایم ایسوی صدر میں پہنچ جائیں گے۔ جب عام آدمی کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ اس طرح اسٹوڈنٹ یونین طلباء کی نمائندہ جماعت نہ رہ کر صرف ایک مذاق بن جائے گی۔ علی گڑھ میں ہوا۔ اب دہلی کی باری ہے۔ لیکن

یونیورسٹی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز کی بجائے غیر جمہوری سیاست کا اکھڑہ بن جائے گی

صرف یہ ہی نہیں بلکہ ایگزیکٹو کمیٹی کے زیادہ تر ممبر بھی وائس چانسلر کے پس میں ہوں گے۔ سب سے مزید ارباب یہ ہے کہ یہ ایگزیکٹو غیر تعلیمی اسٹاف - NON ACADE - کے لئے ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کرے گی اس کا آئین بنائے گی اس کو چلائے گی یعنی فور مالک اپنے کام کرنے والوں کی ٹریڈ یونین کو چلائے گا۔ اس قسم کے غیر جمہوری قدم کی مثال ہٹلر کے جرمنی اور سوویت کے اٹلی میں دیکھنے کو تول سکتی ہے لیکن کسی جمہوری ملک میں اس کی مثال لانا بہت مشکل ہے۔

ہماری حکومت سوشلزم کی علمبردار بنتی ہے اور غریبوں کی ہمدرد، لیکن یونیورسٹی کے غریب درجہ چہارم کے ملازمین کو کسی قسم کی مراعات نہیں دی گئی ہیں۔ انہیں کسی بھی کونسل یا کمیٹی میں کوئی نمائندگی نہیں ملی ہے۔

لوک سبھا میں جو بل پیش کیا گیا اس میں ایگزیکٹو کونسل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی ٹیچر کو بغیر کسی انکوائری کے یا بغیر وجہ بتائے دو مہینے کے نوٹس پر علیحدہ کر سکتی ہے لیکن مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر جگدیش بھٹا چاریہ کے زوردار احتجاج پر حکومت کو یہ غیر جمہوری قدم واپس لینا پڑا اور اس کی جگہ — "فردری انکوائری" کا لفظ بڑھا دیا گیا۔

دوسری طرف طلباء سے ان کے تمام جمہوری حقوق چھین لئے گئے ہیں اور یہ سب جمہوریت کے نام پر کیا جا رہا ہے اسٹوڈنٹ یونین کے علاوہ ایک اسٹوڈنٹ کونسل قائم کی جائے گی۔ اس کونسل کے ممبروں کا انتخاب خود وائس چانسلر کرے گا۔ اس طرح وائس چانسلر اگر چاہے گا تو طلباء کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیگا۔ کچھ لوگوں کو اسٹوڈنٹ کونسل کا ممبر بنا کر طلباء کے جائز حقوق کے



## اسلامی مکاتب کے مجموعہ کا نام

"فی الحقیقت بنامی یونیورسٹی ہندوستان کے

اسلامی مکاتب و مدارس اور کالجوں کے مجموعہ کا نام ہوگی۔"

"یونیورسٹی قائم ہو جانے کے بعد اسلامی آبادی کے تمام مرکزوں میں کالج ہوں گے اور یہ تمام کالج محض یونیورسٹی کے ماتحت اور تابع ہوں گے۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ۱۹۰۹ زکون

## پاپامیاں شیخ عبداللہ

"بشرط استقلال و عدم یونیورسٹی ضرورت ملے گی مگر میں

یہاں تک قوم کو اُسے دلوں کا کہ خواہ انجام کچھ بھی مگر اخیر وقت تک ہم کو ثابت قدم رہنا چاہئے اور اپنے

استقلال میں فخر برابری فرق نہ کرنے دینا چاہئے۔"

یونیورسٹی کے متعلق اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جس نقطہ خیال پر طمان متفق ہو چکے ہیں اسی پر قائم رہیں

ان دشواریوں سے جو گورنمنٹ کے جواب سے پیدا ہوتی ہیں، قومی استقلال میں ہرگز تذبذب نہ آنا چاہئے۔" ۱۹۰۵ء

اس سب سے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ صرف علی گڑھ میں ایسا ہو رہا ہے۔ اس قسم کے آرڈی نلنس درہل رہی یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے لئے بھی آنے والے ہیں۔ اس کے بعد دوسری یونیورسٹیاں کا نمبر آئے گا۔ ان غیر جمہوری اکیڈمیں کے ذریعے شاید حکومت کا ارادہ پورے نظام تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا ہے اور اس طرح یونیورسٹی میں خود سوچنے اور کہنے کی آزادی کو سلب کرنے کا ہے۔

دہلی یونیورسٹی میں پہلے ہی ایک آرڈی نلنس آچکا ہے جس کے خلاف یہاں کے اساتذہ اور طلباء مختلف تحریکیں چلا

رہے ہیں۔ علی گڑھ کے انداز پر دہلی میں بھی تین اسٹوڈنٹ کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ تین اس لئے کہ دہلی یونیورسٹی

میں اسی ہزار طالب علم ہیں جبکہ علی گڑھ میں صرف دس ہزار طالب علم ہیں۔ ان اسٹوڈنٹ کونسلوں کے قیام کے بعد

اسٹوڈنٹ یونین ایک مذاق بن جائے گی۔ طلباء آپس میں جھگڑیں گے اور یہاں بھی وہی نتائج برآمد ہوں گے

جن کی طرف علی گڑھ کے مسئلے میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس غیر جمہوری آرڈی نلنس کے خلاف دہلی یونیورسٹی

کے طلباء اور اساتذہ زبردست تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ تحریک تمام یونیورسٹیوں

میں متحدہ طور پر چلائی جائے تاکہ علی گڑھ کے جمہوریت پسند اور جائز حقوق کے لئے لڑنے والے طلباء اور اساتذہ پر

فرقہ داریت کا الزام لگانے والوں کا منہ بند ہو جائے یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے

جو فرقہ داریت کا نام لے کر "ہندو مسلمان" کا نام لے کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہ غیر جمہوری اور علم دشمن ایکٹ علی

گڑھ کے حق سے نافذ کیا جائے اسی طرح یہ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ عام لوگوں کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹا کر صرف اقلیتی یا غیر

اقلیتی گزرا کے سوال پر مبذول رکھی جائے اور جو بھی اس غیر جمہوری ایکٹ کی سچے اور صاف دل سے مخالفت کرے

اسے فرقہ داریت پھیلا نیک الزام لگا کر بند کر دیا جائے۔ علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ جن سنگھ کے ان لوگوں کے

لئے بھی ایک دار تک ہے جو فرقہ دارانہ جذبات بھڑکا کر فضا کو زہر ملا بنا رہے ہیں۔ بہت جلد بنڈس یونیورسٹی کے بارہیں

بھی ایسا ہی ایکٹ پیش کیا جائے والا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی

مخالفت کریں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حامیوں کا ساتھ دیں۔ (شاہد صدیقی)



عید گڑہ مسلم یونیورسٹی

ایک لکھ ۱۹۷۳ء

اچھا یا برا؟

ہم نے ملک کے مختلف لیڈروں اور متضاد مکتبہ سیاست کے سربراہوں سے جن میں مسلمانوں کی تنظیمیں، مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور جمعیتہ العلماء ہند بھی شامل ہیں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے سلسلہ میں آثار طلب کی تھیں، ہم نے ان سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مخالفت یا حمایت میں رائے دیتے ہوئے ان کی وجوہات بھی واضح کریں۔ جن حضرات کے جواب ہمیں ملے ہیں وہ ذیل میں لفظ بہ لفظ پیش کئے جا رہے ہیں۔

# ڈاکٹر عبید اللہ جلیل فریدی

## ایم۔ ڈی۔ صدر مسلم مجلس یوپی

کونسل کے لیے ۷۲ فی صد اور ایگزیکٹو کونسل میں تو ۷۵ فی صد سے زائد ہوں گے۔

(۲) صدر جمہوریہ ہند سے پیشگی منظوری لینے کے بعد دستور بنانے کا حق ایگزیکٹو کونسل کو دے دیا گیا ہے (دفعہ ۲۴ کی رو سے)

(۳) ہر مل شعبہ کا مقتدر اعلیٰ اور تمام محکموں کے سربراہ کاروں کا تقرر و انس چانسلر کریں گے۔ (دفعہ ۷-۸ کی رو سے)

(۴) ایگزیکٹو کونسل کی سفارش پر جس میں وزارت تعلیم کے نامزد کردہ ممبران کی اکثریت ہوگی، وزیر یعنی صدر جمہوریہ ہند چانسلر و انس چانسلر کا تقرر کریں گے۔

(۵) دستور کی دفعہ ۲۰ (۲) کی رو سے یونیورسٹی کے کسی بھی ملازم کو اس بنیاد پر کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے، اخراج کیا جاسکتا ہے۔

(۶) ایکٹ کی دفعہ ۲۰ کی رو سے عدلیہ کو مداخلت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی وجہ سے جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے بڑی عجلت سے پاس کروا دیا گیا، بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ میں ذیل کے کالوں میں چند کے متعلق اظہار خیال کروں گا۔

### (الف) یونیورسٹی کی خود مختاری

جمہوری ممالک کے تمام ماہرین تعلیم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اعلیٰ علمی اور تحقیقاتی اداروں کو حکومت کی مداخلت اور دفتری پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے ذریعہ اس یونیورسٹی کی خود مختاری کو تباہ کر دیا گیا ہے مثلاً:-

(۱) صدر جمہوریہ ہند یا مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے بالواسطہ طور پر یا بلاواسطہ طور پر یونیورسٹی کورٹ کے لیے نامزد کردہ اشخاص کم و بیش ۷۰ فی صد ہوں گے اگرچہ





## کوئی توجہ ہی نہ کر سکا

شیخ محمد عبداللہ نے اپنے ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کے خط میں لکھا ہے۔

”مجھے افسوس ہے کہ خود اپنے مسائل کے سلسلے میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں حال ہی میں بنائے گئے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ سے پیدا ہونے والے تنازعہ پر کوئی توجہ نہ دے سکا اس لئے میں سوالات نامہ پر اپنی جمعی بوجہی ماسے دینے کا اہل نہیں ہوں“

شیخ محمد عبداللہ

۱۰۔ مولانا آزاد روڈ، مرینر

ہوں گے جس کے تمام حقوق کو چھین کر محض ایک مشورتی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسٹوڈنٹس کونسل سفارشیں کرے گی اور نفاق کے بیج بوئے گی جس سے طلباء میں خوشامدی اور تعلق پسند پیدا ہوں گے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اسکیم کے بروئے عمل آنے

اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۳

کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

(۷) اعزازی خازن کا منتخب جہد ختم کر کے اس کی جگہ ایک افسر حسابات رکھا گیا ہے جس کا تقرر وائس چانسلر کریں گے۔

(۸) یونیورسٹی کورٹ اعلیٰ ترین اقتدار کا محل ادارہ تھا۔ اس کے تمام حقوق کو سلب کر کے محض ایک بجٹ و سباحت کا یا مشورتی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وائس چانسلر صاحب اپنی لیگزلیٹیو کونسل کی معرفت براہ راست صدر جمہوریہ ہند یعنی وزارت تعلیم کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خود مختار کردار کو ختم کر دیا گیا۔

(ب) طلباء کی جدوجہد

موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ طلباء کی ایک نئی تنظیم ”اسٹوڈنٹس کونسل“ کے نام سے قائم کرتا ہے۔ یہ درہافت وائس چانسلر صاحب کی ہے۔ یونیورسٹی یونین جواب بھی موجود ہے، کے صرف تین ممبر اس کونسل میں لیے جائیں گے جس کے چیرمین ایک استاد ہوں گے اور جن کو وائس چانسلر صاحب نامزد کریں گے۔ (دفعہ ۲۴) مزید پانچ طلباء کو بھی وائس چانسلر صاحب ہی نامزد کریں گے۔ کونسل کے دیگر ممبران بھی بالواسطہ وائس چانسلر صاحب ہی کے حامی ہوں گے ورنہ ان کے لیے کونسل کارکن بننا مشکل ہوگا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایکٹ میں طلباء کی ایک ہی قسم کی دو تنظیموں کی گنجائش کیوں رکھی گئی ہے۔ ”اسٹوڈنٹس یونین“ کے منتخب کردہ نمائندے ہمیشہ اقلیت میں ہوں گے۔ ایکٹک کونسل اور لیگزلیٹیو کونسل میں طلباء کا کوئی نمائندہ نہیں ہوگا۔ صرف یونیورسٹی کورٹ میں طلباء کے نمائندے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

## ایڈیٹر پرنسپل کے نریشہ کی رائے

میرا خیال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے غلافنا جو ایجنٹیشن چلایا جا رہا ہے وہ خود ایکٹ میں درج باتوں کے خلاف کسی اضطراب سے زیادہ ذہنی باؤسی کا اظہار ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ کسی شخص کو بھی ایسی کوئی بات کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جسے وہ کسی بھی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ یہ ناقابل برداشت صورت حال ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی اب اقلیتی ادارہ نہیں ہے۔ سپریم کورٹ بھی یہی فیصلہ دے چکی ہے۔ مسلمانوں کا جو طبقہ آج اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بھی بدل سکتا ہے۔ موجودہ ایکٹ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات میں مداخلت نہیں کرتا۔ ایکٹ کے ذریعہ صرف کچھ انتظامی تبدیلی کی گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا جو طبقہ اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ اپنے عمل سے پروفیسر بلراج بدھوکالی اس مقبوری کی تصدیق کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ صرف نام کے ہندوستانی ہیں۔ ان کا سارا رخ، نظریہ اور اقدار فرقہ وارانہ ہیں۔ وہ اس بنیادی اور ابتدائی حقیقت کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں کہ کوئی بھی مذہبی اقلیت نہیں ہوتی جب تک مسلمانوں کا یہ طبقہ یہ سمجھتا رہے گا کہ وہ پہلے مسلمان پھر ہندوستانی ہیں اس وقت تک ملکاؤ ناگزیر رہے گا۔

کے۔ فریندر ۷ جولائی ۱۹۷۲ء

(پرتاب بھون بیہاد شاہ ظفر مارگ نئی دہلی)

سے طلباء کی شخصیت اور کردار کے آزادانہ ارتقاء میں کامیاب پیدا ہوں گی۔

(ج) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی اور تاریخی کردار دستور ہند میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو قومی اہمیت رکھنے والا ادارہ کہا گیا ہے۔ آخرا اس کی کیا وجہ ہے؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی اور تاریخی کردار کے کیا معنی ہیں؟ حکومت ہند نے ۱۹۶۱ء میں چیرمین کی حیثیت سے پروفیسر جی۔ سی۔ چٹرجی کے ماتحت ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی۔ بجائے اس کے کہ ان معلومات کی میں اپنے طور پر تعریف کروں میں ان کی رپورٹ سے حوالے دوں گا جس کی حکومت ہند نے منظور کر لیا ہے۔ اس رپورٹ کے صفحہ ۱۲ پیرا گراف ۲ میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی کا مقصد جہاں طلباء کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنا تھا وہاں مسلمانوں کے بہترین تصورات اور ثقافت کا تحفظ بھی تھا۔ آگے چل کر صفحہ ۱۲ پر پروفیسر چٹرجی فرماتے ہیں کہ دراصل یہ وہ زندہ روایت ہے یہ وہ زبردست مقصدی قوت (یعنی اسلام) ہے جسے میں محفوظ رکھنا چاہیے اور جس سے میں اس یونیورسٹی کے تعلق سے بھی گہری محبت ہونا چاہیے۔

دستور ہند کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ میں اقلیتوں کو خصوصی تحفظات دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے کانگریس مینوفیسٹو کے پیرا گراف نمبر ۵۴ اور ۵۵ میں کہا گیا ہے کہ کانگریس جدوجہد کرے گی کہ اقلیتوں کو تعلیمی اور دیگر ادارے قائم کرنے، ان کا انتظام کرنے اور چلانے کی پوری آزادی ملے۔ مزید وہ کوشش کرے گی کہ اقلیتوں کے قائم کردہ اداروں کے جمہوری طریقہ کار اور خود مختار طریقہ کار کی حفاظت ہوتی رہے۔ یہ دونوں پیرا گراف ۱۹۷۱ء میں کانگریس مینوفیسٹو میں پہلی بار شامل کیے گئے تھے ظاہر ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اشارہ



تسلیم یونیورسٹی ایکٹ پڑھا، کا خاص نمبر واپسی  
قابل دید ہو گا۔ میں پیشگی اس کا خیر مقدم کرتا ہوں مگر  
میری صحت اس وجہ گری ہوئی ہے کہ آپ شاید تصور  
ہی نہیں کر سکتے۔ بے چینی اور گھبراہٹ سے زندگی تلخ  
ہے۔ ————— بھرپور بڑا ہی کرم ہو گا اگر آپ میری معذرت  
قبول فرمائیں تو۔ ہما کا خاص نمبر مطالعہ کرنے کے لئے  
بے چین رہوں گا۔“

سیکشن ۴۴ اور بعد کے قوانین کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا مقام ایک اقلیتی ادارے کی حیثیت سے قائم رکھتی ہے انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کی تجویز کے مطابق یہ دفعہ مجوزہ دستور میں قائم رکھی جائے گی۔

مسٹر فخر الدین علی احمد نے بیگ کیٹیج کی سفارشات کو قبول کیا ہے اور اس کا بے شمار موقعوں پر اظہار بھی کیا

اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۹

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف ہے۔ میوزیمز کی ان تین دہائیوں اور دستور ہند کی ان دفعات کا بظاہر ہی مفہوم ہے کہ انتظامیہ یعنی یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل اور ایڈمک کونسل کے علاوہ اساتذہ اور طلباء کی اکثریت بھی مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے اقلیتی اور تاریخی کردار بحال نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف اگر آپ ایکٹ پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ سابق طلباء، آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس اور مسلم تہذیب اور علم و فضل کے نمائندوں کو کورٹ کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ گزشتہ تین چوتھائی صدی سے کورٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

یقین دہانیاں

سابق طلباء کی کونسل کے سکریٹری کو وزیر اعظم  
آنجنابی لال بہادر شاستری صاحب نے بہت عرصہ  
پہلے یعنی یکم ستمبر ۱۹۶۵ء میں تحریری طور پر تعین دلایا تھا  
کہ آنے والے بل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کردار اسی  
طرح قائم رکھا جائے گا۔ علاوہ ازیں وزیر اعظم کی ہدایت  
پر جناب فخر الدین علی احمد نے بیگ کمیٹی کا تقرر کیا جس کا  
مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تجویز کردہ ترمیمی بل کے  
سلسلہ میں متعدد موصولہ مشوروں کا جائزہ لینا اور مناسب  
ترمیمیں تجویز کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے سفارش  
کی (دفعہ ۱۲) کہ چاہے کوئی عدالتی فیصلہ یا ٹریبونل کا حکم  
اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو نہ ہی سمجھا جائے گا کہ علی گڑھ  
مسلم یونیورسٹی کو مسلم اقلیت نے اپنی پسند کے تعلیمی ادارہ  
کی حیثیت سے قائم کیا لہذا اس کا نظم و نسق دستور ہند  
کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے مطابق ہوگا۔ اسی کمیٹی کے ایک  
ممبر مسر مسید علی ظہیر نے اپنی رائے کا اظہار مذکورہ بالا  
نظریے کی تائید میں اس طرح کیا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ

علیگڑہ مسلم یونیورسٹی نمبر



## میر صدق جید کی رائے

مسلم یونیورسٹی ایکٹ پر آؤتاب صیافت مولانا عبدالمجید دریابادی ایڈیٹر صدق جید نے ہملکے ایک سوالنامہ کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

(۱) یونیورسٹی اس ایکٹ کے بعد مسلمانوں کی توہر حال (۲) ان سبوروں یونیورسٹی ہو گئی (۲) پرامن ایجنٹیشن کو نافذ می ہے۔ (۳) چانسلر، وائس چانسلر، ارکان کونسل سب کو مسلمان رہنا لازمی تھا (جیسا کہ سلسلہ کے ایکٹ میں) اس میں خلل ۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے ڈالا اور اس کی تکمیل تازہ ایکٹ نے کر دی (۴) محض مسلمان طلبہ کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ اب کوئی ذمہ داری اس کی نہ رہی نہ تعلیم مسلمانوں کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ (۵) تجویز تھی کہ سلسلہ والا ایکٹ بحال کیا جائے۔ (۶) یہی یونیورسٹی اندر مسلم یونیورسٹی بن سکتی ہے۔ اگر وہی قدیم ایکٹ بحال کر دیا جائے۔ عبدالمجید قصبہ ڈاکخانہ دریاباد۔ ضلع بارہ بنگی۔ (یو۔ پی)

ہے (۱۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء، ستمبر ۱۹۷۱ء) انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ آنے والے بل میں ان سفارشات کو شامل کیا جائے گا۔ اس لیے یہ جان کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے سات سال کے طویل عرصے میں پہلی بار دہلی میں یہ کیسے فرمایا کہ یہ مطالبہ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ ہے بنیادی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے اور ایک لادینی جمہوریت کے منافی ہے؟

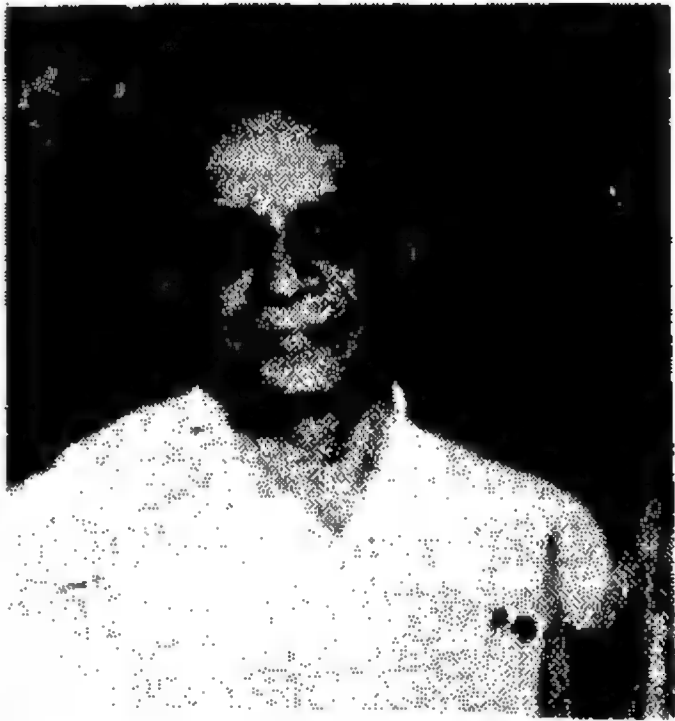
بگ کیٹی کی رپورٹ کو یو پی کے مسلم ممبران اسمبلی نے بھی منظور کیا تھا جن میں سے ۲۴ ممبران نے ۱۷ اکتوبر

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو

۱۹۷۱ء کو مسز اندیا گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ جو بل پیش کیا جائے گا وہ بگ کیٹی کی سفارشات کی روشنی میں بنایا جائے گا۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مذکورہ بالا خط کے چند دستخط کنندگان ہی آج اس ایکٹ کی حمایت کر رہے ہیں جس میں بگ کیٹی کی سفارشات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خود وزیر اعظم شریعتی اندیا گاندھی نے بھی ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو سابق طلباء سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان کریں گی جو چرچائی کیٹی کی سفارشات پر مبنی ہوگی۔ یہ اطلاع ہمیں فخر الدین علی احمد صاحب کے توسط سے ملی تھی۔ اس کے علاوہ لوگ سبھا کے گزشتہ الیکشن سے کچھ ہی دنوں پہلے یعنی ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھا جائے گا (دستور ہند دفعہ ۲۹-۳۰) یہ امر باعث دل چسپی ہو گا کہ کانگریس مینوفسٹو کے پیرا گراف ۵۴، ۵۵ کے کچھ حصے میں نے خود ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو شری آج۔ این۔ بیوٹن کو لکھا ہے تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے اور یہ کام شریعتی اندیا گاندھی کی قیام گاہ پر ان سے گفتگو کے بعد کیا گیا تھا۔ مسٹر یو۔ ایس ڈکشت بھی اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے اس سے قبل یعنی ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء کو مسٹر ڈی۔ پی۔ میشر نے بھی مذکورہ پالیسی سے اصول طور پر متفق ہونے کا اظہار کیا تھا۔

یہ معلوم کہ تکلیف ہوتی ہے کہ وزیر تعلیم مسٹر نور الحسن صاحب نے جو بیانات دیئے ہیں اور جو خط طلباء کے والدین وغیرہ کو بھیجے ہیں ان میں اب بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ایکٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



## ہندو مسلم نام بدل

سوشلسٹ لیڈ سٹرائین۔ جی۔ گورے ایم۔ پی  
نے لکھا ہے کہ:-

آپ کے مکتوب مورخہ ۲۷ کا شکریہ میرے پاس  
اتنا فاضل وقت نہیں کہ آپ کے تمام سوالوں کا  
جواب دوں لیکن میں مختصراً اپنے موقع کی وضاحت  
کرنا چاہوں گا میں خواہتے ہوں کہ تمام اسکولوں  
ہسپتالوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ کو توڑ دینے کے حق  
میں ہوں۔ ان اداوں کو باقی رکھتے ہوئے مکمل قومی  
یکجہتی کی امید کرنا فضول ہے۔ پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور  
کیا گیا اعلیٰ گروہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ محض ایک مفاہمت  
ہے۔ یہ نہ تو سکر خیال کے لوگوں کو مطمئن کرے گا نہ ہی  
مسلمانوں اور ہندوؤں کو بلکہ جب تک حکومت علی گڑھ  
اور بنارس کی یونیورسٹیوں سے مسلم اور ہندو کے نام نہ  
خارج کرے گی اس وقت تک وہ خوشامد کی پالیسی  
پر چلتی رہے گی۔ — این جی گورے (ایم پی)  
(سدا شیو پیٹھ — پونہ ۳۰)

کے تاریخی کردار کو مکمل طور پر برقرار رکھا گیا ہے تعجب ہے  
کہ یوپی کانگریس کمیٹی کی صدر ڈاکٹر راجندر کمار باجپائی  
بھی وہی ناگ الہی ہیں کہ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء دستور ہند  
کی دفعہ ۳۰ کے عین مطابق ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ  
کوئی نا انصافی نہیں کی گئی ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ مسٹر  
فخر الدین علی احمد، مسٹر نور الحسن اور ڈاکٹر راجندر کمار  
باجپائی مندرجہ بالا اعلانات کی روشنی میں کس طرح ایک  
دوسرے کے خلاف بیانات دے رہے ہیں۔

## (۵) مالی امداد اور اقلیتی حقوق

اس دلیل کو کہ چونکہ حکومت ہند علی گڑھ مسلم  
یونیورسٹی کو کافی مالی امداد دیتی ہے اس لیے انتظامیہ پر  
اس کو اختیار ہونا چاہیے چٹرجی کمیٹی نے غلط ٹھہرایا ہے  
چنانچہ پیرا گراف ۳ کے صفحہ ۱۱۳ پر وہ تحریر کرتے ہیں کہ  
"جہاں تک اعلیٰ گروہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی ادارہ ہونے  
کا تعلق ہے اگر ۱۹۵۱ء کا ترمیمی ایکٹ اس کے اس  
خصوصی کردار میں تبدیلی نہیں کر سکا تو حکومت کی طرف  
سے دی جانے والی مالی امداد کی بڑھتی ہوئی رقم بھی کم نہیں  
کیا جاسکتی۔ ملک کی سب سے بڑی عدلیہ سپریم کورٹ نے گیرا  
ایجوکیشن بل پر ملے زنی کرتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں  
کہا ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۲۷ (۱) کے ماتحت حکومت  
مالی امداد دینے کی بنیاد پر کسی اقلیت کو اس کے حقوق  
چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

پریس میں دہلی کے ایک سینار منعقدہ ۵ جولائی  
کی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا اختتام اس پر ہوا کہ  
ایک لادینی جمہوری نظام میں اس مطالبہ کو کہ اعلیٰ گروہ  
مسلم یونیورسٹی اقلیتی کردار کی حامل ایک یونیورسٹی ہے  
تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایسی حالت میں دستور  
ہند کی دفعہ (۲۹-۳۰) چٹرجی کمیٹی کی رپورٹ اور بیگ کمیٹی

خوابی صحت کی وجہ سے بچو ہوا

حضرت مولانا ابوالحسن علی اہلبسنی الہندی (علی  
میاں) سوالنامہ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :-

”افسوس کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل سے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے معذور ہوں۔ عرصہ سے علیل ہوں لہذا لکھنے پڑھنے کا کام بھی بہت کم کر رہا ہوں۔“

ابو الحسن علی ندوی

داما العلوم ندوة العلماء لکھنؤ

میری رائے میں یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کی غرض سے سابق طلباء اور دیگر تمام ہمدردان بلا تفریق مذہب و ملت حق بجانب ہوں گے کہ وہ اس تباہ کن ایکٹ کے خلاف اس وقت تک جدوجہد کریں جب تک کہ حکومت اسے واپس نہ لے لے۔

(۱) اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کے کم و بیش آٹھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو تنہا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پورا نہیں کر سکتی لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیے کہ اس بنا پر اس کے تاریخی اور اقلیتی کردار ہی کو ختم کر دیا جائے۔ ہمارے پاس ملک میں کم از کم ایک یونیورسٹی تو ہوگی جہاں اسلامی تہذیب و اقدار کے جدید نمونے دیکھے جاسکیں گے اور جس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ سے ہم اپنے تعلقات استوار کر سکیں گے ہماری ذرا سی جدوجہد سے یہ تعلیمی ادارہ عالم اسلام کے لیے خصوصاً اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے عموماً ایک علمی مرکز بن سکتا ہے۔

حکومت کا نقطہ نظر خواہ کچھ بھی ہو اور ایکٹ کے علمبردار خواہ کچھ بھی کہیں مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل ۱۹۷۲ء کے ذریعہ یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کردار کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ مشرقی اور اسلامی تختیاں کو آگے بڑھانے کے لیے کسی محکمہ کا قیام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ نہیں بناتا۔ اس قسم کے ادارے بہت بڑے پیمانے پر بیرونی یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ یہ ایکٹ پیچھے کی طرف ایک قدم ہے۔ اس نے یونیورسٹی کی خود مختاری کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہ طلباء کے لیے نقصان دہ ہے ساتھ ہی ساتھ تمام جمہوری قدروں کے منافی ہے اس ایکٹ کی موجودگی میں اقلیتی کردار کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کی سفارشات کو سب سے پہلے دریا برد کر دینا چاہیے  
اور اگر یہی طریقہ کار کانگریس کی پالیسی سے مطابقت  
رکھتا ہے تو اس کانگریس راج میں اسی قسم کے ایکٹ  
کا نفاذ تمام ماتحت ریاستوں میں ہونا چاہیے اور یہ صرف  
یونیورسٹیوں ہی میں نہیں بلکہ تمام تعلیمی اداروں میں ہونا  
چاہیے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تنہا علی گڑھ مسلم  
یونیورسٹی کو اس مقصد کے لیے کیوں چنا گیا۔

(۵) جہاں تک کسی قسم کے احتجاج کا تعلق ہے

کوئی رائے دینا مناسب نہیں

دہلی کے میر جناب کیدار ناتھ ساہنی نے اپنے ۱۱ جولائی کے خط میں لکھا ہے کہ :-

”آپ کا، جولائی ۱۹۷۷ء کا پتر مجھے ملا ہے۔  
دھنیہ وار۔ اس سمندر میں میں مہاپور ہونے کے کار  
کوئی رائے دینا بھی مناسب نہیں سمجھوں گا۔ کہ یہاں مجھے  
کشا کریں۔ لیدار ناتھ ساہنی





سابقہ وائس چانسلر  
مسلم یونیورسٹی

۱۹۲۶ء کے ایکٹ کے شروع ہی میں درج ہے کہ  
 ”ہر گاہ کہ یہ قرین معلومت ہے کہ علی گڑھ میں ایک تدریسی  
 امداد قومی، مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے.....“  
 یونیورسٹی کے کردار کے متعلق اس کے سوا کوئی بات  
 بالخصوص ایکٹ میں نہیں کہی گئی۔

مولانا شبلی نے ایک موقع پر فرمایا تھا :

”ہمیں دو حیرت ازنیوی درستی مدعا باشد

کہ اس سرشتہٗ تعلیم مادرِ دستا باشد“

اس اصول کی روشنی میں جانچا جائے تو مسئلہ کے ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی کا تسلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہونا صرف اس طرح سمجھا جاسکتا مسلم یونیورسٹی میں اقتدار اعلیٰ کورٹ کو سونپا گیا تھا اور اس کے ممبر صرف مسلمان ہو سکتے تھے اور کورٹ اپنی پسند کا دانش چانسلر منتخب کرتا تھا۔ اسلامی کردار کی دوسری بات یہ تھی کہ ہر مسلم طالب علم کے لیے دینیات کا پڑھنا لازم رکھا گیا تھا۔ اسامذہ اور مسلم طلباء میں مسلمانوں کی ایشیٹ کے متعلق اس ایکٹ میں کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، یونیورسٹی کو جو اختیارات دیئے گئے تھے ان میں یہ اختیار بھی شامل تھا کہ وہ مشرقی اور اسلامی تعلیمات کو ترقی دے اور مذہب اسلام کی تعلیم اور اخلاقی د

ملیگزومسلم یونیورسٹی خیر

جسمانی تربیت کا انتظام کرے۔  
۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے جب کہ بولانا ابوالکلام  
وزیر تعلیمات تھے سلسلہ کے ایکٹ میں دوام تربیتیں  
کیں۔

(۱۱) کورٹ کی ممبری، مسلمانوں کے لیے مخصوص

نہیں رہی

(۲) ریاضیات کی تعلیم مسلمان طلباء کے لیے لازم

نہیں ہی۔

کوریٹ کی ممبری کو عام کر دینے اور وائس چانسلر کے انتخاب کا طریقہ بدل دینے سے اگر علما نہیں تو قانوناً یونیورسٹی کا نظم صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا ختم ہو گیا لیکن اس کا اقامتی اور مخصوص کردار باقی رہا اور مسلم تہذیب اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ ان میں نمایاں اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۵۱ء کے اس ریزولوشن ایکٹ کے خلاف مسلمانوں نے کوئی خاص احتجاج نہیں کیا۔

۱۹۷۶ء کے ایکٹ میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں  
کی گئی جو اس کے اسلامی کردار پر اثر انداز ہوئی ہو۔

آج بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک مخصوص کردار ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات اور دینیات کی اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم کا انتظام ہے۔ ملک بھر میں یہی ایک واحد یونیورسٹی ہے جہاں طلباء دینیات میں ماسٹر اور ڈاکٹر کی سند حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ہندوستان کے سیکولر آئین کے ماتحت کسی ادارے میں مذہبی تعلیم کے خرچ کا کوئی حصہ گورنمنٹ برداشت نہیں کرتی لیکن علی گڑھ میں دینیات کے شعبہ کا تمام خرچ سرکاری گرانٹ سے پورا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی مساجد کی دیکھ بھال، پیش اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں، یونیورسٹی کے قبرستان کا انتظام سب گورنمنٹ گرانٹ سے ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی مختلف اقامت گاہوں میں مسلمان طلباء کے لیے ہر قسم کی ضروری سہولتیں آج پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لہذا یونیورسٹی کا تاریخی کردار آج بھی بدستور قائم ہے بلکہ پچھلے بیس سال سے اس کو تقویت پہنچی ہے، البتہ یونیورسٹی کی فلاح و ترقی کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی نہیں ہے، بلکہ سارا ملک اور ساری ہندوستانی قوم اب اس کی ذمہ دار ہے۔ بہت اچھا ہو اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی علیحدہ پسندی کی روایت کو ختم کر دیں۔

اس ایکٹ کے خلاف ایچی ٹیشنوں کی تہہ میں سیاسی مصالح کا فرما ہیں "وہ بات سلاے فسانے میں جس کا ذکر نہیں" وہ کچھ حضرات کو بہت ناگوار گزری ہے۔ افسوسناک کی بات ہے کہ ایک عظیم دانش گاہ سے متعلق مسئلہ کو بازار میں لے جایا گیا اور ایچی ٹیشن سے زیادہ تر نقصان اٹھایا

ایک زمانے میں جب ہندوستان میں گنجی بونی ورسیاں تھیں اور اچھے کالج بھی بہت کم تھے علی گڑھ کو

۲۴۴ اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۶ء

ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کھاتے پیے مسلم گھرانوں کے رطے بالعموم علی گڑھ ہی آتے تھے۔ اب یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ جگہ جگہ یونیورسٹیاں کھل گئی ہیں۔ ہر صوبہ میں کالج موجود ہے۔ پھر سرکاری ملازمتوں کے لیے ہر ریاست کا مطالبہ ہے کہ وہاں کی علاقائی زبان میں تعلیم ہو اور ریاست کی اپنی یونیورسٹیوں سے بیکلے ہوئے نوجوانوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت پست ہو گئی ہے اور کم لوگ ہیں جو مقامی یا قریبی کالجوں کو چھوڑ کر اپنے کچوں کو علی گڑھ بھیجنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اب علی گڑھ میں اکثریت یونی یا یو پی کے قریب کے طلباء کی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا انحصار اب صرف علی گڑھ پر نہیں ہے۔ ہر ریاست، خاص طور پر بھٹی اور جنوب ہند میں مسلمانوں کے اچھے معیاری کالج قائم ہو گئے ہیں۔

نئے ایکٹ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے نتیجے میں تعلیمی اعتبار سے مسلم مفاد کو نقصان پہنچے۔ مسلمان طلباء کے لیے اب بھی جو سہولتیں علی گڑھ میں مل سکتی ہیں دوسری جگہ حاصل نہیں ہو سکتیں۔ نئے ایکٹ کے منظور ہو جانے کی وجہ سے اساتذہ اور طلباء کی تعداد میں نمایاں کے تناسب میں کوئی خاص کمی واقع ہونے کی کوئی خاص

وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یونیورسٹی کے انتظامات میں البتہ اب باہر کے غیر تعلیمی سیاسی عناصر کی مداخلت کا خطرہ محسوس کیا جائے گی جو ان عناصر کو ضرور ناگوار ہوگا

علی گڑھ کے تاریخی کردار اور مرکزی حیثیت کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے کے لیے مسلمانوں کو بے کار ایچی ٹیشن کے بجائے تعمیری قدم اٹھانے ہوں گے۔ ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے کہ تعلیمی اعتبار سے ہونہار اور ممتاز طلباء جن کی اکثریت لازماً غریب ہوگی، ہندوستان

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خیر

حصہ لے سکیں۔ اس سلسلے میں اب سے گیارہ سال پیشتر مرحوم ہزلولی نس ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین صاحب کی دو لاکھ روپے کی فیاضانہ امداد سے مسلم یونیورسٹی کے طلباء کو مالی امداد دینے کے لیے ایک فنڈ شروع کیا گیا تھا جس سے ہر سال مستحق طلباء کو ہزاروں روپے کے وظیفے دیے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ علی گڑھ کے مستقبل کے متعلق پریشان ہیں وہ مذکورہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کرینگے۔

کے ہر سرگوشے سے علی گڑھ آکر کسب فیض کر سکیں گے ایسا تب ہی ممکن ہو سکے گا جب ان کے لیے بڑی تعداد میں معقول رقم کے وظیفے موجود ہوں۔ مسلمان چار کروڑ روپے ہر سال جمع کر کے سرکاری امداد کے بغیر مسلم یونیورسٹی تو نہیں چلا سکتے۔ مگر ایک دفعہ وہ ایک کروڑ کا فنڈ تو جمع کر سکتے ہیں جس کی آمدنی سے ہر سال کئی لاکھ کے وظائف ہو سکتے ہیں اور مستحق طلباء کو دیے جاسکیں تاکہ وہ اپنی مقامی تعلیم گاہوں کی بجائے علی گڑھ میں داخلہ لے کر یہاں کے تاریخی کردار اور اعلیٰ تعلیمی معیار کی تقایس

## ظفر احمد صدیقی ایڈووکیٹ سیٹاپور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش

”اے دوستو! مجھے یہ بات خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔“  
(ماخوذ از لکچروں کا مجموعہ صفحہ ۲۵۹)

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو جب لارڈ لٹن وائسرائے دگورز جنرل ہند نے علی گڑھ آکر کالج کا سنگ بنیاد رکھا اس موقع پر منتظمین کالج کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں سید محمود نے انگریزی میں ایڈریس پیش کیا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

”کالج جس کا سنگ بنیاد آنجناب (Your Excellency) رکھنے جارہے ہیں اس ملک کے دیگر تعلیمی اداروں سے مختلف ہے۔ اس ملک میں پرائیویٹ اور افراد کے قائم کردہ اسکول اور کالج ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کو حکومت نے قائم کیا ہے اور

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کو ایک عام سرکاری یونیورسٹی کے معیار سے پرکھنے کی کوشش بنیادی غلط ہے۔ اس ایکٹ کا جائزہ لینے اور اس سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھیں جو بانیان ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پیش نظر تھے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لہہ صیانت میں تقریر کرتے ہوئے سرسید علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا:

”میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھوں میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔“

(ماخوذ لکچروں کا مجموعہ صفحہ ۱۵۷)  
لکھنؤ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اردو ڈائجسٹ ہماگست ۲۰۵۶ء



## آپ تو جانتے ہی ہیں

ہمارے سوالنامہ کے جواب میں نائب مرکزی وزیر داخلہ جناب ایف ایچ محسن نے لکھا ہے کہ۔  
 ”علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بل کے سلسلہ میں آپ کے مکتوب مورخہ ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کا شکریہ۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حال ہی میں مذکورہ بل پر اخبارات میں میری آراء شائع ہو چکی ہیں۔“  
 ایف۔ ایچ۔ محسن

حکومت ان کا خرچ برداشت کرتی ہے مگر یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا کالج ہے جس کی بنیاد کسی ذات کی فیاضی و محبت یا حکومت کی سرپرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری مسلم قوم کی مشترکہ کوشش اور خواہشات کا نتیجہ ہے۔ اس کے محرکات وہ حالات ہیں جو اس ملک کی تاریخ میں رونما ہوئے۔

(ماخوذ از ایڈریس و اسپیچز متعلق ایم۔ اے۔ او۔ کالج۔ مرتبہ محسن الملک)

یہ بات مسلم ہے کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج نے ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سوسائٹیز جبریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ تھا۔ سوسائٹی کی دفعہ ۲ اس کالج کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

(اردو ترجمہ)

”کالج کے قیام کا مقصد دراصل مسلمانوں کی تعلیم تھی۔ ہندو اور دیگر لوگ اس کے ضابطوں کے تحت استفادہ حاصل کر سکتے تھے۔ سوسائٹی کی دفعہ ۱۲۹

۲۴۶ اردو ڈائجسٹ ہمارا اگست ۷۲ء

صوبہ ذیل تھی:

(اردو ترجمہ)

”گورنمنٹ اور ڈائریکٹر پبلک انشٹرکشن کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ کالج کے اندرونی تعلیمی انتظامات بلڈنگ ہاؤسوں کے انتظامات، کالج کے اساتذہ کی تقرری، ہفتگی اور مذہبی تعلیم کے سلسلے میں مداخلت کرے۔“  
 آنریریل مرکزی ممبر تعلیم نے مسلم یونیورسٹی بل پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”اس بل کو پیش کر کے ہم ایک تعلیمی اقامتی یونیورسٹی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جدید طرز کی یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے نعمت ثابت ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود مسلمانوں کے لیے ترقی کی تاریخ میں اہم پارٹ ادا کرے گا۔ مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالمگیر علم کے لیے کھلے ہوں مسلم قوم کی ترقی کی ضامن ہوگی۔“

چیمبرجی انکوائری کمیٹی ۱۹۶۱ء نے (جو مرکزی وزارت تعلیم کے ایسا اور مشورے سے بنائی گئی تھی) اپنی رپورٹ کے صفحہ ۱۲ میں پیرا گراف ۱۱ میں یونیورسٹی کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل دیے ہیں:

(اردو ترجمہ) پیرا گراف (۱۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی بنیاد علی گڑھ تحریک ہے جسے سر سید احمد خاں نے گزشتہ صدی کے آخری نصف حصے میں شروع کیا تھا۔ سر سید کی کوششوں کی بدولت ایم۔ اے۔ او۔ کالج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا کالج ترقی کرتا رہا، تعداد اور شہرت بڑھتی رہی۔ آخر کار ترقی کر کے اس نے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا مقام حاصل

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

کریا

(پیراگراف ۱۲)

یونیورسٹی کے سامنے مقصد یہ تھا کہ طلباء کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تہذیب اور خیالات کا تحفظ کیا جاسکے۔

غرضیکہ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مسلمان طلباء کو صرف اعلیٰ تعلیم دلانا مقصود نہیں تھا بلکہ تعلیم ایسے ماحول میں دلانا مقصود تھا جس میں مسلمانوں کی تہذیب و خیالات کا تحفظ ہو سکے۔ اس کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق کا ماحول ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جن کے دلوں میں اسلامی معاشرہ کی عظمت ہو۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بموجب یونیورسٹی کورٹ میں جو اقتدار اعلیٰ کی مالک تھی صرف مسلمان ممبر ہو سکتے تھے۔ اور ۱۹۵۱ء تک ملازمین یونیورسٹی سے تقرری کے وقت ایک عہد نامہ بھروایا جاتا تھا جس کی رو سے انھیں پابند کیا جاتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔ تمام مسلم طلباء کے لیے مذہبی تعلیم لازمی تھی۔ طلباء اور اساتذہ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ چانسلر وائس چانسلر کی کا انتخاب کورٹ اپنے میں سے کرتی تھی اس کے لیے مسلمان ہونا شرط تھا۔ یہ تھا مسلم یونیورسٹی کا اصل کردار۔ اسے چاہیے اقلیتی کردار کیسے یا تاریخی کردار کیسے۔ ۱۹۵۱ء میں ایکٹ کی دفعہ ۲۳ میں جزوی ترمیم کر دی گئی یعنی شرط ہٹا دی گئی کہ صرف مسلمان کورٹ کے ممبر ہو سکتے ہیں مگر یونیورسٹی کورٹ بدستور Supreme Governing Body رہی۔ اس کی تشکیل میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ یونیورسٹی اتھارٹیز مسلمان ہی رہیں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

## اے آئی گوبال سن۔ ایم پی

مارکسی کمیونسٹ پارٹی  
کامریڈ گوبال سن کی عدم موجودگی میں ان کے سکریٹری  
نے لکھا ہے کہ۔

شری گوبال سن آج کل کیرالا میں ہیں اور وہ کسان  
تحریک میں بہت مصروف ہیں۔ ۲۰ جولائی کو ان کے  
دہلی واپس آنے کی توقع ہے جیسے ہی وہ آئے آپ کا  
خط ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

اس بنا پر باوجود جزوی ترمیم کے علامہ یونیورسٹی ان مقاصد کی تکمیل کرتی رہی جو اس کے بانیان کے پیش نظر تھے ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے ذریعہ یونیورسٹی کورٹ کے اختیارات ختم کر دیے گئے ہیں اس لیے جان صلاح کار کی حیثیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس کے فیصلوں کی پابندی یونیورسٹی اتھارٹیز پر لازم نہیں اس کی تشکیل میں طبقاتی نمائندگی دی گئی ہے۔ مسلم فرقہ کو بحیثیت فرقہ کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ برخلاف اس کے ٹریڈ یونینز ایگریکلچرلسٹ اور تاجروں وغیرہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ اس سے حکومت کی منشا صاف ظاہر ہے۔

دستور ہند کی آرٹیکل ۱۲۰ (۱) میں دیے ہوئے حقوق کا لحاظ تو درکنار یہ کوشش کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل یا اکیڈمک کونسل وغیرہ کی تشکیل میں یونیورسٹی کی علامتی مسلم حیثیت بھی باقی رہے۔ یونیورسٹی کے ماحول کا دار و مدار منتظلمین کے طرز فکر پر ہوتا ہے۔ ترمیمی ایکٹ میں اس کی بالکل فکر نہیں کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کا اسلامی ماحول برقرار رکھنے کے لیے

اردو ٹائٹل: جماعت ۱۲، ۱۹۷۷ء

منتظین ایسے ہوں جن کے دلوں میں اسلامی معاشرہ کا احترام ہو۔ یونیورسٹی ایکٹ کی دفعہ ۸ میں طلباء کے داخلے اور اساتذہ کی تقرری کے لیے آزاد مقابلہ *Free Competition* کا دروازہ کھلا ہوا ہے صرف اتنا ہی نہیں یونیورسٹی پر یہ پابندی بھی علیحدہ کر دی گئی ہے کہ وہ آفیسر کی تقرری میں مذہب، ذات یا نسل وغیرہ کی پابندی نہ لگائیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چانسلر، وائس چانسلر اور دیگر عہدیداران سب غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ عہدیداران یعنی چانسلر و وائس چانسلر کی تقرری ڈیڑھ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ آزاد مقابلہ کے نتیجے میں جب کہ یونیورسٹی کے آفیسر بھی ہمدردانہ جذبہ رکھتے ہوں، یونیورسٹی میں مسلم طلباء اور اساتذہ کے تناسب کا وہی حشر ہوگا جو پورے ملک کے تعلیمی اداروں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہے۔ مثلاً یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے کیا اس کے بعد بھی علی گڑھ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اس سلسلے کا جواب سے اہم نکتہ ہے اس کو سرکاری طبقے علویاً فراہم کر دینے میں جیسا کہ سرسید کے قول سے ظاہر ہے اس درس گاہ کے قیام کا مقصد محض ڈگریاں دلوانا نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کی مخصوص تہذیب اور اسلامی قدروں کا تحفظ بھی تھا۔ آرٹیکل ۳۰ (۱) میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا جو حق دیا گیا ہے اس سے بھی اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کا تحفظ مقصود ہے۔ اگر یہ مقصد فوت ہو جائے تو پھر یہ درس گاہ علمی ایسے جسم کے مانند ہو جائے گی جس کی روح سلب کر لی گئی ہو۔ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ کے ذریعے بھی منصوبہ بنایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی روح کو برقرار رکھنے کے لیے محض دینیات و اسلامی تعلیمات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



## گجند گڈکر سابق چیف جسٹس

۱۹۶۸ء میں جب جناب گجند گڈکر کانڈکشن میں تشریف لائے تو آپ نے یہاں کے طلباء کا نظم و ضبط دیکھتے ہرے کہا۔

”میں نے تقریباً پندرہ کانڈکشن میں شرکت کی لیکن میں نے آج تک کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ یہاں کی طرح طلباء اتنی دیر تک جبر و سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ خاموشی سے شریک رہے ہوں۔“

آپ نے مزید کہا کہ جبکہ دوسری یونیورسٹیوں میں تعلیم معطل تھی مسلم یونیورسٹی میں شمع علم بدستور روشن تھی۔ سابق چیف جسٹس نے مزید کہا: یونیورسٹیوں کی خود مختاری کا اصول بہتر ہے بشرطیکہ اس کا استحقاق ہو اور اگر کوئی یونیورسٹی خود مختاری کی مستحق ہے تو مسلم یونیورسٹی ہے۔“





## یونیورسٹی کا اقلیتی کردار باقی رکھا جائے

مسٹر یونس سلیم نے انتخاب میں اپنی ۱۶ مئی کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک ایڈیو کے دوران کہا۔

”میں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کا حامی ہوں اور اس کے لئے میں نے پوری جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ نام نہاد فرقہ وارانہ فساد جو علیگڑھ میں کرایا گیا، جس کو میں دماغی سیاسی و فکری فساد ہوں، اس کے پیچھے دماغی ہی روح کا فرما تھی کہ ان کو میری کامیابی میں مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے خطرات نظر آئے اور وہی لوگ فسادات میں پیش پیش رہے جو ایکشن سے چند ماہ قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے خلاف علی گڑھ میں تحریک چلا چکے تھے۔“

اور طلباء کے جمہوری حقوق کا فائدہ وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ ان موضوعات پر تفصیل

اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۰۹ء

دفعہ کے شعبوں کا وجود کالی نہیں ہے بلکہ ایسے انتظامیہ کی ضرورت ہے جسے ان شعبوں کی افادیت کا احساس ہو۔ یونیورسٹی میں ایسا ماحول ہو جس میں طلباء ان شعبوں کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کر کے ان سے استفادہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں کیوں کہ موجودہ قانون کے مطابق مذہبی تعلیم لازمی نہیں بلکہ محض اختیاری ہے اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر کسی تعلیمی ادارے کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ تنہا گورنمنٹ کے سرمائے سے چلتا ہے یعنی نیشنل یا سرکاری ادارہ ہے تو پھر دستور ہند کی آرٹیکل ۲۸ (۱) کی رو سے اس میں کسی مذہب کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ یہ چیز حکومت کے سیکولرزم کے بھی خلاف ہے کہ وہ کسی نیشنل تعلیمی ادارے میں مذہبی تعلیم کا بندوبست کرے۔ حکومت ایک طرف اسے مسلمانوں کا قائم کردہ ادارہ ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس پر مصر ہے کہ یہ بات مان لی جائے کہ مسلم یونیورسٹی مثل دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کے ایک نیشنل یونیورسٹی ہے۔ دوسری طرف ایکٹ میں دینیات کے شعبے کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔ یہ تضاد ہے جو زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گا۔ یا تو اس کی وضاحت کرنا پڑے گی کہ یہ ادارہ مسلمانوں کا قائم کردہ ہے اور گورنمنٹ اسے امداد دیتی ہے یا پھر نیشنل مراعات کسی نہ کسی دن ختم ہو کر رہیں گی۔ مندرجہ بالا مسلم یونیورسٹی تربیتی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے وہ پہلو ہیں جن کی اصل زد مسلمانوں پر پڑتی ہے مگر اس کے علاوہ متعدد وہ پہلو ہیں جن کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے۔

مثلاً جمہوریت کے بجائے آمریت

اندرونی معاملات میں یونیورسٹی autonomy کے بجائے حکومت کی دیراندازی۔ اساتذہ کی بیچارگی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

## کامیابی پدمجائناٹو سابق گورنر بنگال

یہ یونیورسٹی اسلامی کلچر کے لاقیمت خزانے  
کی حفاظت کے لئے قائم کی گئی تھی، جو کہ ہندوستانی  
کلچر کے منہ ہار کے ساتھ ہے۔

سے لکھا جاسکے البتہ اس کا مختصر تجزیہ دیا جاتا ہے۔  
جمہوریت کے بجائے آمریت اور Autonomy  
کے بجائے حکومت کی مداخلت

جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ اصل اقتدار جمہوری  
طور پر منتخب شدہ نمائندوں کے ہاتھوں میں ہو، اور  
اختیارات کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر سطح پر جمہوری طور  
پر اختیارات منتقل ہوں۔ برخلاف آمریت کا مزاج یہ  
ہے کہ اختیارات شخص واحد یا واحد جماعت میں مرکوز ہو  
جائیں۔ پورا ایکٹ پڑھ جائے۔ صاف نظر آئے گا کہ یونیورسٹی  
کے نظم و نسق کے سارے اختیارات ایک ذریعہ ولس چار  
کو گھما پھرا کر دے دیے گئے ہیں۔ وائس چانسلر مرکزی  
وزارت تعلیم کے پسند کا آدمی ہوگا۔ اس طرح یونیورسٹی  
کے اندرونی معاملات میں حکومت مغل ہوگی اور ولس چار  
کے ذریعہ اپنی پالیسیوں پر عملدرآمد کرائے گی۔

اساتذہ کی بے چارگی اور طلباء کے جمہوری  
حقوق کا خاتمہ۔

یوں دنیا کے دکھانے کے لیے تو یہ کہا گیا ہے کہ  
یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ اور طلباء کو نمائندگی دی گئی  
ہے مگر اس کی تفصیلات دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ چیز  
محض نمائشی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ میں اساتذہ کی  
نمائندگی کے سلسلے میں بیشتر وہ لوگ ہوں گے جو بحیثیت

اپنے عہدوں کے نمائندگی کے مستحق ہوں۔ مثلاً ڈینس  
میڈس آف ڈیپارٹمنٹ، پروفیسر وغیرہ۔ یہ سب عہدوں  
کی تقرری کے سلسلے میں وائس چانسلر کی مرضی کے  
محتاج ہوں گے۔ مثلاً اسٹے ٹیوٹ (۱) کے بموجب  
وائس چانسلر کو فیکلٹی کے ڈین کے سلسلے میں وائس  
چانسلر کو مختار کل بنادیا گیا ہے۔ وہ آزاد ہوگا کہ سینئر پروفیسر  
یا جونیئر پروفیسر کا لحاظ رکھے بغیر اپنی پسند کے آدمی کو ڈین  
بنادے۔ اسٹے ٹیوٹ ۸ کی رو سے وائس چانسلر کو  
یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہے میڈیاٹ  
ڈیپارٹمنٹ بنادے یہاں تک کہ پروفیسر کی موجودگی میں  
کسی ریڈر کو میڈیاٹ ڈیپارٹمنٹ بنا سکتا ہے۔

اس طرح اسٹے ٹیوٹ ۱۱ (۱) و ۱۲ (۱) کے بموجب  
پروفیسر یا پرائکٹر کا تقرر ایگزیکٹو کونسل وائس چانسلر کی  
سفارشات کی بنا پر کرے گی۔ وائس چانسلر کے ان  
فیصلوں کے خلاف کوئی داد فریاد نہ ہو سکے گی۔ ترمیمی  
ایکٹ ۱۹۷۲ کی دفعہ ۴ کی رو سے یہ پابندی عاید کر دی  
گئی ہے کہ یونیورسٹی کے کسی آفیسر یا ملازم کے خلاف کسی  
ایسے معاملے میں جو اس نے ایکٹ، اسٹے ٹیوٹ یا  
آرڈیننس کی منشا کے مطابق نیک نیتی سے کیا ہو کسی قسم  
کی عدالتی یا قانونی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔

ظاہر ہے کہ کسی مسئلے میں وائس چانسلر کی  
بددیانتی ثابت کرنا ناممکن نہیں ہوگا۔ اس کا اتنا کہنا کافی ہوگا  
کہ اس نے فلاں کام یونیورسٹی کے مفاد میں کیا ہے۔ لہذا  
بے چارے اساتذہ اپنی ترقیوں کے لیے عام تسلیم شدہ ضابطوں  
سے فائدہ ڈالنا سکیں گے بلکہ وہ وائس چانسلر کے رحم و  
کرم کے محتاج ہوں گے۔ یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو، اور  
ایڈمک کونسل میں وائس چانسلر کے چشم و ابرو کے اشارے  
پر چلنے کے لیے مجبور ہوں گے۔ اس طرح جمہوریت کے نام

## ڈاکٹر کے ایل شریالی سابق وزیر تعلیم

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہمارے عظیم قومی ادارہ  
میں سے ایک ہے اور اس کے مقاصد اور روایات  
ہماری قومی زندگی کا حصہ ہیں۔

سہولتیں ہوں۔ قانون شکنی نہ کی جائے۔ اس سے زیادہ  
پُر امن طریقہ اظہارِ ناراضگی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا نام  
ایک نیشن رکھ کر اس کو سختی سے گلچنے کے لیے حکومت  
کی طرف سے اقدام ہمارے ملک کی جمہوریت کے لیے  
انتہائی رسوا کن ہیں۔ آزادی خیال کے حق کو دبانے کی  
کوشش جمہوریت نہیں آمریت ہے۔ ۱۱ جون کو یوم  
احتجاج پر سکون طریقہ پر پولیس ملک میں سنایا گیا۔ صرف  
یوپی میں پولیس، پی ایچ سی اور مقامی حکام کے کرتوتوں  
کی بدولت چند مقامات پر اس نے بدنما شکل اختیار کر لی  
مگر اس کی ساری ذمہ داری یوپی کی حکومت پر ہے۔  
اقلیتی کردار کا تذکرہ سوال بڑا کے جواب میں آگیا  
ہے لہذا اس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے کہ کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے گی؟

یہ سوال اس عام غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی  
صرف جدید تعلیم کے حصول کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس  
کا مقصد صرف ڈگریاں دینا تھا۔ اس کے پیش نظر مسلمانوں  
کی تہذیب، زبان اور اسلامی معاشرہ کا تحفظ نہیں تھا۔  
اس سلسلے میں یہ حقیقت ذرا موشگرمنا چاہیے کہ  
مسلمان اس ملک میں ایک مذہبی تہذیبی اقلیت ہیں  
ان کی تہذیب و زبان و مذہبی اعتقادات کے تحفظ کے

پر یونیورسٹی میں ایک شخص واحد کی حکومت ہوگی۔  
طلبا کے ساتھ ایکٹ میں جو ستم ظریفی کی گئی ہے  
وہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ طلباء کی منہ بھرائی کے لیے  
طلبا کو یونیورسٹی کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے مگر ترمیمی  
ایکٹ ۱۹۷۲ کی رو سے یونیورسٹی کورٹ کو کوئی اختیار  
انتظامیہ کو کنٹرول کرنے یا اس میں دخل دینے کا نہیں  
ہے۔ اس کا کام محض باتیں کرنا اور تجویزیں پاس کرنا ہوگا۔  
جن کی پابندی یونیورسٹی اتھارٹیز پر لازم نہیں ہوگی۔  
یونیورسٹی کے انتظامات کے اختیارات وائس چانسلر کے  
بعد ایگزیکٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل کو ہوں گے۔ ان  
میں طلباء کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس  
طلبا کی یونین کی طاقت کو توڑنے اور طلباء میں افتراق  
پیدا کرنے کی طرح ہے اسٹوڈنٹس کونسل بنادی گئی ہے  
جس کے چیرمین کو وائس چانسلر نامزد کریں گے۔ اس  
کے بہت سے ارکان وائس چانسلر کے نامزد کردہ ہوں گے  
اسے ٹیوٹ ۲۵ میں اسٹوڈنٹس کونسل کے اختیارات  
اور حدود کار کی وضاحت کر دی گئی ہے جبکہ اسے ٹیوٹ  
۳۲ میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ یونین کے حدود کار آرڈیننس کے  
ذریعہ متعین ہوں گے۔

اسی طرح اسٹوڈنٹس یونین کو جن کے عہدے دار  
جمہوری طریقوں سے منتخب ہوتے تھے، غیر موثر اور بے کار  
کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

یوم احتجاج جہاں تک سوال نمبر ۲ کا تعلق ہے آل  
انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کونونشن کونسل کی  
طرف سے ۱۶ جون کو صرف یوم احتجاج منانے کی اپیل اس  
ہدایت کے ساتھ کی گئی تھی کہ جلوس اور نعروں سے پرہیز  
کیا جائے، ہر طرح کی اشتعال انگیز یوں سے بچا جائے  
جلے صرف ان مقامات پر کیے جائیں جہاں ان کے لیے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر



# اگلا بچہ ہونے سے پہلے ڈرا سوچئے

کیا آپ اس بچے کی  
پرورش اچھی طرح  
نہیں کرنا چاہیں گے؟



آپ اس کے روشن مستقبل کے لئے اسے اچھی تعلیم دینا چاہیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس کی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنا پسند کریں گے۔ لیکن اگر انکو بڑھتی ہو جاتا ہے تو یہ سب آپ کے لئے آسان نہ ہوگا۔ کیا آپ ایسے حالات سے بچنا نہیں چاہتے؟  
دیا ہر عرصہ مکمل ٹوک ہی کر رہے ہیں۔ وہ بچے کی پیدائش سے قبل ہی بتا دیتے ہیں کہ اس کے خوراک کی ضرورتیں جو ہونے۔ ہندو دھرم کی رو سے یہ بچہ جو کتنا بڑا ہوگا۔  
ہر ہندو دھرم کے روئے کا وہ بڑا ہوگا جو دنیا ہر عرصہ میں ہے۔ اس کا استعمال ثابت آسان ہے۔ اس سے کوئی نقصان ہی نہیں ہے۔ ہندو دھرم کے روئے کے بچے کی پیدائش کو بھی سنبھالیں گے۔  
یہ ہر ملک میں ہے۔ 15 پیسے میں 3 دسرکاری امداد کی وجہ سے

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں منستان

## نیرودھ

لاکھوں میں مقبول بیسیر اور آسمان



جنرل چنٹس، کمیسٹ اور ڈرگسٹ، بڑی بڑی دکانوں اور پان دگرٹ فروش کے یہاں بکتا ہے۔

## مسلم یونیورسٹی کیلئے قانون بیگ کیٹی کی سفارشات کے بموجب بنایا جاتے

یہ ایسے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے جو ان کے زیرِ نگرانی ہوں تاکہ جدید تعلیم اسلامی ماحول میں دی جاسکے اگرچہ کی سطح پر ان کے لیے تعلیمی ادارے ہیں تو اونچی سطح پر ان کے لیے یونیورسٹی کی بھی ضرورت ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ایک مذہبی فرقہ کی بھاری اکثریت ہو سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں میں اکثریتی فرقہ کی تہذیب و زبان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوتا البتہ اقلیتوں کو اپنی تہذیب و زبان اور مذہبی معتقدات کے تحفظ کے لیے ان کے مخصوص تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کے دستور میں اس کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کرایا گیا ہے۔ مگر آج یہ کہہ کر کہ مسلم یونیورسٹی سے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری نہیں ہوتیں مسلمانوں کو بنیادی حق سے محروم کر دیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی کی اہمیت و ضرورت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم یہ جائزہ لیں کہ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے کون سی تہذیب و زبان زندہ کی جا رہی ہے اور کس کو فنا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مسئلہ صرف تعلیمی ضروریات کا نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرہ کے بقا کا بھی ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دیگر تعلیمی اداروں بالخصوص میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں وغیرہ میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے اور مسلمان کس طرح تھب کا شکار ہیں۔

مندرجہ بالا نقطہ نظر سے اگر ہم ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء

کا جائزہ لیں تو اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح مسلمانوں کے مفاد کو ترقی پسندی کے نام پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونیورسٹیاں ملک میں بہت ہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی تھی۔ مگر مسلم یونیورسٹی اپنی نوعیت کی منفرد یونیورسٹی تھی۔ اس کو عام یونیورسٹیوں کی سطح پر لے آنا مسلمانوں کے ساتھ صدمہ ہی نا انصافی ہے۔

تجاذیر

ایک جمہوری ملک کی یہ سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیتوں کو خوش و مطمئن رکھے۔ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونے پائے تاکہ ملک کے سدرے باشندے خوش دلی کے ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں اور اپنی گونا گوں صلاحیتوں سے ملک کو مالا مال کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اقلیتوں سے متعلق امور میں قوانین اقلیتوں کو اعتماد میں لے بغیر بنائے جائیں۔ اس کے لیے حکومت کے ایک سینئر وزیر فخر الدین علی احمد صاحب کے ذریعہ مسلمانوں کے ماہرین قانون و تعلیم کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جو بیگ کیٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو حکومت کے معتد تھے یہ اطمینان دلایا گیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے قانون بیگ کیٹی کی سفارشات کو حقارت سے ٹھکرا دیا گیا۔ حالانکہ ملک کی تمام مسلم جماعتوں، اولڈ بوائز، اسٹوڈنٹس یونین اور یونیورسٹی سے ہمدردی رکھنے والے دیگر حضرات نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے قانون بیگ کیٹی سفارشات کے بموجب بنایا جائے۔ اب بھی مسئلہ کا حل یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے قانون جبراً نافذ کیا جائے مسلمانوں کے جذبات کو کچلنے کے بجائے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ ●●

# ایکٹ میں شادی کی چھاپی



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی اور اقلیتی کروا  
کو برقرار رکھنے کی خواہش رکھنے والوں کا کیا مقصد  
ہے؟ یہ بات ابھی تک اپنی بہترین کوششوں کے  
باوجود میں نہ سمجھ سکا۔ یونیورسٹی کے مقاصد و مقاصد  
۱۹۲ء کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے دیباچہ  
اور دفعہ ۴ اور ۵ میں کی گئی ہے اور حال ہی میں  
منظور کئے گئے ترمیمی ایکٹ میں ان دفعات کو جو  
کاتوں باقی رکھا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے اسے آپ ختم  
نہیں کر سکتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئین کی دفعہ  
۳ کی رو سے کبھی بھی اقلیتی ادارہ نہیں رہی جو دو  
مشرائط نافذ کرتی ہے ایک یہ کہ تعلیمی ادارہ ایک  
اقلیت کے ذریعے قائم کیا گیا تھا اور اس کا انتظام  
بھی اس اقلیت کی مرضی سے ہوتا تھا۔ بلاشبہ  
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
اور نیٹل کالج کی شکل میں اپنے وقت کے عظیم ترین  
لیڈر سر سید احمد خاں نے رکھی تھی اور اس کی تعمیر  
مسلمانوں کے عطیات سے ہوئی تھی لیکن خود  
یونیورسٹی کا نظم و نسق ۱۹۲ء کے ایکٹ ۱۰  
کی دفعات کے تحت آغاز ہی سے چلا آ رہا تھا۔  
ترمیمی ایکٹ نے یونیورسٹی کے بنیادی ڈھانچے  
میں کوئی خلل نہیں ڈالا ہے یعنی اس کی کورٹ  
ایڈمک کونسل۔ ایگزیکٹو کونسل۔ چانسلر۔ پرنسپل  
اور وائس چانسلر کو باقی رکھا ہے صرف کورٹ

کے آئین میں ترمیم کی گئی ہے۔ اصل معطیان جو  
تقریباً سب فوت ہو چکے ہیں کی نمائندگی اب ان  
کے وارثوں کے ذریعے ہوتی ہے گویا کورٹ ورثہ  
میں ملی ہوئی جائداد ہو۔ نئے ایکٹ کے ذریعے  
کورٹ میں معطیان کی نمائندگی ختم کر دی گئی ہے  
اور اس میں طلبہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ میرے  
خیال میں وارثوں کو کورٹ کی ممبری سے محروم  
کرنا ممکن تھا لیکن اصل معطیان کو پہلے سے  
کم نمائندگی حاصل رہ سکتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دروازے  
پہلے ہی دن سے بلا تفریق مذہب و ملت ہر نسل  
فرقہ اور طبقہ کے مردوں اور عورتوں کے لئے  
کھلے رہے ہیں۔ جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں  
ان کی فہرست طویل اور جامع ہے اور یہ فہرست  
اس عظیم ادارہ کے پاکیزہ کردار کی غمازی کرتی  
ہے۔ یونیورسٹی کے امتیازی پہلو کی نشان دہی  
۱۹۲ء کے ایکٹ کی دفعہ ۵ (۲) سے ہوتی ہے  
جو یونیورسٹی کو مشرقی اور اسلامی علوم کے



ذریعہ اور مسلم دنیا میں سبقت دینے کا اختیار  
 دیتی ہے۔ ایکٹ میں شامل کیا گیا شیڈول شعبہ  
 دنیا میں قائم کرنے کا انتظام کرتا ہے عربی اور  
 فارسی اور سنی و شیعہ دنیا کے کامیوں اور  
 مخالفوں دونوں کے لئے ایک امتحان ہے۔  
 انھیں مسلم دھرم، تاریخ اور کلچر کی تعلیم کا اس  
 طرح انتظام کرنا چاہئے کہ اس تعلیم سے مسلمانوں  
 اور غیر مسلموں کو یکساں دلچسپی پیدا ہو۔ اسے  
 نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ مرکزی حکومت یونیورسٹی  
 کے اخراجات کے سب سے بڑے حصہ کا انتظام  
 کرتی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں مرکزی حکومت نے تین  
 کروڑ اسی لاکھ روپے یونیورسٹی کے اخراجات  
 کی تکمیل کے لئے دیئے۔ اگر معترضین کامیاب ہوتے  
 ہیں تو یونیورسٹی اتنی ہی مالی امداد کی مستحق ہوگی  
 جتنی دوسرے اقلیتی اداروں کو مل سکتی ہے اور

یہ امداد اس وقت تک یونیورسٹی کو چلانے کے  
 لئے کافی نہ ہوگی جب تک مسلم فرقہ خسارہ کو پورا  
 نہ کرے۔ اس بات کا بار بار مطالبہ کیا جاتا رہا  
 ہے کہ ایکٹ ۱۹۷۷ء پر نظر ثانی کی  
 جائے کیوں کہ یہ ایکٹ کئی اعتبار سے بے محل  
 ہو چکا ہے۔ برسوں سے یہ مطالبہ کھٹائی میں پڑا  
 ہوا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی اپنے  
 تنگ دائرے سے نکل کر سماجی تصورات میں نئی  
 تبدیلیوں کا ساتھ دے۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں  
 کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے مخالفت  
 ہو لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ وہ سادہ لوح  
 افراد فسادات کا نشانہ بنیں جو یونیورسٹی کی  
 تعلیم سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوں۔ اب یہ  
 مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ حلج قبول کریں اور  
 جو شرارت ہو رہی ہے اسے ختم کر کے رکھ دیں۔

# میر تقی احمد

## چیرمین میٹروپالیٹن کونسل دہلی

آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تیسری ایکٹ کا فیصلہ  
 کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اپنی تاریخ اور روایت کی وجہ  
 سے اس نے مسلمانوں پر بارہ مضطرب کیا ہے۔ صورت حال  
 کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کچھ لوگوں  
 نے ایکٹ کے علمی اور تعمیری پہلوؤں کو لینے کی بجائے  
 جذباتی رویہ اختیار کیا ہے  
 ایکٹ کے سلسلے میں عام مسلمانوں کی لاپرواہی اور

زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی مایوسیوں سے فائدہ  
 اٹھاتے ہوئے فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے کی غیر ذمہ دار  
 کوشش کی جا رہی ہے۔  
 اے۔ ایم۔ یو کے سلسلے میں مختلف ایکٹوں اور اس  
 کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے مندرجہ ذیل  
 نتائج اخذ کیے ہیں۔

۱۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں میں جدید تعلیم

کتناسحر  
کتنی جاذبیت  
یہ سب کمال ہے



# افغان

آپ بھلے ہی یقین نہ کریں لیکن یہ سچ ہے۔  
افغان کے استعمال سے لہجہ بہ لہجہ مکمل ملاحظت  
حاصل ہوتی ہے۔ اتنی احتیاط ہر کسی کے بس  
کی نہیں لیکن یہ ایک ماز ہے جس سے آپ  
آگاہ ہیں۔

آپ کبھی بھی پسند فرمائیں



Say 'aha' to **AFGHAN SNOW!**

E. S. DATANWALA, BOMBAY-31



میر شفاق احمد  
بحیرین میٹروپولیٹن کونسل دہلی

پہنچانا تھا۔ لیکن کورٹ نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اقامتی کردار برقرار رکھا۔ اس تازہ ترین ایکٹ میں اس انتظام کو ختم کر دیا گیا ہے تاکہ یونیورسٹی کے دشمن فرقہ پرست عناصر اس کے اقامتی کردار کے خلاف مزید سازش نہ کر سکیں اس سے یہ ایکٹ مسلم یونیورسٹی کو حقیقی معنوں میں قومی اہمیت کا ادارہ بناتا ہے۔

۶۔ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء کے ایکٹوں کے تحت کورٹ پر جاگیر دار عناصر حاوی تھے۔ ان کی بالادستی کو ۱۹۹۲ء کے ایکٹ کے ذریعہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اس ایکٹ میں یونیورسٹی کے ٹیچروں اور طلباء کو زیادہ نمائندگی دی گئی ہے اور پہلی بار یونیورسٹی کے نظم و نسق کے سلسلے میں ٹیچروں کی بالادستی

ماہر نے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

۲۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانیوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس میں اسلامی تعلیمات اور دنیاویات کی تعلیم کا خاص اور کافی انتظام ہو سکے۔ وہ اس ادارے کو صرف مسلمانوں کے لیے محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۸۰ء میں جس کے مطابق یونیورسٹی قائم کی گئی تھی واضح طور پر کہا گیا تھا (آرٹیکل ۱)۔ یونیورسٹی کے روحانی سربراہ و ملت کے لوگوں کے لیے کھلے رہیں گے۔

۳۔ ۱۹۸۰ء کے ایکٹ کے تحت کورٹ کی رکنیت صرف مسلمانوں تک محدود تھی۔ اور ۱۹۹۱ء کی ترمیم میں یہ پابندی ختم کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کی تاریخ اور روایت کے پیش نظر مسلم مفادات جوں کے توں رکھے گئے۔

۴۔ ۱۹۸۰ء کے ایکٹ کے تحت مسلم یونیورسٹی اسلامی علوم اور دنیاویات میں تحقیق کے لیے خاصی سہولیات اور انتظامات فراہم کئے گئے تھے اور مذہبی احکامات پر عمل کرنے کا بھی انتظام تھا۔ یہ سہولیات اور انتظامات ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۱ء دونوں کے ترمیمی ایکٹوں میں باقی رکھے گئے ہیں۔

۵۔ ۱۹۸۰ء کے ایکٹ سے لے کر ایم۔ یو کورٹ کی بھی بیرونی کالج کے امتحان کی منظوری دے دی گئی تھی ۱۹۹۱ء کے ایکٹ میں اس انتظام کو باقی رکھا گیا لیکن اس سے فائدہ اٹھا کر فرقہ پرست عناصر نے یہ ہم شروع کر دی کہ مقامی کالجوں کا یونیورسٹی سے الحاق کیا جائے۔ ان کا مقصد اس کے اقامتی کردار کو تباہ کرنا اور مسلمانوں کے مفادات کو نقصان



## ہم سینٹرل یونیورسٹی چاہتے ہیں

”ہم سینٹرل یونیورسٹی چاہتے ہیں اور اس کے زیر اقلید بہت سے کالجوں کے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں“ ۱۹۰۴ء ۱۹۰۴ء

”میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ رائے ظاہر کی ہے کہ علاوہ یونیورسٹی کے ہیں اول درجہ کے پرائیویٹ کالج قائم کرنے چاہئیں جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کئے جائیں“ ۱۹۱۱ء سر آغا خاں مرحوم

قائم ہوئی ہے۔

۱۔ ترمیمی بل منظور کرنے کے وقت یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ یونیورسٹی کے تادیبی کردار کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یونیورسٹی میں اب تک جن آداب پر عمل ہوتا تھا انہیں آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ یقین دہانیوں پر عمل کا انحصار ان لوگوں کی نیت پر ہوتا ہے جو یقین دہانی کرا رہے ہیں۔ ابھی ان لوگوں کی دیانتداری یا غیر دیانتداری کا اندازہ لگانا، ناممکن ہے اور بے بنیاد ہوگا۔ اس پس منظر میں حالیہ ایجنڈیشن پر غور کرنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ حسب معمول کچھ فرق پرست عناصر منفی رویہ اختیار کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ عام طور پر قدیم طلباء نے آگ پر تیل ڈالنے سے گریز کیا ہے۔ قدیم طلباء کا صرف ایک چھوٹا سا طبقہ پیش پیش ہے اور ان لوگوں کو کسی بھی حالت میں یونیورسٹی کے موجودہ اور قدیم تمام طلباء کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ مسلمانوں کو اس دلیل کے ساتھ گمراہ کیا جاسا ہے کہ یونیورسٹی کو دفعہ ۱۳۱ کے تحت مسلمانوں کا

ادارہ قرار دینا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس مسئلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ آیا کوئی یونیورسٹی مرکزی حکومت کی دیکھ بھال میں زیادہ بہتر طور پر ترقی کر سکتی ہے یا پرائیویٹ انتظامیہ کے تحت۔ گزشتہ ۲۰ برسوں میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی زبردست ترقی اور ترقی اس لیے ہوئی کہ اسے مرکزی حکومت کی لامحدود امداد ملی۔ کوئی بھی غیر سرکاری ایجنسی اتنی غیر معمولی ترقی اور توسیع نہیں کر سکتی تھی۔

جو لوگ تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۰۱ کے تحت یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی بھولتے ہیں کہ آج کے زمانے میں کوئی بھی ایک یونیورسٹی کسی بھی فرقہ کی تعلیمی ضروریات پر عمل نہیں کر سکتی۔

جہاں بھی امتیازی سلوک ہوتا ہے وہاں اقلیتوں کو زیادہ گھانا ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے کسی بھی تعلیمی ادارے میں کوئی بھی امتیازی سلوک نہ ہو، اور جہاں بھی اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتا جا رہا ہو وہاں اسے ختم کیا جائے۔ اس تعمیری رخ پر تحریک چلانے کی بجائے مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی محفوظ رکھنے کا نعرہ لگانا۔ ان کے لیے کسی طرح بھی سفید نہیں ہے۔

جہاں تک یونیورسٹی گورنمنٹ کے اختیارات گھٹانے کا سوال ہے یہ ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے۔ یونیورسٹی میں اعلیٰ ترین گنہگار ادارہ ایگزیکٹو یونیورسٹی ہونا چاہیے اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں ایسا کیا گیا ہے۔ اس طرح امور یونیورسٹی میں بروہی اقدامات ختم ہو جائیں گے۔

لیکن وائس چانسلر کو دیئے گئے غیر معمولی اختیارات سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے نظم و نسق کے جمہوری کردار کو ضرب لگے گی۔ پہلے ہی سے موجود اسٹوڈنٹس یونین کے ساتھ ہی اسٹوڈنٹس کونسل کے قیام سے بھی غیر ضروری تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں یونیورسٹی

کی ڈسپلن کو نقصان پہنچے گا۔

لیکن یہ معاملے ایسے ہیں جن کا ان لوگوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے سوالوں اور اعتراضات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو آج ایکٹ کے خلاف لکھی ٹیشن چلا رہے ہیں اور یہ ترمیم بھی حرف آخر نہیں ہے۔ اگر عملی طور پر ہمارے خدشات درست ثابت ہوتے ہیں تو ہمیں ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ایکٹ میں مزید ترمیم کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

ہم علیگنڈہ مسلم یونیورسٹی کے عام خیر خواہوں اور

اقلیتوں سے لپل کرتے ہیں کہ اس معاملہ پر احتیاط کے ساتھ غور کریں اور مسلمانوں اور یونیورسٹی کے حقیقی مفادات کو غلط فہمیوں کا شکار نہ بنائیں۔ ہمیں صرف علیگنڈہ مسلم یونیورسٹی ہی کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے مجموعی تعلیمی و میں ان کا مناسب مقام دلانے کے لیے بھی جدوجہد کرنا ہے۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے احساس مایوسی کو دور کرنے کے لیے اقدامات کرے گی۔ تاکہ فرقہ پرور عناصر نہیں ہتھیار نہ کر سکیں۔



## مشہور اديب اور فلم ڈائریکٹر خواجہ احمد عباس

ایکٹ ۱۹۷۲ء بہت اچھا ہے پہلی بار یونیورسٹی کی باگ ڈور نوابوں جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکل کر دانشوروں، استادوں اور طالب علموں کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ ایسا ہی ہر یونیورسٹی اور سر تعلیمی ادارے میں ہونا چاہئے حکومت نے صرف ایک غلطی کی ہے۔ اگر علی گنڈہ یونیورسٹی کے ساتھ ایسا ہی ایکٹ بنائیں ہندو یونیورسٹی کے بارے میں بن جاتا تو خواہ مخواہ مخالفوں اور معترضین کو موقع نہ ملتا کہ حکومت کی نیت پر حملہ کریں۔ مگر مجھے یقین ہے ایسا ہی ایکٹ بنائیں یونیورسٹی کے

## ہندوستان کی تعلیمی ادارے کی حیثیت سے SPECIALIZE

ہندوستان کی تہذیب و تاریخ، تمدن، کلچر اور فلسفہ کا پیشہ  
قیمت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان علوم میں علی گڑھ یونیورسٹی  
ایک قومی ہندوستانی تعلیمی ادارے کی حیثیت سے SPECIALIZE  
کے لیے جیسے کہ ہندو تاریخ، ہندو فلسفہ اور ہندو تمدن پر بنائے  
میں کام ہو۔ ساتھ میں یوروپین یونیورسٹیاں جدید علوم، سائنس  
اقتصادیات وغیرہ کی تعلیم و تحقیق میں قومی ہندوستانی یونیورسٹیوں  
کی حیثیت سے کام کریں۔ علی گڑھ کے دروازے سب ہندوستانیوں  
کے لیے کھلے ہوں اور اسی طرح بنارس کے دروازے بھی سب  
ہندوستانیوں کے لیے کھلے ہوں۔

اس ایکٹ سے مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کو کوئی نقصان  
نہیں پہنچے گا بلکہ فائدہ پہنچے گا۔

مسلمانوں کو علمی، سیکولر، قوم پرستانہ رویہ اپنانا  
ملک کے ترقی پسند نظریات اور ترقی پسند تحریکات کا ساتھ دینا  
چاہئے، اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ پرانی مسلم فرقہ پرستی کو زندہ رکھنا  
ہندو فاشزم کو زندہ کرنا اور طاقت پہنچانے ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات (دوسری  
ضروریات مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، آگام تفریح وغیرہ کی طرح)  
دی ہیں جو دوسرے ہندوستانیوں کی ہیں۔ اس کے لئے ہزاروں  
کانٹون اور سکولوں کی ضرورت ہے جہاں دوسری قوموں کے  
طالب علموں کے ساتھ ہندوستانی مسلمان طالب علم بھی آزادی اور  
خراقت کے ساتھ موجودہ تعلیم حاصل کر سکیں اور ملک کی تمدنی،  
اقتصادی، سیاسی زندگی میں حصہ لینے کے قابل بن سکیں۔  
مسلمانوں کا (جس طرح ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں، سکھوں  
بہمت کے ماننے والوں اور ملالہ ہوں) کا مستقبل ملک میں  
سیکولرزم اور سوشلزم کی تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان  
نظریوں اور تحریکوں کو مضبوط بنانے میں ہی ان کی (اور باقی  
سب ہندوستانیوں کی) نجات ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
جیسے قومی اداروں کا وجود جنہیں حکومت امداد  
دینے کا فیصلہ کرے ہمارے سیکولرزم کو معنی اور  
مقصد عطا کرنے کے لئے اولین شرط ہے۔ ان  
اداروں کا ہرگز یہ مقصد نہیں اور ان کے بارے  
میں یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ محض قیمتی کھلونے  
ہیں جن کو دل کو بہلانے کے لئے کسی غالب  
اکثریت کو یا کسی چیخ و پکار کرنے والی اقلیت  
کو دے دیا جائے تاکہ وہ خاموش رہے اور  
مناسب حد تک مطمئن ہو جائے۔ ان اداروں  
کا مقصد اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

بارے میں پاس ہوگا، اور اس کی باگ ڈور بھی راجوں ہمارے  
سیٹھوں اور فرقہ پرستوں کے ہاتھوں سے لے کر دانشوروں،  
استادوں اور طالب علموں کو سونپی جائے گی۔

جہاں تک ایکٹ کے خلاف ایجیٹیشن کا تعلق ہے یہ  
تحریک ایک فرقہ دہانہ تحریک ہے اور میں ایسی تحریکوں کا  
ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ بد قسمتی سے بہت سے بھولے بھالے  
مسلمان فرقہ پرستوں اور فرقہ پرست پارٹیوں کے بہکاوے میں  
آجائے ہیں اور ہنگاموں میں شریک ہو کر دکھ اٹھاتے ہیں،  
دوسری مسلم فرقہ پرست تحریکوں کی طرح یہ تحریک بھی ہندو  
فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی ہے۔

میں فرقہ دہانہ تعلیمی اداروں کا مخالف ہوں۔ لیکن  
اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن، اسلامی کلچر اور اسلامی فلسفہ



# ای۔ ڈی۔ مالوہ کی کمی

● مجموعی طور پر میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی حمایت کرتا ہوں۔ یہ درست سمت میں ایک قدم ہے اور میری حمایت کی مزید بنیاد اس واقع پر ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کی کارکردگی کم و بیش انہی خطوط پر سدھاری جائے گی۔

● میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف ابھی ٹیشن کو نا بھیجی کی بات سمجھتا ہوں۔ اس کی بنیاد جذباتی ہے اور یہ چند اقتصادی و سماجی پہلوؤں پر اکثریتی فرقہ کے خلاف طویل احساس شکایت کا رد عمل بھی ہے۔ اور یہ رد عمل بھی صورت حال اور انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری ترقی پسند پارٹیوں کے ان لیڈروں کی مسلسل جدوجہد کے سلسلہ میں لاعلمی کا نتیجہ ہے جو سرمایہ داری، روایت پسندی، مذہبی جنون اور کسی کے اپنے کلچر کو کچلنے کے غلط تصور کو مٹانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

● میں اعتراف کرتا ہوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو سمجھنے سے اس طرح میں قاصر ہوں جس طرح میں اس فرسودہ تصور کو پسند نہ کروں گا کہ کسی بھی یونیورسٹی پر اکثریت کا کنٹرول ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان

کی قومیتوں کے فساد میں ایک نئے سماجی نقطہ نظر کو فروغ دیا جائے جو واضح طور پر مذہبی عقیدہ اور مذہبی طرز زندگی سے جدا ہو کیونکہ ان دونوں چیزوں کو میرے خیال میں نجی اور خاندانی روابط ہی تک محدود رہنا چاہیے۔

● مجھے یقین ہے کہ اس ایکٹ سے مسلمانوں کے تعلیمی مفادات کو ضرب نہ لگے گی کیونکہ ایک طرف مسلم طرز زندگی کی خوبیاں زیادہ تیزی سے پھیلیں گی اور دوسری طرف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی صلاحیت کا اس حالت میں بڑھ جائیگی جب وہ مانسی کی اس علیحدگی پسندی کے دائرے سے باہر آجائے گی جو مفادات خصوصی کے نمائندوں کی دین تھی۔

● میری تجویز ہے کہ یونیورسٹی کے بنیادی طرز عمل کا چاہے وہ براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہوں یا نہ ہوں چند مہینوں کے اندر جائزہ لیا جائے اور ان کی کارکردگی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی عام کارکردگی کے طرز پر لایا جائے۔

● مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی کے بدلے ہوئے ڈھانچہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کافی اور بامقصد طور پر پوری ہوں گی۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ اس یونیورسٹی سے مزید کاموں کے الحاق پر جو پابندی لگائی گئی ہے وہ بحال اور مناسب ہے۔





کے لیے ہے اور اسے مسلمانوں ہی کو چلاتا ہے۔  
یہ بات عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ ایک ادارہ جو عوام  
کے سرمایہ سے چلتا ہو۔

قومی کردار کے علاوہ کسی اور کردار کا دعویٰ نہیں  
کر سکتا۔ اے ایم یو ایکٹ کو منسوخ کر کے ایک ایسا کیاں  
ایکٹ بنانا چاہیے جو علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں کو ملے  
تمام مرکزی یونیورسٹیوں کا احاطہ کرے۔ دو یونیورسٹیوں  
کے لیے دو الگ الگ قوانین کا ہونا قوم پروری کے  
منافی ہوگا۔

● مسلمانوں کا کوئی عہدہ تعلیمی مفاد نہیں ہے۔ ان کے

## جن سنگھ کے پروفیسر بلراج موہوت

مفادات بھی وہی ہیں جو دوسرے ہندوستانیوں کے ہیں۔  
جب تک ان میں علیحدگی پسندی کو زندہ رکھا گیا، اس  
وقت تک ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہونچتا رہے گا  
اور ان کے خلاف باقی ماندہ ہندوستانی معاشرہ میں  
قلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

● علیگڑھ، بنارس اور شانتی نیکتن کے لیے یکساں

قانون ہونا چاہیے اور ان یونیورسٹیوں سے دس میل کے  
اندرواقع تمام کالجوں کا الحاق ان سے ہونا چاہیے لیکن  
مختلف مضامین میں ان کی الگ الگ خصوصیات ہو سکتی  
ہیں۔ علیگڑھ یونیورسٹی اسی طرح قرون وسطیٰ کی تاریخ  
اور مغربی ایشیا کے علوم میں خاص تعلیم دے سکتی ہے  
جس طرح بنارس یونیورسٹی اعلیٰ انجینئرنگ میں اور شانتی  
نیکتن ہونیٹنری میں۔

● کسی ایسی خاص یونیورسٹی کا کوئی سوال نہیں پیدا

● علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

● ۱۹۷۲ء کا علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ نہ اچھا ہے نہ  
برا۔ یہ مسلم فرقہ پرستی کی خوشامد کے مراد ہے لیکن اس  
کے ساتھ ہی اس ایکٹ کے ذریعہ یونیورسٹی کا نظم و نسق  
بڑے بڑے زمینداروں اور دوسرے جاگیردارانہ ذہنیت  
رکھنے والوں کے ہاتھوں سے لے کر داس چانسلر کو سپرد  
کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حکومت وقت کا نمائندہ ہوگا۔

● ایچ ٹی ٹی خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف

اتنا نہیں ہے جتنا بنگلہ دیش کی آزادی اور پاکستان کے  
ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں امداد دینے کے لیے حکومت کینلات  
ہے۔ یہ اس امر کے اظہار کی ایک کوشش ہے کہ دو قوموں  
کا نظریہ چاہے پاکستان اور بنگلہ دیش میں مرگیا ہو لیکن  
ہندوستان میں اچھی طرح زندہ ہے۔

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے میں یہ

مطلب نکالتا ہوں کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے، مسلمانوں

صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے  
کسی یونیورسٹی کا خیال رجعت پسندانہ اور فرقہ وارانہ  
ہے۔

ہونا جو صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرے۔  
تمام یونیورسٹیاں تمام ہندوستانیوں کی جن میں ہندوستانی  
مسلمان بھی شامل ہیں، تعلیمی ضروریات پوری کرتی ہیں۔

# سید مظفر حسین شاہ بریلوی

## ریسرچر شیخہ ڈگری کا بیچ لکھنؤ

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترجمی) ایکٹ ۱۹۴۷ء

اس دانش گاہ کو جدید و مفید ترین تعلیمی اصلاحات سے  
رہنمائی کرنا ہے۔ گنڈرگڈ کرکینی کی جن سفارشات کا  
ماہرین تعلیم گرم جوشی سے غیر مقدم کر رہے ہیں یہ ایکٹ مسلم  
یونیورسٹی کے اصل بنیادی کردار کو بدستور محفوظ رکھتا ہے۔

● اس درس گاہ کے بانی سر سید احمد خاں نے اس  
ادارے کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش  
کی ہے۔ یہ ایکٹ اس دانش گاہ کو قومی تعمیر میں بھرپور تعاون  
کرنے کے مواقع عطا کرتا ہے جو عہد حاضر کی اہم ترین ضرورت  
ہے۔ یہ ایکٹ دانش گاہ کو بدلتے ہوئے وقت و حالات کی  
بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق ضروری قوانین بنانے میں  
آزادی دیتا ہے۔ ایکٹ کا پچھلا پان اس کی خاص صفت  
ہے۔ اس سے دانش گاہ کے انتظام میں طلباء و اساتذہ کو  
موثر طور پر حصہ لینے کے مواقع فراہم ہو رہے ہیں اس ایکٹ  
نے دانش گاہ کے اقامتی کردار کو خاص طور پر محفوظ کر دیا  
ہے۔ ان ہی تمام وجوہ کے باعث یہ ایکٹ ماہرین تعلیم کے  
نقطہ نظر سے مفید ترین اقدام ہے اس لیے ملک کے ترقی پسند  
عناصر ایکٹ کی بھرپور حمایت کر رہے ہیں۔ میری رائے میں یہ  
مسلم یونیورسٹی کے مفاد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

دانش گاہ علی گڑھ کے مسئلہ پر بعض مسلم حلقوں کی  
تحریک حقائق سے زیادہ بے بنیاد باتوں، غلط فہمیوں اور  
گمراہ کن پروپیگنڈے پر مبنی ہے، تحریک میں ہوش سے زیادہ  
جوش کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تحریک سنجیدہ غور و فکر محسوس  
دلائل اور حقائق سے زیادہ جذباتی ہیجان کے بل بوتے پر  
چلائی جا رہی ہے مسلم یونیورسٹی جیسے علم و دانش کے مرکز کے  
مسائل ہر کس و نا کس کے پس کی بات نہیں، جذباتی تقریریں  
اور جوشیلی تحریروں سے دانش گاہوں کے مسائل حل  
نہیں کیے جاسکتے۔ ماہرین تعلیم پر مشتمل کمیشن برسوں پوری  
سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کر کے ان کے حل پیش کرتے  
ہیں۔ تحریک چلانے والوں کا یہ کہنا کہ مسلم یونیورسٹی کے  
مسائل میں ان کی رائے کو نظر انداز کرنا جمہوریت کے منافی  
ہے۔ اس لیے درست نہیں کہ تعلیمی اداروں کے انتظام  
میں تعلیم و تدریس کے مسائل سے کما حقہ واقفیت نہ رکھنے  
والے عوام کی رائے کا ماننا ضروری نہیں مسلم یونیورسٹی  
کے مسائل میں عوام کی رائے منوانے کی ضد بالکل غیر دانشمندانہ  
امر ہے۔ جس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ سجا کڑہ شگل باندھ  
کی تعمیر جیسے ٹیکنیکل کام میں بجائے انجینئروں کی رائے پر  
عمل کرنے کے جمہوریت کی دہائی دیکر عوام کی رائے منوانے



کی ضد کی جائے۔ میرے خیال میں ایکٹ کے مخالفین مسلم یونیورسٹی کے مفاد کو پس پشت ڈال کر ایسے ذاتی مفروضات و مفاد کی بنیاد پر تحریک چلانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ یہ تحریک خود مسلمانوں کے لیے بھی بچائے مفید ہونے کے مضرت رساں ہے۔ اس تحریک سے مسلم یونیورسٹی کو بھی نقصان پہنچے گا اور یہ ملک کے وسیع تر مفاد کے بھی منافی ہے۔ اس تحریک سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو شدید صدمہ پہنچے گا اندیشہ ہے۔ اس تحریک کو بہانہ بنا کر اکثریتی فرقہ کے رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر ملک کے امن و سکون کو غارت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ایک غیر واضح اصطلاح ہے کہ اس کے مفہوم پر خود اقلیتی کردار کے حامی پوری طرح متفق نہیں۔ اگر اقلیتی کردار کا محض یہ مطلب ہے کہ اس دانش گاہ کا انتظام صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے تو اس مطالبہ کو قبول کرنا ملک میں علیحدگی پسند عناصر کو تقویت دینے کے مترادف ہوگا۔ مسلم یونیورسٹی آئین ہند کی دفعہ ۳۰ کے تحت آنے والے اقلیتوں کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں میں نہ تو خود آئین کی رو سے شامل کی گئی ہے اور نہ سابقہ قوانین کی رو سے یہ اقلیتی ادارہ ثابت ہوتی ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق بھی یہ اقلیتی ادارہ نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے ذریعہ چلایا جانے والا ایک ایسا قومی ادارہ ہے جس کے تقریباً تمام وکمال کثیر مصارف دجو ۳ کروڑ ۸۹ لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ چکے ہیں، مرکزی حکومت برداشت کرتی رہی ہے۔ اس کے برخلاف آئین ہند کی دفعہ ۳۰ کے تحت چلنے والے اقلیتی اداروں کو حکومت کسی قدر مالی امداد تو دیتی ہے مگر ان کے تمام وکمال معارف نہیں برداشت کرتی۔ ایک سیکولر حکومت کیلئے مسلم یونیورسٹی

کو اقلیتی ادارہ مان کر اس کے تمام وکمال مصارف برداشت کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ اس سے حکومت پر یہ الزام ملید ہوتا ہے کہ اس نے ایک مخصوص فرقہ کے ساتھ امتیاز برتنا جو سیکولر ازم کے منافی ہے اور حکومت کے لیے ملک بھر میں ایک بہت بڑی تعداد میں قائم تمام اقلیتی اداروں کے تمام تر کثیر مصارف برداشت کرنا سردست ناممکن ہے۔ لہذا مسلم یونیورسٹی کی اگر حکومت ہند سے اپنے تمام تر مصارف کے لیے کثیر رقم متواتر و غیر متواتر مالی امداد کی شکل میں حاصل کرنا ہے تو اس کو قومی ادارہ کے بلند درجے سے گٹا کر اقلیتی ادارہ بنانا غلط ہوگا۔ اقلیتی ادارہ بن کر یہ دانش گاہ ربر دست مالی بحران کا شکار ہو جائیگی۔ جس سے نہ صرف اس کی آئندہ ہونے والی ساری توسیع و ترقی مسدود ہو جائے گی بلکہ اس ادارہ کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا۔ یہ ادارہ مرکزی حکومت سے کثیر رقم حاصل کر کے ہی آج ترقیوں کی اتنی بلند منزل پر پہنچ چکا ہے کہ دوسری دانش گاہوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام کر رہا ہے۔ جذباتی تحریروں اور تقریروں سے یہ حقائق جھٹلائے نہیں جاسکتے۔

ایک مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کے کسی طرح منافی نہیں بلکہ یہ ملی اور ملکی دونوں اعتبار سے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ایکٹ کے مفاد کے بعد وقت خود اس بات کو ثابت کر دے گا۔ قبل از مرگ دادیلا کرنا صحیح طرز عمل نہیں۔ میری رائے میں ایکٹ کے مخالفین کو جذباتی جہان سے محفوظ رکھ کر حقیقت بینی سے کام لیتے ہوئے ایکٹ کے نفاذ کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔ زیر بحث ایکٹ میں مجھے کہیں یہ بات نہیں نظر آتی کہ اس کے نفاذ سے مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں نہ پوری کئے گی۔

# پروفیسر سید احتشام حسین

صدر شعبہ اردو والدہ آباد یونیورسٹی

● میں کسی یونیورسٹی ایکٹ کو دیکھوں تو سب سے پہلے میری نظر اس پر پڑتی ہے کہ ایکٹ یونیورسٹی کے تعلیمی تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ تعلیم کے قومی معیار سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ تعلیم اور تدریس، تحقیق اور اجتہاد کی راہیں رکاوٹ تو نہیں پیدا کرتا؟ ملک کی تہذیبی اور جذباتی زندگی سے ہم آہنگی پیدا کر کے ارتقا کی راہ ہموار کرتا ہے یا نہیں؟ تعلیم حاصل کرنے کی آزادی کو سلب تو نہیں کرتا؟ علی گڑھ یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کو میں ان پہلوؤں سے مفید ترقی پسند اور معقول پاتا ہوں جس میں روایتوں کی توسیع کے پیاد بھی ہیں اور نئی راہیں تلاش کرنے کے تجربوں کی دعوت بھی۔ ایکٹ کا دوسرا مقصد ایک ایسے انتظامیہ کی تشکیل ہونا چاہیے جو تعلیمی مسائل کو سلجھائے، انہیں بروئے کار لانے اور پر سکون تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو، اصلاً تو یہ کام اساتذہ اور طلباء کے تعاون سے ہونا چاہیے۔ لیکن انتظامی ضروریات کے لحاظ سے کچھ اور عہدہ داروں اور انتظامی شعبوں کا وجود بھی لازمی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ اس حیثیت سے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں اساتذہ اور طلباء کو حصہ و صحبت سے اہمیت دی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وائس چانسلر کے انتخاب، سرکاری نامزدگیوں کی تعداد، وائس چانسلر کے اختیارات، چند ایسے مسائل ہیں جن پر مختلف رائے ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ وائس چانسلر کو اپنے اختیارات دینے سے نہ صرف اساتذہ کے اندرونی

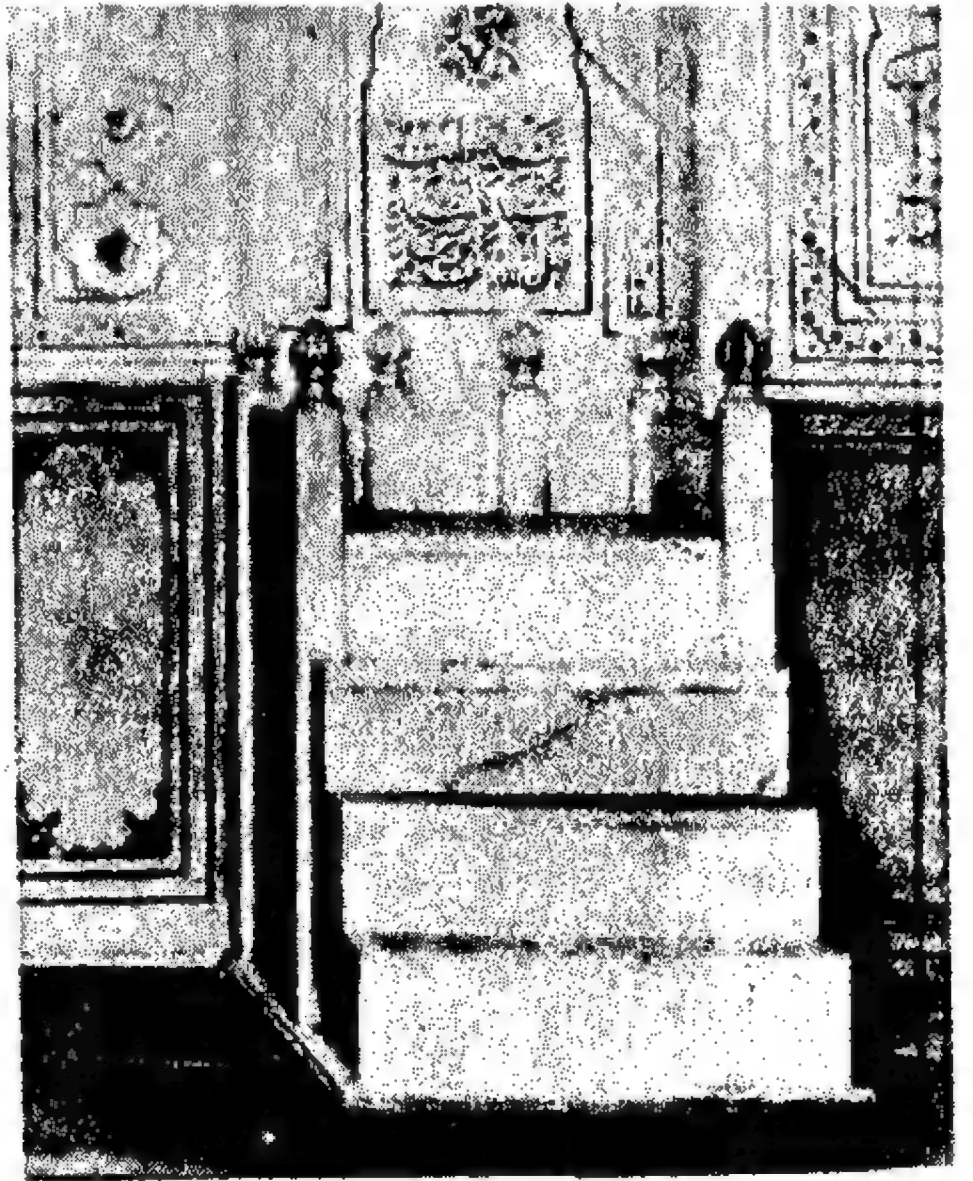
ایلی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

اختلافات بڑھ سکتے ہیں بلکہ خود وائس چانسلر کے درمیان میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور غیر معمولی احتیاط کے باوجود "مقامی شخص" اردو بھٹکتے رہیں گے، بھٹوڑے دن کے تجربہ کے بعد اگر ایکٹ کے اس حصہ کی ترمیم کی ضرورت پڑے تو اسے فی الفور انجام دیا جائے گا۔

● جو تحریک اس ایکٹ کے غلامت چلائی گئی وہ قطعاً غیر دانش مندانہ تھی۔ عوام نہ یونیورسٹی کی تعلیم سے واقف ہیں، نہ پرانے اور نئے ایکٹ کے فرق کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انہیں صورت حال سے آگاہ کیا گیا بلکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ دے کر ان کو اسلام کے بچانے اور سارے ہندوستانی مسلمانوں کے عزت و وقار، ان کے حقوق اور اختیارات کا تحفظ کرنے پر اکسایا گیا۔ ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ ایکٹ بالکل درست ہے، اس میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے اور جاری رکھنے پر کوئی پابندی مایہ نہیں کی گئی ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ اس ایکٹ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی وقار کو زخمی کیا گیا ہے اور وہ مذہبی وقار یہ ہے کہ کچھ لوگ، جن میں سے اکثر تعلیمی مسائل سے بے بہرہ ہوتے تھے، اب کورٹ کے ممبر بن سکیں گے۔ اس طرح یہ تحریک بالکل غلط راستہ پر چلی نکلی۔ اس کی قیادت یونیورسٹی کے اساتذہ یا ملک کے دانشوروں کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے ایسے سیاست دانوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی جن کا نقطہ نظر کسی ترقی پسندانہ اور علمی نہیں رہا ہے یہ بات

اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۵۶ء





مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد کا ایک گوشہ

ان نتائج سے بھی ظاہر ہے جو احتجاج کے غلط طریقے اختیار کر لے اور جذبات کو بے سوچے سمجھے بھرکانے سے روکنا ہوتے۔

● علی گڑھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو میں محض گزشتہ چند سالوں کے اندر پیدا ہونے والی تنگ نظری سیاسی صور حال کی ایجاد سمجھتا ہوں۔ نہ اس کا کوئی اقلیتی کردار سرید کے زمانے میں تھا اور نہ اس کے بعد۔ ہاں مدت دراز تک مخصوص انداز میں تعلیمی نظام چلاتے رہنے کی وجہ سے اس کی کچھ روایتیں ضرور بن گئی ہیں جو تاریخی اسباب کا نتیجہ ہیں۔ اسے اقلیتی کردار کہنا نہ صرف نامناسب ہے بلکہ یونیورسٹی کے پورے تعلیمی دھارچوں کو عام قومی ارتقاء سے الگ کرنے کی کوشش ہے۔ اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم و افکار کی جو تعلیم دی جاتی رہی ہے اور جس میں مزید اضافہ ہو گا وہ یونیورسٹی کو اقلیتی کردار عطا نہیں کر سکتی یہ معاملہ

مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کا نہیں نشر علم کا ہے، بہت سی غیر ملکی یونیورسٹیاں جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، اسلامی تاریخ، تہذیب اور علوم کی اعلیٰ تعلیم دیتی ہیں اور انہیں اسلامی یونیورسٹیاں نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ہے، جسے برقرار رکھنا چاہیے بلکہ یہ ایک طرح سے اس کے دائرہ عمل کو محدود کر دینے کے مترادف ہو گا۔

● میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ فکر گراہ نہیں کرنا چاہیے کہ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں کوئی ایسی تعلیم دی جائیگی جو اسلام کے اقلیتی مفاد کے خلاف ہوگی۔ ہم سب کافر ص ہیں کہ اسے جدید ہندوستان کی ایک ایسی قابل فخر یونیورسٹی بننے میں مدد دیں جس سے اسلامی علوم و افکار کی نشاۃ ہو۔ جسے اگر امتیاز حاصل ہو تو ایک اقلیتی یونیورسٹی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اعلیٰ پایے کی دانش گاہ کی حیثیت سے، جن کے فرزند مالی امتیاز حاصل کریں۔ جیسا کہ کہ چکا ہوں، ان تنظیمی پہلوؤں کو ستھوڑے دن تک برتنے کا موقع دینا چاہیے۔ جو تبدیلی سے پیدا ہوں گے، اگر وہ کالاً مد نہ ثابت ہوں اور ان سے تعلیم کی توسیع و ترقی میں دشواریاں نظر آئیں تو ان کے بدلنے یا ان میں ترمیم کرنے کی تحریک چلائی جاسکتی ہے۔

● یقیناً یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ان مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے گا جو اس میں تعلیم حاصل کریں گے۔ ہندوستان میں مسلمان سات کروڑ ہیں، ملک کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور بہت سی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ صرف علی گڑھ سے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات تو پوری نہیں ہو سکتیں اس لیے علی گڑھ سے سارے مسلمانوں کی تعلیمی تقدر کو وابستہ کرنا درست نہیں ہو گا۔





# ایک چارہ جے۔ بی۔ سی۔ پیلائی

میرے خیال میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے۔ یہ ایکٹ انہی خطوط پر بنایا گیا ہے جنکی نشاندہی گجندر گڈر کے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ذہن نے کی تھی۔ یہ ایکٹ اساتذہ اور طلبہ کو یونیورسٹی کی حکمت عملی میں سرگرم حصہ لینے کے کافی مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایکٹ یونیورسٹی کی نوجوان نسل کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے اور ان تمام باتوں کے ساتھ حسب سابق مذہبی تعلیمات کے شعبے بھی برقرار رکھے گئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ایک گروپ کی طرف سے ایک مقررہ تاریخ کو یو جی ٹی شروع کر کے کا اعلان بہت ہی غیر معقول بات ہے۔ آج کل یوم احتجاج منانے کا اعلان کرنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، وہ تباہی جسے لشکارِ صرف بے قصور عوام ہوتے ہیں، اور پھر اس فساد کا فرقہ دار رنگ اختیار کر لینا اور بھی بد نفسی کی بات ہے۔

اس ایکٹ کی ذمہ داری ہندو فرقہ پر کسی طرح بھی نہیں ڈالی جاسکتی۔ پھر بھی فساد یوں نے اسی فرقے کو اپنے عملوں کا نشانہ بنایا، ایکٹ بنا بنوالی حکومت ہے، وہ حکومت جسکو مسلمانوں کی غالب اکثریت نے گزشتہ انتخابات میں ووٹ دیا تھا۔ اتنی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ فرقے کا ایک مستقل گروپ سرکاری املاک کے نقصان پہنچائے۔ لیکن ہندو فرقہ پر حملہ کننا صرف بہت بڑی بد اخلاقی بلکہ براہِ ظلم ہے۔ اس قسم کے ای جی ٹی کے بڑے اثرات

ای جی ٹی میں صرف حصہ لینے والوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس سے پورا فرقہ متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ قومی یکجہتی بھی جسکی ہر فرقے کے نیک دل لوگ تمنا کرتے ہیں محض خواب و خیال بن کر رہ جائیگی۔

میری رائے میں یونیورسٹیوں کو طلبہ کی زندگی کے ہر اس پہلو سے دل چسپی لینی چاہیے جس سے ان کی عقل و فہم میں تیزی آئے اسی طرح مذہبی تعلیم بھی یونیورسٹیوں میں دی جانی چاہیے مگر اس طرح کہ اس سے انکے ذہن میں جلا پیدا ہو، اس سے جذبات برا نگینہ نہ کئے جائیں، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم وہ دینا چاہیے جو ذہن کو اوپل کرے، نہ کہ جذبات کو۔ آج دنیا کے اندر موجود مذاہب کی تمام مقدس کتابیں کسی خاص فرقے کی جاگیر نہیں ہیں، وہ طلبہ جو اپنے مطالعے کو کسی خاص مذہبی کتاب یا مذہب میں وہ پیدا ہوئے ہیں صرف اسی مذہب سے متعلق چند کتابوں تک محدود رکھتے ہیں۔ یقیناً وہ تنگ نظر سمجھے جائیں گے۔ بنی نوع انسان کی بہت بڑی اکثریت اسی مذہب کی پیروکار ہے، جس میں وہ پیدا ہوئی۔ حالانکہ وہ اس مذہب سے بہت کم واقفیت رکھتی ہے، ہمیں تسلیم کہ آپ کا مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اچھا ہے لیکن اس سے آپ کی شخصیت میں کیا عظمت آئی؟ آپ تو چونکہ اس مذہب پر پیدا ہوئے تھے اس لیے اس کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہاں اگر علی وجہ البصیرت آپ اپنے مذہب کو بہتر کہتے ہیں تو اس میں بلاشبہ آپ کی عظمت بھی روپوش ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بصیرت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے

جب آپ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کریں۔

میں اس بات کے حق میں ہوں کہ تمام یونیورسٹیوں میں مختلف مذاہب کی تعلیمات کا اہتمام ہو، اور ایک لڑکا جس طرح اپنے مذہب سے واقفیت رکھتا ہے اسی طرح دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت بہم پہنچائے۔ اور یہ طریقہ میری سمجھ کے مطابق اقلیت یا اکثریت کی مذہبی یونیورسٹیوں کی تمام خامیوں کا سدباب کر دے گا۔

ہندوستان میں مسلمان ہی واحد اقلیت نہیں ہیں بلکہ

یہاں عیسائی، بدھ، سکھ، جین اور پارسی بھی رہتے ہیں۔ کسی بھی اسٹیٹ کے لیے مذہبی بنیادوں پر ہر مذہب کیلئے ایک مخصوص ادارہ قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے، ایک سیکولر ملک اپنے فنڈ سے صرف ایک سیکولر ادارہ ہی چلا سکتا ہے۔ اگر کوئی فرقہ صرف اپنے مذہب ہی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے فرقے ہی کے خرچ پر چلانا چاہیے۔ پھر مذہبی تعلیم تو ایک کار خیر ہے اور ہر کار خیر اپنی دولت سے ہی انجام پاسکتا ہے۔

## ڈاکٹر حفصہ امام علیہ

میں دو طرح کے اثرات قائم کیے متقی اور مثبت — تحریک علیگڑھ کے تاریخی کردار کی یہ نوعیت نہ حیران کن ہے اور نہ ہی کوئی انوکھی چیز۔

موجودہ ہندوستان میں علی گڑھ یونیورسٹی نے ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیاتی بحالی کیلئے اہم ترین کردار ادا کیا ہے اور آزادی وطن کے دس سالوں کے اندر اندر اس یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک ایسی نئی نسل ابھر کر آئی جو ملک و قوم کی تعمیر نو کے عظیم کام میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ یہ یقیناً یونیورسٹی کا شہسوار اور تعریفی پہلو ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ مسلم یونیورسٹی خاص طور پر شہری علاقوں میں رہنے والی صرف ۲۷ فی صدی مسلم آبادی کی تعلیمی ضرورت کو ہی پورا کرتی رہی ہے جب کہ تمام ملک میں قائم ہونیوالے دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں نے نہ صرف شہری بلکہ دیہی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

علی گڑھ یونیورسٹی مسلمانوں میں بحیثیت تعلیمی ادارے کے ہی نہیں بلکہ مذہبی اور جذباتی وابستگی کی وجہ سے بھی عزیز ہے۔ یہ صفت یقیناً علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک سرمایہ سے کم نہیں لیکن اسی صفت کے باعث مسلم یونیورسٹی کو دوسرے حلقوں میں اکثر و بیشتر تعریف و توصیف اور طنز کا نشانہ بننا پڑا ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکسٹ کے سلسلے میں حالیہ بحث و متغیص اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

جدید ہندوستان کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں ابتدائی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر سید مرحوم نے راجہ رام موہن رائے کی رہنمائی کی تقلید کی اور جدید ہندوستان کی اور دیگر تحریکوں کی مانند تحریک علیگڑھ نے بھی ہمارے ملک

## ایڈیٹر سنگم غلام سرور

س۔ ۱۔ مسلم یونیورسٹی ایجنٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ قابل۔

س۔ ۱۔ انڈیا کے مسلمانوں کے ایک طبقے کی جانب سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلے میں چلتے جانے والے ایجنٹ کیسٹن آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ بعد محمد یحسین۔

س۔ ۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی کردار کے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج۔ بنیادی اینٹ۔

س۔ ۱۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ریگس مسلمانوں کے تعلیمی مفاد کو دھکا پہنچے گا؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

ج۔ دلاریب۔ اظہر من الشمس ہے۔

س۔ ۱۔ کوئی تجویز؟

ج۔ جدوجہد۔

س۔ ۱۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی جملہ تعلیمی ضروریات پوری کرنے کو کافی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ دوسری کون سی متبادل تجویز پیش کرتے ہیں۔

ج۔ حاشاؤ کلا۔ عمل پیہم

ہندوستان کی تعلیمی ضروریات بھی پوری کیں۔ اور ان تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء میں مسلم طلباء بھی شامل رہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط تک اس مسئلے پہلو کے نتیجے میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلباء کی اکثریت مغربی ادیرپوش کے شہری علاقوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اپنے مائیں کے عین برعکس مسلم یونیورسٹی میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آئیے مسلم طلباء کی تعداد اور ان کا تناسب بہت کم تھا۔ لہذا ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا سجا ہوگا کہ آج ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی کا وہ آل انڈیا کر دار ختم ہو گیا ہے۔ یہ چیز یونیورسٹی پر اثر انداز ہوتی ہے اور آج مسلم یونیورسٹی بہت سی وجوہ کی بنا پر مغربی یوپی کی شہری مسلم آبادی میں پائی جانے والی مشکلات اور ان میں پہلے ہوتے نظریات کا آئینہ دار بن گئی ہے۔

لہذا اگر یہ کہا جائے کہ جدید ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی اپنے ان منفی اور مثبت پہلوؤں کی بدولت اپنی پہلی جیسی اہمیت اور برتری کھو چکی ہے تو صحیح ہوگا۔ آج ۱۲ لاکھ کی شہری مسلم آبادی جو کہ ہندوستان کی مجموعی مسلم آبادی کا ۲ فیصدی ہے اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ہی انحصار نہیں کرتی بلکہ ملک کے دیگر تعلیمی ادارے بھی ان کی تعلیمی ضروریات کو پورے کر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یونیورسٹی کے شاندار ماضی سے قطع تعلق کر لیا جائے یا اس کے عظیم کردار سے تعلق کا اظہار کیا جائے بلکہ یہ تو ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔

بہر حال مسلم یونیورسٹی کی ابتدائی برتری اور اہمیت کے کم ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ یونیورسٹی کو اس کے رجم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور تاہی اس کا مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے مالی اعانت اور سرکاری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

امداد حاصل کرنا اور صرف ایک تعلیمی ادارہ بن کر رہ گیا ہے اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایک ہندوستانی مسلمان کے یونیورسٹی سے جذباتی لگاؤ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دراصل ضرورت اس چیز کی ہے کہ وقت کی ضروریات کے پیش نظر آج یونیورسٹی کی نئی لائنوں پر تنظیم کی جانے تاکہ یہ اپنا



# وام گوپال ایم، ایل، سی

مسلمان ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، ان کے اس مطالبہ پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جاتے کہ یونیورسٹی کے انتظام میں ان کو مناسب حصہ دیا جائے۔  
وام گوپال ایم ایل سی  
ای کے ڈی، لکھنؤ، ۱۰ جولائی

تاریخی کردار بدستور انجام دیتی رہے۔ میری طرح علیگڑھ کے اور دوسرے پرانے طلباء اپنی درس گاہ کی اس عظیم روایات پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری درس گاہ نے ابتدا سے لیکر آج تک وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔

یہ ایک اہم اور بنیادی تقاضہ ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ اپنی تحقیق و تدریس اور تعلیم کا اعلیٰ معیار برقرار رکھے اور اس کے معاملات نہ صرف انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں جو کہ اس سے براہ راست وابستہ ہیں یعنی طلباء اور اساتذہ۔ اور اس کے علاوہ یہ سوسائٹی کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے خوش آئند اثرات قائم کرے یہی وہ اسباب ہیں جو کہ ایک یونیورسٹی کو بناتے ہیں اور اس کا کردار متعین کرتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۴۷ء کی اصلاحات اس سمت میں راہ ہموار کرتی ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی یقیناً ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہے جس کے آئین و قوانین ایک کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہیں۔ گجندر گڈر کمیٹی کی سفارشات میں ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارہ کو جمہوری بنانے کیلئے اقدام کیے گئے ہیں اور ان اداروں میں تعلیم و تحقیق

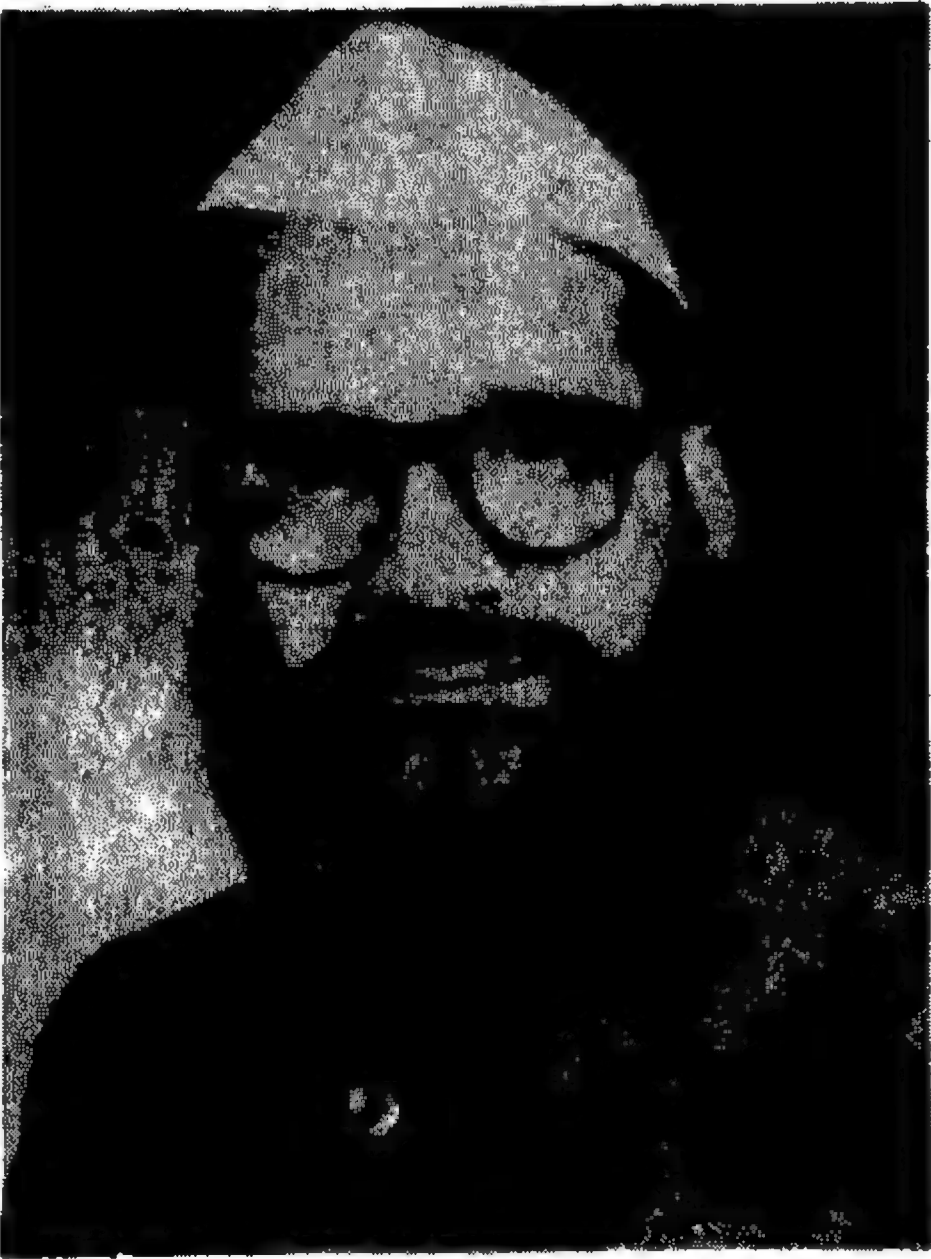
۲۷۰ اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۰۷ء

کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ صرف ان سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہیے تو یہ تھا کہ مہمان علیگڑھ اس ایکٹ کو خوش آمدید کہتے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا تاریخی کردار اسی حالت میں بدستور انجام دے سکتی ہے جبکہ یہاں تعلیم اور ریسرچ کا ایک اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے اور اس کے انتظامیہ کو جمہوری بنایا جائے۔ اس بل میں یونیورسٹی کے اقامتی کردار کو برقرار رکھنے کے علاوہ یونیورسٹی کے انتظامیہ میں طلباء کی شمولیت کی گنجائش رکھی گئی ہے اور یونیورسٹی کے انتظام و انصرام اور منصوبہ بندی کے معاملات میں اساتذہ کی اکثریت اور تعلیم و تحقیق کے نئے مرکز قائم کرنے اور نئے کورس شروع کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایکٹ کے یہ پہلو یقیناً یونیورسٹی کیلئے خوش آئند ہیں۔ اگر یونیورسٹی علوم مشرقیہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا چاہتی ہے تو اس پر کوئی بندش عائد نہیں کر سکتا۔ لہذا میرے خیال میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی کردار کو برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ پورے ہندوستان میں یہ ایک مثالی یونیورسٹی بنے اور اپنی اعلیٰ تعلیم و تحقیق سے ملک کی سیکور سوسائٹی کو مضبوط کرے۔

ظاہر ہے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا یہ تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہیں کر سکتی اگر اس کو صرف مسلمانوں کا ہی تعلیمی ادارہ قرار دیا جائے یا پھر مسلمانوں کی شہری آبادی اور وہ بھی خاص طور پر مغربی اتر پردیش کی مسلم آبادی سے وابستہ رکھا جائے۔ دراصل اس وقت یونیورسٹی کے لیے مسئلہ یہ ہونا چاہیے کہ دیہاتی علاقوں میں رہنے والی ۳۷ فی صد مسلم آبادی کیلئے اس کے پاس دینے کو کیلئے اور یہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں غیر مسلم طلباء کے ساتھ کس طرح امتیاز برت سکتی ہے جبکہ یہ یونیورسٹی اپنی ابتدا سے لے کر

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی خبر



آج تک ہر قسم کے مذہبی تعصب اور امتیاز کے خلاف رہی ہے۔  
اس ایکٹ کے خلاف شور و غل اور بحث و مباحثہ کی  
فعا میں بنیادوں پر تیار کی گئی ہے وہ سراسر غیر تعلیمی ہیں۔  
ایکٹ کی مخالفت میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں پہلی یہ کہ  
بمبھیت تعلیمی ادارے کے اس کا اقلیتی کو دار تبدیل ہو  
جائے گا کیونکہ یونیورسٹی کے انتظامی اور انصرامی معاملات  
اور کورٹ میں معطیان اور قدیم طلباء کی انجن کی تائیدگی  
کم کر دی گئی ہے۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایکٹ میں مسلم یونیورسٹی  
کو ایک مسلم ادارہ اعلان ذکر کے مسلم قوم کے ساتھ انصافی  
کی گئی ہے اور پارلیمنٹ نے اس پاس کر کے اقلیتوں کے  
حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔

اس سے پیشتر کہ ان دلیلوں کے حسن و قبح اور نقائص  
پر غور کیا جائے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ان دلیلوں کا یونیورسٹی  
کے تعلیمی کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی بمبھیت  
تعلیمی ادارے کے یونیورسٹی کے کردار پر توجہ دلائی گئی ہے،  
جیکہ ان دونوں دلیلوں سے یونیورسٹی کی کارکردگی اور اس  
کا معیار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہر حال ایکٹ کی  
مخالفت کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اتنی اہم چیز کا نظر انداز  
کر دیا جانا کوئی حیران کن چیز نہیں ہے۔

ایکٹ کے مخالفین کی پہلی دلیل اس غیر واضح اور  
بہم مغز منہ پر قائم ہے کہ کسی یونیورسٹی کے کردار کا تعین  
اس کے مشن کے مذہبی رجحانات سے ہوتا ہے۔ یہ ایک  
سراسر غلط خیال ہے، جبکہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں  
ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ اور علوم مشرقیہ  
کی تدریس کیلئے عیسائی اساتذہ کا تقرر ہوا۔ اسکے علاوہ  
یونیورسٹی میں غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کی ایک اہم نمائی  
تعداد اس حقیقت کا ایک سادہ سا ثبوت ہے کہ کسی یونیورسٹی

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اخبار

## مولانا اسحاق سبلی ممبر پارلیمنٹ

مسلم یونیورسٹی کو مسلم کلچر کا سینٹر بنانا ضروری  
ہے صرف نام میں لفظ مسلم سے کام نہیں چلے گا۔  
بڑے شوق سے علی گڑھ سے مسلم اور بنارس سے ہندو  
کا لفظ نکال دیجئے۔

(اقتباس پارلیمنٹ کی ایک تقریر سے)

کے کردار کا تعین اسکے طریقہ تعلیم سے ہوتا ہے گھنڈر گڈ کرکشی  
کی سفارشات میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ  
فلسفہ اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن کی تعلیم و تدریس  
کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا  
گیا ہے کہ نہ صرف اس معیار کو برقرار رکھا جائے بلکہ اسکو  
نزد فرسٹ دیا جائے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کا ایک خاص کردار

ہے جو ہر حال میں برقرار رکھا گیا ہے۔

آج حالات یکسر بدلے ہوئے ہیں اور ان حالات میں مہلا کو ن معطیان کی خصوصی نمائندگی کیلئے کوئٹا ہوگا۔ مزید یہ کہ آج کتنے مسلمان موجود ہیں جو یونیورسٹی کی انتظامیہ میں بطور معطی ایک سیٹ خریدنا چاہیں گے اور جہانگیر علیگڑھ کے قدیم طلباء کی انجمن کی نمائندگی کا سوال ہے اسکو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ مناسب اور موزوں نمائندگی دی گئی ہے۔

بہر نوع اس مسئلہ کے پس پشت یونیورسٹی کے انتظامیہ میں مسلمانوں کو اکثریت اسلئے دلانا مقصود ہے کیونکہ انہوں نے اپنے خون پیسے سے اس کو تعمیر کیا ہے یہ حالتنا ایک افلاک دہلے جیسو اگر بغرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا کوئی آخر نہیں ہوگا، لال قلعہ، تاج محل وغیرہ کی مانند علیگڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ہمارے قومی ورثے کا ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ اس طرح کی کوئی بندش نہیں لگائی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم کے حصول کے لیے علیگڑھ نہ بھیجیں اور یہی یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ کوئی مسلمان اس کا داتس چانسز نہیں بن سکتا یا اس کی فیکلٹی کا کوئی مسلم ممبر اس کی انتظامیہ کمیٹیوں کا ممبر نہیں بن سکتا۔

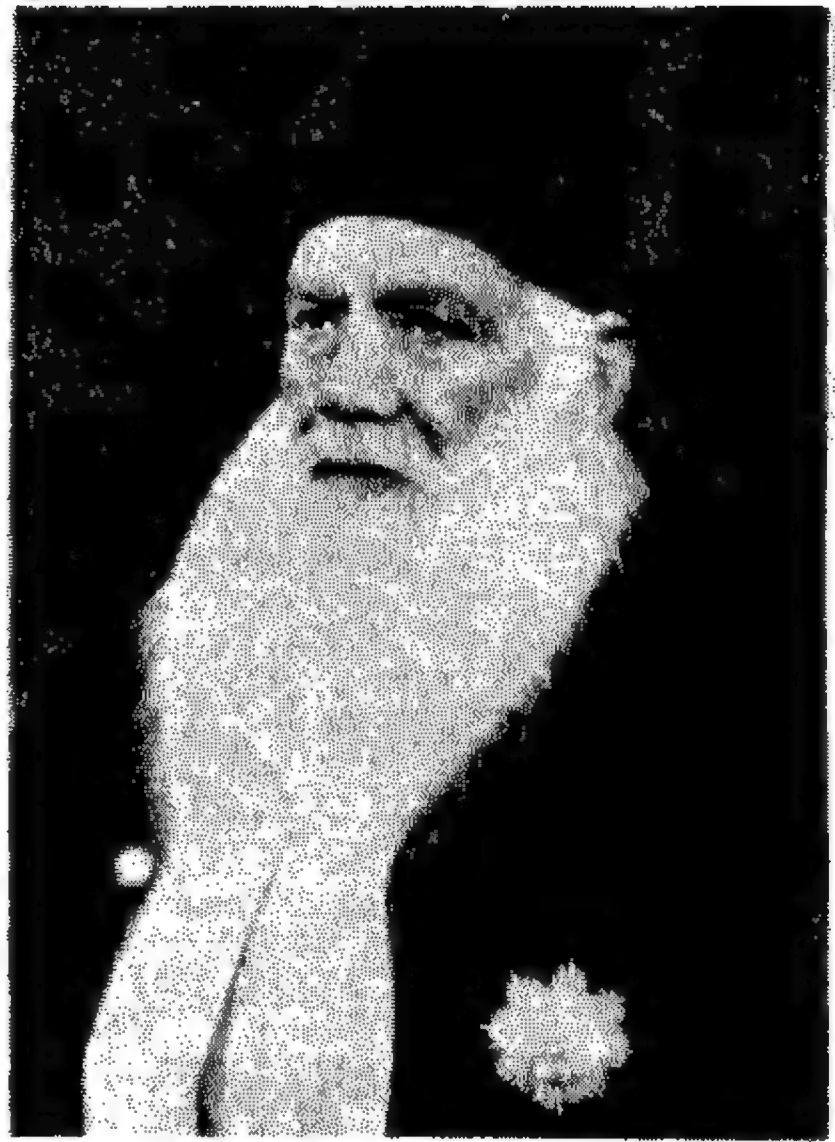
اس ایکٹ کی مخالفت کے سلسلے میں دی جانوالی دوسری دلیل ہمارے ملک کے سیاسی، سماجی ڈھانچہ میں اقلیتوں کو دئے گئے حقوق سے متعلق ہے اس سلسلے میں آئینی طریقوں کی بحث میں پڑنا فصول ہے اور یہ موجودہ مسئلہ سے غیر متعلق بحث ہوئی۔ بس مختصر یہی کہنا کافی ہوگا کہ ہمارے آئین میں لفظ اقلیت کی کہیں بھی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ آئین میں ہر صورت میں تمام شہریوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین اس بات

کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی بھی شہری کوئی ادارہ قائم کر سکتا ہے اور اس کا انتظام و انصرام کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ آئین حکومت کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی ایسے ادارے کی جو کہ صرف کسی ایک خاص طبقے یا جماعت کی خدمت کرنا چاہتا ہے مالی امداد کرے۔ لہذا علیگڑھ کو ایک اقلیتی ادارہ قرار دینے کا مطالبہ کرنا سراسر غلط ہے۔ جس کی کوئی بھی حکومت تعمیل نہیں کر سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں دراصل ان کے اپنے کچھ ذاتی مفاد ہیں جو وہ جمہوریت بچاؤ کے خوبصورت نعروں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

ایکٹ کے مخالفین کے نقطہ نظر کو بطور سمجھنے کی کوششوں کے باوجود انکی مخالفت کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ماسوائے اس کے کہ ایکٹ کی مخالفت میں ان کا مفاد پوشیدہ ہے یا اس کے پس پشت کچھ اور عناصر کار فرما ہیں۔ اس طرح اس بل کے مخالفین اپنی کم فہمی اور تنگ نظری کی بدولت نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بلکہ خاص طور پر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو اس امر کا یقین کر لینا چاہیے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود ان کے مسائل کے حل کا ذریعہ نہیں ہے۔ آج ان کے سامنے بے انتہا اہمیت کے مسائل درپیش ہیں جن کو حل کر نیے لیے انہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ان حالات میں اس ایکٹ کی جو یونیورسٹی کے لیے یقیناً بہتر ہے، مخالفت کرنا بے معنی ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو اپنا کام کرنے دیا جائے وہ عظیم کام، جو اس نے ماضی میں انجام دیا ہے اور مستقبل میں بھی انجام دینا ہے۔





کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور ذوق نمود کی ایک شکل وہ تحریک تھی جو "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے اس عام دور بیداری کا ایک جزو تھی جسے کبھی کبھی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہر گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے یہ دور تغیر ہندوستان کی کسی اور تحریک سے مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ اگر کہہ سکیں تو "نشاۃ اولین" تھا جسے عام گفتگو میں "دور جدید" کہتے ہیں۔

اب اگر ہم علی گڑھ تحریک کو ایک بڑی تحریک کا "جزو" قرار دیتے ہیں تو منطقی زبان میں گفتگو کرنے کے لیے ہمیں "کل" کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ جاسکے اور محرکات کے سرچشموں کا پتہ چل سکے۔ عمرانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس دور بیداری اور تہذیبی یک کی بنیادوں کا

انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے ترقیوں اور اٹھارویں صدی کا زائیدہ تھا لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح یہ تو فاصلے ارتقائی، خطہ مستقیم کی طرح سیدھا۔ روایتوں کی سخت جان، تہذیبی اثرات کے اختلاط، معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے ایسے پیچیدہ مرکب اور متضاد عناصر پیدا کر دیے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے حلقے بن گئے تھے جو زوال پذیر معاشی مدول کے اندر اپنے بجاری رکھتے تھے۔ یہ ہل چل اور اضطراب بننے اور بگڑنے کی یہ جدوجہد اور کشمکش بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا، کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی بگاڑنے کا غم اور خون اور بنانے کا احساس اور دلولہ تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے کچلے ہوئے اربابوں اور خواہوں، شوق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں

مطالعہ ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ، تعلیمی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی تاریخ کے تمام پہلوؤں کے مطالعہ پر مبنی ہے، اسی لیے اس کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس مختصر مقالے میں علی گڑھ تحریک کی تاریخ، اس کی وسعت یا اس کے اثرات مابعد سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے اور عہد جدید کے دو بار اولین میں ایک انقلاب خیز اور عہد آفرین قوت بن جانے کا تجزیہ ہے۔ تجزیہ خیالوں کا بھی ہوتا ہے اور مادی حقائق کا بھی، لیکن اولیت مادی حقائق ہی کو حاصل ہوتی ہے کیوں کہ خیال کے دائرہ عمل کے لیے رمان و مکان کے حدود لازمی ہیں۔ انہیں حدوں کے اندر رہنے، انہیں چھو لینے یا ان سے باہر نکلنے میں خیال، خیال بنتا ہے۔ اس لیے پہلے حقائق کی مادی بنیادوں کو سمجھنا چاہیے تاکہ وہ تصورات بھی سمجھ میں آسکیں جو ان کا عکس ہیں۔ اس طرح جو خیالات وجود میں آتے ہیں وہ مادی حقائق کو بدلنے یا بہتر بنانے میں معاون ہوتے ہیں لیکن ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے انہیں گرفت میں لانا بھی بہت آسان نہیں ہے کیوں کہ مسلسل حرکت ان کو بدلتی اور دوسرے حقائق سے ان کے رشتے میں تغیر پیدا کرتی رہتی ہے۔ کوئی شخص جو تغیر لانے والے تمام اہم عناصر پر نگاہ نہیں رکھتا اور ان عناصر کے منفی اور مثبت رشتوں کو سمجھنے میں ایک مروض نقطہ نظر اختیار نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح توجیہ نہیں کر سکتا۔ واقعات کے آگے بڑھنے میں رشتوں کی ترتیب بدلتی ہے بعض عناصر کی نفی ہو جاتی ہے، بعض نئے عناصر داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح حقیقت اپنے مادی مفہوم میں نئی ہو جاتی ہے اور خیالوں کے لیے نیا مواد فراہم کرتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس مختصر تمہید کی ضرورت تھی کیوں کہ ہر تحریک ایک مسلسل تہذیبی عمل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں قدموں کی آرائش ہوتی ہے اور نتائج کے لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس نے نئے حالات کی طرف رہنمائی کی وہ تاریخی واقعات کی وہ ترتیب ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں رونما ہوئی اور جو خود گزری ہوئی صدیوں کا خمار اپنے وجود میں رکھتی تھی۔ مختصراً اس کی شکل یہ تھی کہ ہندوستان میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی جو ایک مفہوم میں تو ضرور اسلامی حکومت کہی جاسکتی تھی، لیکن درحقیقت وہ دنیا کی ہر اس حکومت سے ملتی جلتی تھی جس کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے جس میں کسی نہ کسی شکل کی جاگیر داری، باجگذاری یا ایسا ہی نظام ہمارے وجود میں آتا ہے۔

سولہویں صدی میں مغل حکومت کے قیام سے لے کر اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ کے حملے تک، یعنی دو صدیوں سے زیادہ تک ہندوستان بیرونی مداخلت سے آزاد رہا۔ پھر اندرونی انتشار بھی شروع ہوا اور بیرونی حملے بھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت کمزور ہو رہی ہے۔ اندر وہ قومی عناصر مختلف شکلوں میں ابھر رہے تھے جنہیں دے دے رہنا پڑا تھا یا مختلف ذرائع سے جنہوں نے کسی علاقے میں اپنی معاشی تنظیم کر لی تھی۔ اگرچہ بعض مورخین نے اسے مسلمان حکومت کے خلاف ہندو قوم کی بیداری کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی یہ نوعیت نہیں تھی۔ انفرادی طور پر یہ خیالات کچھ لوگوں کے یہاں پائے جاتے رہے ہوں تو وہ بات ہے وہ قومی سطح پر ان کی حیثیت ضرور وارث

یا مذہبی نہیں تھی۔ اندرونی کشمکش نے یہ شکل بعد میں اختیار کی۔ خالص تاریخی نقطہ نظر سے اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جس نئی طاقت نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی وہ انگریز تھے جو امریں کی طرح ہندوستانی زندگی پر چھلے جارہے تھے اہمیت کا مرکز ثقل اب مغل حکومت نہیں تھی، نہ بنگال نہ اودھ نہ مرہٹے، نہ نظام، نہ مسورہ سکھ اور نہ کوئی اور اب سیاسی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی حقیقی طاقت رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کے اولین نصف حصے میں بڑی بڑی تاریخی تبدیلیاں نہیں ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ ساری قوت انگریزی کمپنی کے ہاتھوں میں سمٹی گئی اس قوت کا سرچشمہ اگر صرف اندرونی لڑائیوں اور ان میں ہونے والی فتوحات کو قرار دیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیوں کہ اس طرح کی لڑائیاں اور خانہ جنگیاں پہلے ہی ہوتی رہی تھیں لیکن ان سے ہندوستان کا معاشرتی نظام اس طرح نہیں بدلتا تھا کہ توازن قوت میں اس کی وجہ سے فرق آجائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں بالکل نئی نوعیت رکھتا تھا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انگلستان کا اقتصادی نظام کیا تھا، ہندوستان کے نقطہ نظر سے جاگیردارانہ نظام ٹوٹ رہا تھا۔ دیہی معیشت جو صدیوں سے انقلاب کے ہر پہلو کو برداشت کرتی آئی تھی، متغیر ہو رہی تھی، تھوڑی بہت دستکاری اور صناعتی جو کسی بڑے صنعتی سانچے میں نہیں دھل سکتی تھی ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کچے مال کی منڈی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سرمایہ داری سے شروع کیا تھا اور دوسری بیرونی سرمایہ دار کمپنیوں سے مقابلہ کر کے ہندوستان میں برطانوی استحکام کی تکمیل کی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

خود برطانیہ کا صنعتی انقلاب کس حد تک ہندوستان کی دولت اور انقلاب پیداوار کا رہن منت تھا اور کس حد تک وہاں کی رفتار ارتقاء کا نتیجہ تھا یہ بھی برطانیہ کی سماجی تاریخ کا ایک اہم سلسلہ ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی صنعت کو ختم کر کے اس کی ترقی کی فطری رفتار کو بھی روک دیا یہاں کے بادشاہوں، لوہوں، امیروں اور حاکموں کا یہ حال تھا کہ وہ زوال کے دلدل میں پھنسے ہونے کی وجہ سے نہ صرف میدان جنگ میں شکست کھا رہے تھے بلکہ اقتصادی بساط پر بھی ہار پر ہار مانتے جاتے تھے۔ زرخشی کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اس کی تاریخ بیان کرنا مقصد بھی نہیں ہے، صرف ان نتائج پر نظر ڈالنا ہے جو یہاں کے معاشی اور اسی کے اندر ہو کر تہذیبی ارتقاء پر اثر انداز ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد معاشی استحصال کے نقطہ نظر سے دنیا کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے مکمل طور پر جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کو ختم کر دیا ہوتا تو ہندوستان ترقی کی راہ میں کئی قدم آگے بڑھ گیا ہوتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے ان کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر برقرار رکھا تاکہ ان کے ذریعہ سے بھی استحصال ہوتا رہے۔ کاشتکاری جس سے ملک کا ایک بڑا حصہ وابستہ تھا، تباہ ہوئی کیونکہ ایک طرف تو حاصل کا بوجھ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا دوسری طرف اس کی وصولیابی میں فوجوں نے وہ مظالم اور بے اعتدالیاں کیں جن کی کوئی مثال نہ ملے گی نتیجہ یہ ہوا کہ زمینوں کی زرخیزی ختم ہو گئی اور بہتر نظام حرفت اور کاشتکاری وجود میں نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور زمینداری اس لیے



برقرار رکھی گئی کہ وفاداروں کا ایک گروہ ہر وقت سدھ کے لیے موجود رہے۔

کاشتکاری کی اس اتری کے ساتھ صنعتوں کی اتری بھی ہوئی۔ گویا ہندوستان اس حالت میں پہنچ گیا جہاں تباہی اور افلاس کی ساری صورتیں بھیا نک شکل میں نمودار ہو گئیں۔ یہ معاشیات کے طالب علموں کے لیے ایک بحث طلب مسئلہ ہو سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصال سے پہلے ہندوستان میں جو صنعتی ترقی ہوئی تھی وہ مشینی دور کی صنعتی ترقی سے کس قدر مختلف تھی، یا یہ کہ اگر ہندوستان کو اپنے ہی حل پر چھوڑ دیا جاتا تو کیا اس میں صنعتی ترقی کی منزل اپنے فطری ارتقاء کے نتیجہ کے طور پر آ جاتی؟ لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے۔ کہنا صرف اتنا ہی ہے کہ یہاں کی صنعت جس منزل میں بھی تھی تباہ ہو گئی اور اس کی جگہ بہت دنوں تک مشینی صنعت نے نہیں لی۔ نتیجہ وہی ہوا کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی سرمایہ داری کی ترقی کے لیے روک دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کچھ بنے سا ہونے بن گئے اور معمولی طور پر سرمایہ داری یہاں بھی شروع ہوئی۔ یہ سرمایہ داری اپنی ابتدائی منزل میں برطانوی سرمایہ داری سے ٹکر لینے یا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی نگاہ کرم کے سائے میں رہ رہی تھی۔ یہ سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے انگریزوں کی ایجنٹ بن کر معمولی نفع پر خوش تھی اور انگریزوں ہی کے بل بوتے پر خود اپنے اہل وطن کو لوٹنے اور لوٹنے کا جرم کھلے ہندوں کر رہی تھی۔

اس طرح لوٹنے کے ساتھ ساتھ انگریز ملازمین اپنی ذاتی تجارت بھی کرتے تھے یا ہندوستانی جاگیرداروں نوابوں اور راجاؤں کے ٹھیکہ دار بن جاتے تھے اور عوام

اور جاگیرداروں کے درمیان واسطہ بن کر غیر معمولی لوٹ کھسوٹ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کمپنی کے پچاس ساٹھ روپے کے ملازمین جب چند سال کے بعد انگلستان واپس جاتے تھے تو وہاں لاکھوں کی جائداد خریدتے اور نوابوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ انگریزوں کے ریاچنٹ اور انگریز ملازمین آبرو داروں کی بے عزتی کرتے، ان کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور مارنے پیٹنے کے علاوہ انہیں خوب ذلیل کرتے۔ اس سلسلے میں بڑے اور خوں ریزیاں بھی ہوتی تھیں لیکن دشواری یہ تھی کہ ہندوستانی عدالتیں انگریزوں کے خلاف مقدمہ کی سماعتیں کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ دہلی عیسائی تک ہندوستانی عدالتوں کی زد میں نہیں آتے تھے۔ اس کے خلاف راجہ رام موہن رائے اور دوسرے لوگوں کے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

حکومت کی توسیع کے ساتھ انگریزوں کا یہاں اقتدار ہندوستان کے ہر طبقے کو کمزور اور تباہ حال بنا رہا تھا۔ خواص سے لے کر عوام تک سب مادی حیثیت سے پست اور پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی انہیں اپنی چند مذہبی اور اخلاقی قدریں عزیز تھیں، جن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور گویا انہیں کے ذریعے زندہ رہنا چاہتے تھے، لیکن برطانوی اقتدار نے آہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ سو لہویں صدی ہی سے شروع ہو چکی تھی اور عیسائی بنانے والے پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی مشن بڑے جارحانہ انداز میں کام کر رہے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں چرچ قائم ہو رہے تھے اور یہاں کی مختلف زبانوں کے ذریعہ مسیحیت کی بتری کا ڈنکا بجایا جا رہا تھا۔ مختلف مشن اپنے اپنے اسکول

اور تعلیمی ادارے بھی قائم کر رہے تھے اور افلاس کے بارے ہوئے ہندوستانی مختلف قسم کی مراعات کے لیے میں دین سیسی قبول کر رہے تھے۔

اس پر طرہ یہ ہوا کہ خود انگریزی حکومت نے اس مذہبی تبلیغ میں مدد دینا شروع کر دیا۔ انگریز فوجی افسروں نے فوجوں کے اندر عیسائیت کی تبلیغ کی ابتدا کی اور کپنی بہادر کے ملازم مسیح کے سپاہی بن کر مذہبی جہاد میں مصروف ہو گئے۔ فوجوں میں مہدوں کی تبدیلی کا انحصار بہت کچھ مذہب کی تبدیلی پر رہ گیا اور یہ تحریکیں ایسی نہ تھیں جس کا شکار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں۔ مشن کے پادریوں کو عام اجازت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً فوجی چھاؤنیوں اور بیرکوں میں جا کر دین مسیح کی خطبیاں بیان کریں اور تبدیلی مذہب پر دینی اور دنیوی نفع کی بشارت دیں۔

یہ تو ایک مشہور حقیقت ہے کہ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مشن اسکولوں کا جال بچھ رہا تھا لیکن انیسویں صدی کی ابتدا ہوئی تو انگریز حکام انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں رولہیم بکٹیس اٹھ گھڑی جوہنس ایک تو یہ کہ انگریزی کی تعلیم دی جائے یا زدی جائے دوسری بحث تھی مذہبی تعلیم کے بارے میں۔ اب تک جو کالج مشرقی علوم کے لیے جاری تھے ان میں انگریزی کے درجے بڑھ رہے تھے لیکن انگریزی تعلیم کو پوری طرح جاری کرنے کے متعلق بحث مباحثے جاری رہے۔ سرکاری اسکولوں میں براہ راست مذہبی تعلیم کے متعلق البتہ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اجازت نہیں دی لیکن اس کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنے برابر نہیں پہنچنے دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر

مذہب سے اصلاح مولوی عبدالحق نے سر سید احمد کی زندگی ہی میں ہم لکھے ہو کالج میں اخلاقیات اسلئے وہ مسلمانوں کے اس اہم کام کے بانیوں کے جذبہ ایثار اور اخلاص سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ سر سید مسعود نے وائس چانسلر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دی ہے تو انہوں نے ۵ مئی ۱۹۲۲ء کو سر سید سحر کو ایک خط لکھا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

مخدوم بلندہ، تسلیم

میں نے پہلے پہل جب اخبار میں آپ کے استعمال کی خبر سنی تو مجھے یقین نہ آیا۔ اسی لمحے میں نے تار دیا۔ لب آپ کے جواب سے اس کی تصدیق ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ایک روز یہ ہونے والا ہے۔ زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ ان کے افراد میں حسد کا مادہ بہ حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو کھاتا پھتا خوش حال یا مستاز نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کر کے نام حاصل کرے خواہ وہ کام انہیں کے فائدہ کا کہوں نہ ہو۔ آپ نے جب سے پروانگی گلدگی اور خرابی کو رفع کرنا پروانگی بھناسی کے داغ مٹا کر ہونہور سگی کو نہک نام کرنا، جگہ جگہ سدر کوکے لاکھوں روپے جمع کرنا، ملک مہن اور گورنمنٹ میں اس کے رسوم اور وقار کو بڑھانا شروع کیا تھا، آپ کے استعمال کی بلعاد اسی وقت پوکٹی تھی۔ ٹوڈ لڈ نے کمیشن میں کیا خوب کہا تھا کہ، ”مشرق میں کام کرنا گناہ ہے اور میں نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے،“ مشرق کی جگہ اکثر ملی گروہ کہا جائے تو آپ کے حال پر یہ مقولہ پورا صادق آتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ سارے ملک میں ایک قومی گھر ہے اور وہ سازشوں کا گھر بنا ہوا ہے۔

حادم عبدالصق

زیادہ تر ہندوستانی عیسائی ہو گئے تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہندوستان کا وہی حشر ہوگا جو امریکہ کا ہوا یعنی ہندوستان پر حاکن قبضہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں کا یہ خوف ٹھیک تھا یا غلط اس سے بحث نہیں لیکن ہوا یہ کہ براہ راست مذہبی تعلیم دینے کے بجائے انگریز ماہرین تعلیم نے انگریزی علم و ادب کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنا چاہا۔ اس کی تفصیلات سیکڑوں کتابوں میں مل جائیں گی لیکن اس سلسلے کا انقلاب انگیز اقدام وہ تھا جس کی تکمیل لارڈ میکالے کے ہاتھوں ہوئی انگریزی زبان میں تعلیم دے جانے کے متعلق میکالے نے اپنی مشہور رپورٹ میں لکھا کہ ”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“ یہ الفاظ غیر مبہم ہیں لیکن مسکائے کے دل میں جو کچھ تھا وہ اس رپورٹ میں نہیں بلکہ اس خط میں تھا جو اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا اور جس میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی دانا ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا، بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو محمد ہو جاتے ہیں، یا دین عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں

دونوں نے مختلف شکلوں میں اس کے خلاف احتجاج کیا کیوں کہ آہستہ آہستہ یہ طے ہو گیا کہ سرکاری ملازمتوں میں انگریزی جاننے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ قدیم مشرقی علوم بالکل بے معنی اور بے سود ہوتے جا رہے تھے اور ان کی طرف سے بے اعتنائی برصغیر ہی تھی دوسری طرف نئے علوم اور انگریزی تعلیم مذہب اور اخلاق کے لیے خطرہ بنے جا رہے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ نئی تعلیم نے مادی اور روحانی زندگی میں شدید کشمکش پیدا کر دی تھی۔ سارے مادی مسائل چھین لینے کے بعد ہندوستانیوں سے ان کا مذہب بھی چھینا جا رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسے احکام بھی فوجوں میں نافذ ہوتے تھے کہ فوج کے سپاہی ماتھے پر کوئی نشان نہ لگائیں، ڈاڑھیاں منڈائیں اور کان میں کچھ نہ پہنیں۔ اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی ہوئیں۔ اس تعلیم سے بہت سے انگریزی حکام اور ماہرین تعلیم کی یہ امیدیں وابستہ تھیں کہ اس سے تمام ہندوستانیوں میں مذہبی اخلاق اور برطانیہ سے وفاداری کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو مٹاشی اور اقتصادی نظام وجود میں آ رہا تھا اس میں یہ جذبات دیر پا نہیں ہو سکتے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق کر کے معاملات کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ بہت دنوں تک مسلمانوں نے جدید نظام سے فائدہ نہیں اٹھایا کیوں کہ ان کے خیال میں وہ روایات اور ضروریات کے خلاف تھا۔ انگریزی حکومت میں تعلیم حاصل کرنے اور ملازمتیں اختیار کرنے کا مسئلہ علماء کے یہاں زیر بحث تھا اور جب تک اجتماعی طور پر کوئی نقطہ نظر دلوں میں گہر کرے، مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوتے گئے۔ ان کو جو



مذہبی تعلیم ملتی تھی وہ بھی اوقات کے ضبط ہو جانے کی وجہ سے کم ہوتی گئی۔ یہی نہیں تھا بلکہ جو مسلمان انگریزی پڑھ بھی لیتے تھے بعض اوقات انھیں صرف اس بنا پر نوکریاں نہیں دی جاتی تھیں کہ وہ مسلمان ہیں یہ صورت حال پہلے بھی تھی لیکن غدار کے بعد اس نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ ان کی زندگی دشوار ہو گئی اور بقول ڈاکٹر ہنزارچہ کے مسلمانوں نے اس قسم کی عداوت پیش کی۔

”جمیٹ و فادار علیا حضور ملک معظمہ ہیں سرکاری ملازمین پالنے کا یکساں حق ہے۔ اصل یہ ہے کہ اولیہ کے مسلمان اس قدر نہیں دیے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشہ کے اعتبار سے غریب، سرکاری سرپرستی سے محروم، ہماری حالت ان پھیلوں کی مانند ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ حضور ملک معظمہ کے قائم مقام ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں سے فارغ ہونے کے بعد ہم مغربی ادویات کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر ہمیں روپیہ یا ہوا کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور ساہیوال کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں۔“

یہی حال کم و بیش اور علاقوں کا تھا۔ ایروں اور غریبوں کی حالت تو خراب تھی ہی، وہ متوسط طبقہ بھی مصیبت کا شکار ہو گیا جو نئے حالات میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی کیا حالت تھی اور انگریزی اقتدار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

نے اس میں کیا و بچہ دیاں پیدا کی تھیں اس کا کچھ اندازہ مندرجہ بالا صفحات کے مطالعہ سے ہوا ہوگا۔ لیکن یہ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اوپر پہلوؤں میں بھی رنگ نہ بھرا جائے۔

انگریزی حکومت کی برکتوں میں جو چیزیں ملنی جاتی ہیں وہ سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظر انداز کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ انگریزی عہد ہی میں ہندوستان ریل، تار برقی بجلی اور پریس سے آشنا ہوا۔ ہندوستان ریاضی، ہیئت، نجوم، ہندسہ، فن تعمیر وغیرہ میں صدیوں سے ترقی کی غیر معمولی منزلیں طے کر چکا تھا۔ ذریعہ حل و نقل میں ڈاک اور خبر رسانی میں اپنے طور پر دنیا کے بہت سے ممالک سے آگے تھا، لیکن مشینی ایجادات اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے اسے دوسروں کا دست نگر ہونا پڑا۔ جہاں تک پریس کا تعلق ہے اگرچہ ہندوستان میں پرنٹنگائیوں نے اس کا استعمال سولہویں صدی ہی میں شروع کر دیا تھا لیکن عام ہندوستان اس سے بالکل بے خبر تھے۔ برطانوی اثر کے ماتحت کلکتہ اور بمبئی میں متعدد پریس اشعارویں صدی میں قائم ہو گئے، لیکن کلیساں اور سرکاری ضروریات کے باہر پریس کا اصل استعمال انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوا اور بعد کی ہندوستانی زندگی پر اس کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح بجلی، ریل اور تار برقی، جس نے مرزا غالب تک کی آنکھیں خیر کر دی تھیں، ہندوستان کے لیے عہد آفریں وسائل ترقی کے کہے جاسکتے ہیں۔ انگریزوں نے ان چیزوں کو اپنی ضروریات کے پیش نظر ہندوستان میں استعمال کرنا چاہا تھا لیکن ان سے جو فوائد مترتب ہوئے وہ عام تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈاکٹر کراؤڈ بہت

سے دوسرے انگریز حکام جس طرح انگریزی تعلیم کے اجرا سے خائف تھے کہ ان سے ہندوستانیوں کا ذہن یورپ کے جذبات قومیت اور احساس آزادی سے واقف ہو کر انہیں خود بیرون حاکموں کے خلاف استعمال کرے گا، اسی طرح وہ پریس کے عام ہونے سے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں اس کے ذریعہ سے کسی وقت انگریز دشمنی اور وطن پرستی کے جذبات کی اشاعت بڑے پیمانے پر نہ ہونے لگے۔ یہی حالات اور واقعات کے وہ پہلو ہیں جو ناگزیر طور پر اپنی ضد بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

خبر ریل، اتار اور پریس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن چونکہ یہ چیزیں باہر سے لائی گئی تھیں اور ان کے پیچھے وہ سائنٹفک شعور نہیں تھا جو ان کی ماہیت اور نوعیت کو سمجھتا ہے اس لیے عام طور سے ہندوستانیوں کے ذہن میں ان کی جگہ پوری طرح نہ بن سکی۔ سائنس کی تعلیم معمولی طور پر سوہی تھی اور کچھ کتابوں کے ترجمے بھی انیسویں صدی کے وسط تک ہو چکے تھے لیکن پھر بھی سائنس ابھی عام شعور کا جز نہیں بنی تھی۔ اور ان ترقی یافتہ وسائل سے عام ہندوستانی کو فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل نہ تھا۔ جس چیز نے فوری طور پر اس شعور کے بننے میں مدد دی وہ پریس تھا، کیوں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات کافی تعداد میں نکلنے لگے تھے اور سیاسی بیداری میں مدد کر رہے تھے۔

جو لوگ سماجی علوم سے واقف ہیں وہ اسے جانتے ہیں کہ مخصوص قسم کے معاشی نظام میں مخصوص قسم کا شعور وجود میں آتا ہے۔ مخصوص قسم کے سماجی، فلسفیانہ، ادبی اور تعلیمی ادارے وجود میں آتے ہیں اور جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ گہرے معاشی اور تاریخی اسباب کا نتیجہ ہوتی

ہیں۔ جن تاریخی اور معاشی حالات کا تذکرہ ہوا وہ کسی خلا میں نہیں ہوئے، اس لیے انہوں نے روجہ اور روایتی مذہبی اور فلسفیانہ اقدار کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے تجزیہ کی سب سے زیادہ واضح اور موثر صورت تو یہ ہوگی کہ پہلے مذہبی، فلسفیانہ اور سماجی علوم اور موقع کا خاکہ پیش کیا جائے، پھر تاریخی عمل نے جو تغیرات پیدا کیے ہیں ان پر نگاہ ڈالی جائے اور اسباب و علل کا رشتہ تلاش کرنے کے ساتھ ان کی تعبیر اور توضیح بھی کی جائے لیکن یہ طریقہ کار تفصیل کا مطالبہ کرتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن چند اشارے ضروری ہیں۔

مختصر اس دور کی مذہبی صورت حال پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اٹھارویں اور ابتدائی انیسویں صدی تک ہندو مذہب میں بھگتی تحریک کے بعد کوئی قابل ذکر تغیر نہیں ہوا تھا۔ بھگتی تحریک کئی قسم کے مذہبی تصورات کا مجموعہ تھی۔ وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک عوامی دھڑل کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور بدھ مت اور اسلام کے متعدد خصوصیات کو جذب کر کے ہندو مت کو ان دونوں نظاموں میں جذب ہونے سے بچانے کا آلہ کار بھی تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس کی نوعیت ایک سماجی احتجاج کی تھی جس کا مقصد ایک خاص طرح کی روحانی مساوات قائم کر کے اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کو مٹانا تھا۔ بھگتی تحریک کی بنیادیں تو وید تک فلسفہ پر تھیں لیکن اس کے اظہار میں اسلامی تصورات اور افکار کے واضح اثرات شامل تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندو مسلم اختلافات نے سیاسی اہمیت کبھی اختیار نہیں کی، اس لیے ہندو ذہن اور فکر کو مسلمانوں کے آنے اور ہندوستان میں پھیل جانے کے وقت تصادم کی جو شکل نظر آئی تھی اب اس سے



انڈیشہ نہ تھا لیکن اٹھارویں صدی کی بات اور تھی مغربی  
اثرات کا رد عمل کہیں تو شدید مخالفت کی صورت میں ظاہر  
ہوا، کہیں اسے مکمل طور پر تسلیم کر لینے کی صورت میں  
ان کے علاوہ ایک توانمند شکل بھی تھی جو ہندو مذہب  
کی چمک کو برقرار رکھتے ہوئے رد نہ ہوئی۔ مذہب کو وقت  
کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے، شعور کی مختلف  
منزلیں پر جو سوالات شکوک کی شکل میں پیدا ہوتے  
ہیں ان کا جواب مذہبی نقطہ نظر سے دینے کی کوشش  
ہر جہد میں ہوتی رہی ہے، اس لیے نئے حالات میں  
ہندو مذہب بھی اصلاح کے دور سے گزرا اور چونکہ اس  
وقت کی تصورات، مذہب و اخلاق کا دور تھا اس لیے  
راجہ رام موہن رائلے، دیوند ناتھ ٹیگور اور کیشپ چندر سین  
کی اصلاحی تحریک میں اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ خود  
ہندوؤں کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ سرکاری تعلیمی کمیشن نے  
اپنی رپورٹ ۱۸۳۵ء میں یہ خیالات پیش کیے ہیں اور  
جن کا خلاصہ سید محمود نے اپنی تاریخ تعلیم میں دیا ہے  
”زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی  
اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اچھے خاندان اور قابلیت  
کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے  
آزاد ہونے کے لیے بے چینی اور اپنی رسوم کی طرف سے  
بے اعتنائی کا علانیہ اظہار کیا جا رہا ہے اور غالباً دوسری  
نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات  
میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائے گی۔“ یوں مذہبی اصلاح  
کے لیے زمین تیار تھی اور عام سماجی حالات اس تبدیلی  
کے معاون تھے۔ نئے شعور کی بنا پر جو تبدیلیاں ہو رہی  
تھیں ان میں رہنمائی کی باگ پیشہ ور مذہبی پیشواؤں  
کے بچائے دانشوروں کے ہاتھ میں پہنچ رہی تھی یہ بات  
ابھی جب ہم مسلمانوں کے یہاں مذہبی اصلاح کا ذکر

کریں گے تو اور نہ بارہ واضح ہوگی کیوں کہ طبقاتی مفاد  
کی شکل بدل رہی تھی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وقتاً فوقتاً  
مذہبی اصلاح کی تحریکیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ ان تحریکیں  
کو کبھی کبھی تجدید یا احیائے دین کہا گیا ہے مغلوں کے  
عہد زوال میں اس کا سب سے اہم مظہر ولی اللہی تحریک  
تھی جس نے کئی دور رس کام کیے۔ ایک طرف شاہ  
ولی اللہؒ نے یہ پتہ لگایا کہ اسلام میں غیر اسلامی عناصر مختلف  
راستوں سے ہو کر کس طرح داخل ہو گئے ہیں اس ضمن میں  
انھوں نے اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کے  
فرق کو بھی ملحوظ رکھا، دوسری طرف اجتہاد پر زور دیا۔  
یہ اجتہاد مختلف مسلکوں کی تقلید محض کے خلاف ایک اہم  
اعلان جنگ تھا۔ تیسری طرف انھوں نے اسلامی عقائد  
کی بنیاد پر ایک مکمل نظام معاشرت اور معیشت مرتب  
کرنے کی کوشش کی۔ انھیں چند اہم اور بنیادی تہذیب  
سے اور خیالات بھی پیدا ہوئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی  
عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ بعض محققین  
شاہ ولی اللہؒ کو جدید علم الکلام کا بانی سمجھتے ہیں۔ شیخ  
محمد اکرام نے روڈ کوٹ میں حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچے سے  
یہ فقرہ نقل کیا ہے ”مصطفوی شریعت کے لیے وقت آگیا  
ہے کہ برہمن اور دیل کے پیرانوں میں لباس کر کے  
اسے میدان میں لایا جائے۔“ اور انھیں تقلید کا مخالف  
قرار دے کر ہندوستان کے علما میں سب سے اونچی جگہ  
دی ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کا ذکر ہے جب مشرق و  
مغرب کی کشمکش اچھی طرح ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن  
مسلمانوں کی مادی اور روحانی زندگی زوال کی انتہا  
کو پہنچ رہی تھی۔ اسلام کو پھر طاقور بنانے کی یہ کوشش  
کوئی اہم مادی بنیاد نہیں رکھتی تھی پھر بھی جو متخالف اور



متصادم عناصر کھلے یا چھپے طور پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے ان کی وجہ سے مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے اس جذبہ کو دائرہ عمل ہاتھ آگیا۔ اگر ہندوستان کی سیاسی حالت تغیر کی رو سے گزر رہی ہوتی تو اس اہم اصلاحی اقدام کی حیثیت بھی حکمین کی رو و قدح سے زیادہ نہ ہوتی۔ مگر ہوا یہ کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ہی وہ تحریک شروع ہو گئی جسے عام طور سے دہائی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا ایک پہلو تو محض سنتِ رسول کا اتباع تھا لیکن دوسرا پہلو جو بار بار شکل اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا یہ تھا کہ اس کے مناسب فضا پیدا کی جائے اور اگر اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں تو انہیں دور کرنے کے لیے جہاد کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کے ہیں جنہوں نے مسکوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس تحریک کا ایک رخ انگریزوں سے بیزاری کی طرف بھی تھا اور ہندوستان کے دارالحرب یا دارالسلام ہونے کی نفی بحث سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگال کی اس واپسی تحریک کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو مذہبی اصلاح کے بھیس میں ایک غلامی زرعی تحریک تھی، جس کا مقصد مساوات، غریبوں سے ہمدردی اور زہندگانوں کی مخالفت تھا۔ یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کے بجائے محض یہ یاد دلانا ہے کہ مسلمانوں کے اندر عام بے چینی اور بددلی پھیلی ہوئی تھی اور اس اہم انقلابی جدوجہد کے لیے فضائیاد ہو رہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں رونما ہوئی۔

اس وقت تک جو مذہبی اور فلسفیانہ تصورات وجود میں آئے تھے وہ مشرق و مغرب کے تصادم کا

نتیجہ نہیں کہے جاسکتے تھے، نظریاتی سطح پر کشمکش شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا مقابلہ کرنے میں ان علوم سے کام نہیں لیا گیا تھا جو قدیم سائنس اور جدید سائنسی فلسفہ کے ساتھ آئے تھے۔ سائنس سے انفرادی طور پر دل چسپی کا پتہ دہلی کالج میں تعلیم پانے والوں کے یہاں، اور دھ کے شاہ غازی الدین حیدر اور شاہ نصیر الدین حیدر کے یہاں یا حیدر آباد کے شمس الادراہ امیر کبیر کے یہاں ملتا ہے یا پھر اس سے قبل اکبری عہد میں یا اورنگزیب کے دور حکومت میں دانشمند خاں کے یہاں چلتا ہے۔ جس کے متعلق برنیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ دانشمند خاں کو ذی کرات اور گیندی کے فلسفہ پاروے کے نظریہ دورِ دلِ خون سے دلچسپی تھی اور اس نے بعض مقالات کا ترجمہ کر لیا۔ یہ انفرادی دلچسپیاں تھیں لیکن انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس کے اثرات کافی پھیل چکے تھے۔ سائنس اور مذہب کی کشمکش شروع ہو چکی تھی، عقلیت اور واقعیت کی طرف میلان بڑھ رہا تھا اور جس طرح نشاۃ ثانیہ کے بعد سے یورپ کے لیے کشمکش تھی کہ یا تو مذہب سائنس سے مطابقت پیدا کرے یا پھر دو میں سے ایک کو برتر تسلیم کیا جائے۔ یہی صورت حال ہندوستان کے اس دورِ بیداری میں نظر آتی ہے۔ اسے چاہے جس پہلو سے دیکھا جائے یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جو تحریکات چل رہی ہیں وہ اسی طرح چلتی رہیں گی یا انہیں نئے علوم اور نئے شعور کی روشنی میں کسی نئے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ غدد کے بعد اس کے لیے فضا بہت سازگار ہو گئی کیوں کہ غدد نے مادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کر دیا اور نظامِ حیات کے وہ نقوش واضح کر دیے

جو تقریباً سو سال سے ہندوستان کے افق زندگی پر ابھر رہے تھے۔ غدر نے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے اندر بھی ہوئی۔ پیش پسندی، کھلی انحطاطی کیفیت، نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے بچتے رہنے کی خواہش کو بہت نمایاں کر دیا اور ان کے لیے فیصلہ کن گھڑی آگئی۔ انہوں نے جو کچھ کھویا تھا اس کے فوراً واپس ملنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اس سے ترک سوالات اور علامت بھی ممکن نہ تھی۔ اس کو قبول کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے دونوں صورتوں کے لیے اس کا ماننا ضروری تھا۔ انسانی شعور ایسے موقع پر کوئی نہ کوئی پہلو ایسا پیدا کر لیتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ بنا سکے۔ چنانچہ مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی نقطہ نظر سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو تغیرات کی بنیادوں کو سمجھنا پڑا۔ جہاں مقابلہ ہو سکتا تھا وہاں مقابلہ کیا گیا، جہاں سمجھوتہ سے کام چل سکتا تھا وہاں سمجھوتہ ہوا، اور جہاں شکست کے بغیر چارہ نہ تھا وہاں ہار قبول کی گئی۔ یہاں یہ بتا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں سے بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا اور انہیں جو کچھ بھی رہنمائی مل سکی تھی وہ مغرب سے آئی ہوئی انگریزی سیاست اور انگریزی خیالات کے ذریعہ ہی مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک آہستہ آہستہ یورپ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو رہے تھے، اور جیسے ہی نہر سوئزر پر برطانوی اقتدار قائم ہوا برطانیہ کا اثر سامنے مشرق قریب و بعید میں پھیل گیا اور ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ یہ ایک طویل کہانی ہے صرف ذریعہ بات واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ذرائع

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر

سے اپنا مستقبل سوچ سکتے تھے اور جو طاقت انہیں اپنے بچے میں دبائے ہوئے تھی اس کے حوصلے اور ذرائع بہت وسیع تھے۔ انگریزوں نے ابتدا معاشی اور سیاسی اقتدار سے کی تھی اور اب آثار اس کے تھے کہ ہندوستانی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے بھی بالکل غلام ہو جائے گا۔ اس منزل پر علی گڑھ تحریک نے ایک معین شکل اختیار کی جو حقیقت اسی دیر بیداری کا جزو تھی جس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تحریک کن حیثیتوں سے بنیادی طور پر ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی مذہبی احوال زندگی کو متاثر کیا۔ تغیرات کا جو پس منظر اوپر دیا گیا اس سے اندازہ ہوگا کہ مقررہ اقتصادی نظام ایک متحرک نظام میں بدلا تھا۔ دولت اب محض جاگیر یا زمین یا سامان آرائش کا نام نہیں تھی بلکہ نئے طبقات کے ہاتھ میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کر رہی تھی اور نئے مسائل اس سے پیدا ہو رہے تھے۔ ریاست اب ایک منظم وحدت اور مضبوط ادارہ تھی جس کی تنظیم اور اصلاح شعوری طور پر حاکم طبقہ اور اس کے حلیفوں کے مفاد کے لیے ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑا تغیر یہ تھا کہ اس وقت تک رہنمائی جاگیردارانہ یا مذہبی عناصر کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہ نکل کر نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ایک طرف تو اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا تھا اور دوسری طرف حاکم طبقہ سے تعلقات قائم کر کے اپنی حیثیت کو بہتر اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا۔ حاکم طبقہ کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ تعلقات باہمی مفاد کی بنیاد پر آسانی سے قائم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کی نئی تشکیل میں تاثر اور اثر کے



مرکز بدل گئے اگرچہ اس کا رشتہ ماضی ادا اس کی روایات سے نہیں ٹوٹا۔ علی گڑھ تحریک کی یہ خصوصیت کہ اس میں خط کعبہ سے پیچھے بے کلیسا رہے آگے، کی آویزش اور کشمکش شامل تھی، اسے بہت پیچیدہ بناتی ہے۔ اس میں جو بعض متضاد پہلو نظر آتے ہیں وہ بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ نفع اور نقصان کی حدیں واضح نہیں تھیں، فوری مفاد اور دیرپا اخلاقی مقدار میں جنگ تھی اور وفاداریاں بٹ گئی تھیں اس لیے علی گڑھ تحریک کا کوئی مطالعہ کسی بنے بنائے تصور کی روشنی میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ خود سرسید کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تصورات میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں آسانی سے ان کی تاویل اور توجیہ بھی نہیں کی جاسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک کے رہنما سرسید تھے اور اس کا نام بھی علی گڑھ کے اس محدث اننگلو اورینٹل کالج کی وجہ سے علی گڑھ تحریک پڑا جو سرسید نے ۱۸۵۷ء میں قائم کیا تھا (سرسید اس سے پہلے بھی مدرسے قائم کر چکے تھے اور سوسائٹیوں کی بنیادیں رکھ چکے تھے کیوں کہ وہ بدلی ہوئی فضا کا اندازہ لگا رہے تھے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے ساتھ بہت سے مخلص، علم پرور، انتھک اور پر جوش کام کرنے والے تھے جو ہواؤں کا رخ پہچانتے تھے، اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے اور علی گڑھ کالج محض ایک علامت تھا اس نئی زندگی میں داخل ہونے کی جو اپنا در کھولے ہوئے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس دروازے کے اندر مختلف قسم کے کارواں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ یونہی آنکھ بند کیے ہوئے، کچھ گرد و پیش کا اندازہ لگاتے ہوئے سرسید

جس کارواں کو لیے بڑھ رہے تھے اس میں مختلف قسم کے لوگ تھے لیکن بہم طور پر سمجھوں کہ دل میں یہ خواہش تھی کہ وقت نے راہ میں جو رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں انہیں عبور کر کے اپنی مادی اور روحانی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ یہی جستجو اور آگے بڑھنے کی یہی کوشش ہے جسے علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے اس میں نتمندی کے سنگ میل بھی ہیں اور پسپائی کے نشانات بھی۔ مصالحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں اور ناروا سمجھوتے بھی، اور سرسید کی ہر گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ تحریک کے سارے نشیب و فرازان کے افکار و اعمال میں دیکھے جاسکتے ہیں اس لیے سرسید ہی کے آئینہ میں اس کے خط و عمل کو دیکھنا مفید ہو سکتا ہے۔

سرسید کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال بڑی بڑی علمی فتوحات سے خالی ہیں گو ان میں علمی کاموں کی کمی نہیں ہے۔ آثار الہنادید کی تصنیف، آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح خود اپنی جگہ پر اہم کارنامے ہیں لیکن وہ سرسید جو علی گڑھ تحریک کے روح رواں بنے وہ رسالہ اسباب بغاوت ہندو متین الکلام مضامین تہذیب الاخلاق، مجموعہ لکچر، خطبات احمدیہ اور تفسیر قرآن کے سرسید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا ابتدائی علمی اور تحقیقی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا۔ سرسید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کے مذہبی تصورات سے وابستگی ہی نے ان کے ذوق اجتہاد کو پروان چڑھایا اور اشاعت تعلیم اور خدمت خلق کے شوق ہی نے ان سے علی گڑھ کالج قائم کرایا۔ پھر بھی غم اور غم کے عام اثرات کو نظر انداز کر کے سرسید کے ارتقاء ذہن کو سمجھنا مشکل ہے۔

سرسید نے منغل حکومت پر غارت خیز اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کی بد حالی اور زوال کا نظارہ کیا تھا۔ زلزلے





مرسید نے مغل سلطنت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا  
تصویر میں بہادر شاہ ظفر مرحوم شہزادہ غزو مرزا کے ساتھ

اور لوکل بورڈوں کے لئے انتخاب کے اصول کی تائید کی اور  
ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو انہیں حکومت  
کے قابل بنائے لیکن جیسا کہ ذرا سے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتا  
ہے یہ ساری سیاست متوسط طبقہ کے رجحانات کی نمائندگی کرتی  
ہے اور متوسط طبقہ اگر اپنے مفاد کے لئے متحد اور متفق ہو سکتا  
ہے تو اپنے جماعتی یا فرقہ دارانہ مفاد کے لئے دوسرے فرقوں  
کا مخالف بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ مرسید اگر ایک طرف ہندوؤں

کی بد نظمی اور بد امنی کا مشاہدہ کیا تھا۔ خود نے جس طرح برہمنی  
ان بھی ختم کر دی تھی اس لئے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا  
اور ان میں جو عملی ملاحیت سوری تھیں وہ جاگ اٹھیں۔ وہ اس  
وقت کے مسلمان رہنماؤں میں سب سے زیادہ جری، با عمل،  
جلد فیصلہ کرنے والے، ذکی، انہم پر جوش، جو صلہ مند اور بین  
اور قتل پر مست تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ غدر نے انگریزی  
حکومت کو مستحکم کر دیا اور اب مسلمانوں کے لئے مستقبل تاریک  
ہے تو پہلی دفعہ انگریزی سرکار کے ملازم ہونے کے باوجود غدر  
کے نازک سیاسی پہلوؤں پر اپنا رسالہ اسباب بغاوت ہند  
لکھا۔ ان کی ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں داخل  
ہونے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اور پھر پور تھی۔ انہوں نے درود  
مندی اور جرأت کے ساتھ انگریزی حکومت کی بعض چرہ دستوں  
کو بے نقاب کیا۔ اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں  
نے کبھی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لئے وہ ان کو کوئی  
کو نہ تو اچھی طرح محسوس کر سکے اور نہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔  
جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی اس کے بعد سے ہندوستانی  
سیاست میں مرید کی جگہ بن گئی۔ انہوں نے اپنی ساری قوت  
اس بات پر صرف کر دی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی  
ہو جائے۔ سیاسی مخالفت کی تکمیل مذہبی مخالفت کے بغیر  
مکن نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جن  
سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تفرقات، نظام اخلاق  
اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی اور  
اشتراک پیدا ہو سکتا۔ لیکن اس کوشش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ  
ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ  
اپنے سیاسی تفرقات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ  
ساتھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے انگریزوں اور  
ہندوستانیوں کی مساوات پر بڑا زور دیا۔ بار بار یہ کہا کہ جو ہندو  
انگریزوں کو ملے ہیں ہندوستانیوں کو بھی ملنے چاہیے۔ کونسلوں

لہذا مسلمانوں کو اس کے لئے آواز بلند کرتے تھے تو دوسری طرف  
بعض مسلمانوں کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انگریزی  
سیاست اس جذبہ کو مسلسل ہوا بھی دے رہی تھی۔ صرف دو  
اقتباس اس سے واضح کریں گے۔ امکاچرن مزداسے اپنی کتاب  
(INDIAN NATIONAL EVOLUTION) میں لکھا  
کہ: "اول اول انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں  
کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں  
کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت  
کا موجب ہوا۔ جیسے اوکینل نے کلکتہ ریویو میں لکھا ہے کہ: "ہم  
یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔  
سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسی  
دہایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی  
طرف سے غفلت کی جا رہی ہے حتیٰ کہ ان کے اوقات کی آمدیوں  
کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھے۔ دوسرے کالجوں میں  
صرف کیا جا رہا ہے۔ اس پالیسی کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں  
ہوتے تھے اس لئے کبھی ہندی، ہندو، ہندوستانی کا نعرہ لگایا  
جاتا تھا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں میں لیکن  
مرسید کی ابتدائی سیاسی زندگی میں اس تنگ نظری کا پتہ نہیں  
چلتا۔ اگر وہ مسلمانوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے تو اس لئے کہ  
انگریز مسلمانوں کو غم کا بانی سمجھ کر زیادہ پس رہے تھے۔ تاہم  
اس وقت کا ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناموزون قومی ارتقاء  
کی وجہ سے مذہبی اختلافات کے جرائم کی پرورش کر رہا تھا چنانچہ  
مولانا حالی مرسید کے یہاں جب اس بات کا پتہ لگانا چاہتے  
ہیں کہ ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی کیسے پیدا ہوئی تو یہ واقعہ  
ان کے سامنے آتا ہے:

۱۸۶۹ء میں بنارس کے بعض مرید آدرہ ہندوؤں کو  
یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں  
سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کر لئے جائیں گے

۲۸۶ اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۱۹۶۲ء

کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جائے گی  
میں لکھی جائے۔ مرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین  
ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بھلا ایک قوم کے ساتھ چلنا اور  
دونوں کو مل کر سب کے لئے مشترک کوشش محال ہے۔ ان کا  
بیان ہے کہ انہیں دنوں میں جب کہ یہ چار بنارس میں پھیلے  
ایک روز مسٹر شکیر سے جو اس وقت بنارس میں کھڑے تھے میں  
مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ مجھ  
ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا  
موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا  
ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال  
ظاہر کرتے تھے میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں  
قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بیت  
کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور فسادان گوئی کے  
سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہ  
گا وہ دیکھے گا۔ اس طرح مرسید کے ذہن میں مسلمانوں کی  
علیحدہ تعلیم، ان کے علیحدہ حقوق وغیرہ کے خیالات نے جنم لیا  
مردوع کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ایسی صدیق پیدا ہوئی گئیں  
کہ مرسید کا مطمح نظر بدلتا گیا۔

۱۸۶۹ء میں مرسید انگلستان گئے اور تقریباً ڈیڑھ  
سال بعد واپس ہوئے اس سفر نے ان کے ذہن میں بیت  
سے مسائل واضح کر دیئے اور انہیں اپنا نصب العین روشن  
نظر آنے لگیوں تو انہوں نے غم کے بعد ہی سے انگریزی  
معاشرت اختیار کر لی تھی۔ جس سے مذہب پرست مسلمان  
ان سے بدظن ہو گئے تھے لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد  
انہوں نے جب اس کی تبلیغ شروع کی تو پالی مرے اور نچا ہو گیا  
معاشرت میں ظاہری تبدیلیاں بھی مرسید کی تعلیمی تحریک کا  
جزو و حقیق لیکن ان کا اصل کام ذہنوں کو بدلتا تھا جو اس کے  
جذبہ اجتہاد اور تجدید کا نتیجہ تھا۔ اسی کے لئے انہوں نے

ملیک محمد مسلم یونیورسٹی لبریری



انگلستان سے واپس آنے کے عقوڑے ہی دلوں بد تہذیب لافظی نکالاجوان کے حوصلوں اور خیالوں کا آئینہ ہے۔ مرید نے اسلام کے اصل اصولوں سے کس حد تک اعراض کیا۔ بس حد تک معتزلہ انداز نظر اختیار کیا اور کتنا جدید مانس اور مغربی علوم سے مستعار لے کر اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ کیا تک یہ سب کچھ محض تاویل اور نئی تشریح کی حیثیت رکھتا تھا اور کہاں تک مغربی عقلیت کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ ان تمام باتوں پر وہ قنوس تفصیل سے بحث کرے گا جو ان کے علم کلام کا مقابلہ اسلامی علم کلام سے کرے گا۔ لیکن ایک ضروری مطالبہ کرتے والا یہی ہے۔ اس آسانی سے سمجھ لے گا کہ وہ مسلمانوں کو پس سے نکالنا چاہتے تھے اور انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ذرائع جدید تعلیم انگریزوں سے وفاداری معاشرے میں تبدیلی، مذہب اور عقل کی مطابقت، تقلید سے نجات اور اصلاح رسوم ہیں۔ ان کے ہر اقدام میں انہیں ذرائع سے کام لینے کی کوشش نظر آئے گی۔ تہذیب الاخلاق میں مرید کے مضامین پڑھتے جائے آپ کو بار بار یہ خیالات واضح یا ڈھکے چھپے الفاظ میں دکھائی دیں گے۔ ”علم سے مراد صرف علوم دینیہ نہیں ہیں۔ محض مددہ نماز وغیرہ عبادت نہیں جس طرح علما دینیہ کا پڑھنا ہی نفسہ عبادت نہیں اسی طرح علوم دینیہ کا پڑھنا عبادت نہیں لیکن اگر علوم دینیہ اس لئے پڑھے جائیں کہ ان سے مذہبی علوم کے سمجھنے میں مدد ملے گی تو ان کا پڑھنا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ الحمد معاش و تمدن حسن معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر ہوتے جاتے ہیں اور اخلاقیات و مولوی صاحب و پیری، اٹھا اور رسول کے دشمن ان کو روز بروز تباہ و برباد کرتے جاتے ہیں۔ مذہب اسلام کے دوست دار کا کام یہ ہے کہ اپنے تئیں پیری یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلاتے اور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لئے انہیں باتوں

علیگزہ مسلم یونیورسٹی نمبر

کا جن کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھا ہوا دغہ کھا کرے یا جن کی ضرورت و حقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اس کی تہ پیرا کو شش کرے۔ مسلمان عام طور سے سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے عقائد خراب ہوتے ہیں۔ اسلئے مسلمانوں کو یہ فکر ہے کہ انگریزی پڑھنا تو روز بروز ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب کو کیا کریں اور کیسے بچاویں۔ ہم مرید، اس خیال پر مبنی ہیں۔ اگر اسلام ایسا ہی بودا مذہب ہے تو اس کو چھوڑ دینا اچھا، ہیں جدید علوم سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ شیعوں کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ ہر عہد میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی بہت سے حوالوں سے یہی بات کہی ہے عقلیہ مذہب کو ہمیشہ علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہمیشہ ان کوششوں کو الحاد و زندہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام احمد ابن حنبل کے زمانے میں یہی ہوا اور یہی خلفائے عباسیہ کے دور میں جب مسلمان عالموں نے معقول و منقول کی تطبیق کو لازمی سمجھا اور یقین کیا کہ بغیر اس کے پھان کاٹ نہیں تو ضرور اس کی طرف مائل ہوئے۔ اس فن میں امام غزالی کی احیاء العلوم اور شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ضرورت یہ ہے کہ جس طرح قدماً نے یونانی علوم سیکھے تھے۔ ہم آج جدید علوم سیکھیں اور انہیں کی طرح معقول جدیدہ اور منقول اسلامیہ قدیمہ کی تطبیق کی کوشش کریں۔ قدیم یونانی معقولات گمراہ کرنے والے ہیں اور جدید علوم حقیقت اشیا بتاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق سے بے ترتیب طور پر نقل کر دیئے گئے ہیں۔ پھر دلوں کے مجموعوں میں بھی یہی باتیں ملتی ہیں مثلاً دینی علوم اور دینی دود و حشمت سے اسلام کو روٹی ہوگی۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جانی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جلتا ہے ہمارے بزرگوں نے علم کی حقیقت کو اس قدر جاننا کہ ایک



بڑے عقلی ہے جو خیال اور حقائق میں رہتی ہے۔ مگر اس زمانے میں اصلی ظلم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربے میں اوسے۔ رسومات متناقضہ کا موجود ہونا اس کا ثبوت ہے کہ رسومات کو توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضروری ہے مجھے (موسید کو) تنگیز کے فتوؤں کا ڈر نہیں کیونکہ ایسا ہی غوث الاعظم، امام غزالی اور مجدد ملت ثانی کے ساتھ کیا گیا۔ حکمت مسلمان کے لئے گم شدہ چیز کی طرح ہے۔ جہاں کہیں پاک لے لے۔ ہمدانی (موسید کی) سمجھ میں کوئی مسئلہ عظیم اسلام کا یا جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کسی قدیم یا جدید علم کے برخلاف نہیں ہے۔“

طویل اقباسات دینے اور ان پر بحث کرنے کے بجائے یہ چند جملے ادھر ادھر سے دیئے گئے ہیں جو اپنی کہانی آپ کہتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ مرید وقت کے تعاضوں سے مطابقت رکھنے والا ایک علم الکلام مرتب کر رہے تھے جسے پوری طرح وہ تو سمجھ نہیں سکتی تھی جس کی دہدہ بنائی کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو مخالفتیں ہوئیں ان کے مختلف پہلو تھے، کوئی انہیں مذہبی خیالات کی بنا پر کافر، غیر مسلم دھرم اور غیر سمجھتا تھا، کوئی اصلاح معاشرت کی وجہ سے کر شان اور عیسائی کہا کرتا تھا۔ کوئی مذہبی اصلاح کے اس جوش کو محض ایک سیاسی ڈھونگ سمجھتا تھا جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی چنانچہ جمال الدین افغانی نے ایک جگہ لکھ ہی دیا: تفسیر کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے اعتقادات و جو زائل کرنے کی جو کوشش اس مفسر (مرید) نے کی ہے اس کا مقصد وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر غلامی مسلط کی جائے اور ان کو اغیار میں غم کر دیا جائے۔" حقیقت یہ ہے کہ مرید ہندوستانی تاریخ اور عالمی سیاست کے اس دور میں رہنمائی کے لئے آئے تھے۔ جب اسلامی جوش اور غلوں کے باوجود

ان کے خیالات نے انگریزی حکومت کے دست و بازو مضبوط  
کئے اور اگر مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھایا تو  
چنچپے گھسیٹ دیا۔ ان کی ایک دشواری یہ بھی تھی کہ مذہب  
کے معاملہ میں قدیم علماء و ادواء تو ان سے بدظن تھے ہی وہ خود  
یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں مذہب  
سے کس طرح کام لینا چاہئے۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو دہابیت  
کے بعض پہلوؤں کو سراہتے ہیں دوسری طرف یہ کہتے تھے کہ  
انگریز اہل کتاب ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب ملے  
مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، اگر ہو سکتے ہیں تو وہ عیسائی  
ہیں۔ "یاد مرے موقع پر ایک لکچر میں انگریزوں کا ونا دار  
سہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمانوں کے لئے کھن فقل  
اد انسانی نہیں، خدا کا حکم ہے، رسول کا حکم ہے کہ حاکم کی  
اطاعت کرو۔" اس طرح عقل پرستی اور اجتہاد فکر نے وقتی  
مصالح سے ساز کے انہیں یہ بھی سکھا دیا کہ وہ مذہب کا سہارا  
لے کر غلامی کو حق بجانب ثابت کریں۔

علی گڑھ تحریک اپنی مکمل شکل میں مسلمانوں کے سامنے  
 نمودار ہوئی اس وقت تک مرید کے ذہن میں اس تحریک کے  
 واضح نقوش ہوں تو ہوں، عام طور پر اس کی ہمہ گیری اور  
 ہندوستان کی تاریخ خاص کر مسلمانوں کی ذہنی اور سیاسی  
 تاریخ پر اس کے جو اثرات پڑنے والے تھے اس سے زیادہ  
 لوگ واقف نہیں تھے لیکن نئی زندگی کا جو ولولہ تھا اس سے  
 تھوڑے ہی دنوں کے اندر اس کا رخ معین کر دیا۔ مسلمانوں  
 تک اس کے مثبت اور مفید پہلو ابھرتے رہے۔ نئے علوم حاصل  
 کرنے، مذہب کو علوم عقلی کی مدد سے قابل قبول بنانے، سماجی  
 اصلاح کرنے اور ہندوستانیوں کو مایوسی کے جہنم سے لاکر زندگی  
 کی جدوجہد میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے، اپنی زبان اور ادب  
 کو سر بلند بنانے اور سنیہہ علمی اور عملی کاموں کا، طرقت متوجہ  
 کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے عام دورِ بیداری

کو بیچ کر اور مضبوط تر بنایا۔ اس وقت تک سرسید نے ہندوستان کو ایک تریک قوم کہا اور اگر کبھی ہندو اور مسلمان کے لئے ایک ایک قوم کا لفظ استعمال کیا تو انہیں ایک دہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی لیکن جتنا وقت گزرتا جاتا تھا ان کے یہاں ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں کو بھی وہ ایک ہندوستانی قوم کہنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں اپنے ایک پتھر میں لکھتے ہیں کہ: "ہندوؤں سے ہندو مسلمان یہاں آباد ہیں۔ چند سال سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم (انگریز) بھی یہاں آباد ہو۔ اب یہ تینوں کا ملک ہے۔" اور اسی کے تقریباً دوں بعد انہیں یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ قوم ہندوستانی قوموں سے برتر ہے چنانچہ کہتے ہیں: "میں کی جگہ کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کے لئے ناممکن ہے کہ ہندو یا مسلمان ہم سے کوئی حاکم ہوا اور امن قائم رکھ سکے، پھر یہی ہونا ہے کہ کوئی دوسری قوم ہم پر حکمران ہو۔"

مشرع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مقالہ میں علی گڑھ تحریک کی مکمل تاریخ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی بلکہ جن حالات نے اسے جنم دیا اور اسے ایک راہ پر لگایا ان کا تجزیہ کیا جائے گا اس لئے ان تمام وجوہ کی جستجو، جن سے یہ تبدیل ہوئی، یہاں نہیں کی جاسکتی تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت نے غدر کے بعد اپنے استحکام کے لئے جو کوششیں کیں اور جو ذرائع اختیار کئے ان میں ہندو مسلم اتحاد کو روکنا بھی تھا۔ دونوں فرقوں میں اُن عناصر سے ساز باز کرنا بھی تھا جو ان کے معاون اور حلیف بن سکیں۔ یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ساری دھابا حکومت کی نظر میں یکساں ہے اور اس کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اس معاشی استحصال اور لوٹ پر پردہ بھی ڈالنا تھا جو ڈیڑھ صدی سے جاری تھا۔ اس طرح غدر کے بعد مغربی اثرات سے پیدا ہونے والی بیداری کے باوجود ہندوستان میں اصل کشمکش یہ تھی کہ یہاں غیر ملکی حکومت ہوگی یا ان قومی

عناصر کا اتحاد ہوگا جو ہندوستان کی ترقی انگریزوں کے مفاد کے لئے نہیں، ہندوستان کے مفاد کے لئے چاہتے ہیں۔ اس میں وفاداریوں کی تقسیم واضح نہیں تھی اور سیاسی شعور جس منزل پر تھا اسے دیکھتے ہوئے ہر بھی نہیں سکتی تھی لیکن معاشیات اور تاریخ کے ہر طالب علم کو وہ نشانات نظر آسکتے ہیں۔ جو انگریزی مفاد کے ثبوت میں کیوں پر کیلیں شوکت رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو ہی نہیں باشعور انگریزوں کو انگریز دشمنی کے بھوت منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں نیک دل لارڈ کینگ نے گورنر جنرل کا جہد سنبھالتے ہوئے کہا: "میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں لیکن میں اس بات کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا کہ کہیں ایسا نہ ہو ہندوستان کے افق پر جو یہ ظاہر نہایت پرسکون اور خاموش نظر آتا ہے۔ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھرا ہے، شاید ٹکڑا آدمی کی پتیلی سے بڑا نہ ہو لیکن بڑھتا ہی جائے، بڑھتا ہی جائے یہاں تک کہ یکایک طوفان کی طرح پھٹ پڑے اور ہمیں برباد کر دینے کی دھمکی دینے لگے۔" اور سارا بھر کے اندھی اندھ یہ بادل اٹھا، گر جا، برسا اور انگریزوں کے لئے تباہی کی دھمکی بن گیا۔

علی گڑھ تحریک کے ابتدائی دور اور بعد کے ادوار میں جو فرق ہوتا چلا گیا۔ اس کی جڑیں ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ اس کی خامیوں اور خوبیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ رو باتیں اکثر کہیں جاتی ہیں اور دونوں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستان میں قومی احساس کا نگریس کے قیام (سنہ ۱۸۸۵ء) سے شروع ہوا اور دوم یہ کہ اس کی ابتدا انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ کیونکہ اس کی بنیاد ایلن کینیون ہیومن نے رکھی اور وائسرائے لارڈ ڈرنل نے اس کی کامیابی کا پیام بھیجا۔ گویا اس احساس کے لئے انگریزوں کا منت کش ہونا چاہیے۔ اس خیال میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ قومیت کا احساس انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور یہ سب مل تھا انگریزوں



کے وجود کا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس میں مغربی طرز فکر سے مدد لی لیکن اسے انگریزوں کی دین سمجھا غلط ہو گا۔ ہندوستان میں قومیت کا ارتقا اس معاشی پستی اور غلامی کے احساس کا نتیجہ ہے جس کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ اگر ہم سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی جدوجہد کو نظر انداز بھی کر دیں تو اس احساس کی جماعتی شکلیں برٹش انڈیا سو سائٹی رسنہ ۱۸۵۸ء برٹش انڈیا ایسوسی ایشن رسنہ ۱۸۸۰ء، بمبئی ایسوسی ایشن تقریباً سنہ ۱۸۵۰ء، بنگال نیشنل لیگ انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ، سرو جنگ سبھا پورنا رسنہ ۱۸۷۷ء، نئیوا ایسوسی ایشن مداس، مہاجن سبھا مدراس (سنہ ۱۸۸۴ء) جیسے اداروں کی صورت میں نمودار ہو چکی تھیں اور ہندوستان کے کئی سوا اخباری اور گرمی کے ساتھ ہندوستان کے قومی جذبات کا اظہار اور قومی احساس کی تشکیل کر رہے تھے اس لئے نیشنل کانگریس کو پہلا قومی ادارہ کہنا درست نہیں۔ یہ ضرور ہوا کہ اس نے دوسرے قومی اداروں کی اہمیت کم کر دی۔ اب رہا یہ کہ ایک انگریز نے کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ اس کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ مسٹر موم کے سوانح نگار مسٹر ایم ڈربرن نے اس کی تفصیلات دی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جب موم نے سات بڑی بڑی جلدیں صرف ان رپورٹوں سے بھری دیکھیں جو گاؤں، قصبوں، شہروں و ضلعوں سے اکٹھا کی گئی تھیں اور جن میں لوگوں کی بافیلات چیت، کچھ کر گزرنے کے ارادے، ہر حالت میں متحد رہنے کے عہد و پیمان، اسموں کی درستی اور بغاوت کے عزم کی کہانیاں تھیں تو وہ حیرت زدہ اور خوف زدہ ہو گیا اور اس نے کانگریس کی مخالفت کے اس جذبہ کو دستوراً اور آئینی شکل دینے کے لئے ایک قومی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی۔ اس لئے یہ رائے قائم کرنا ٹھیک نہ ہو گا کہ قومی تشکیل کی ابتدا انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے سارے ارتقا میں ارتقا بالفسد کا اصول کار فرما ہوتا ہے اور تعمیر و

تخریب کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں اس تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ قومیت کے نشوونما کے لئے فضائیات تھی اور انگریزی حکومت یا ملکہ وکٹوریہ سے وفاداری کے اعلان کے پر رے ہیں اس کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی نیشنل کانگریس کی عمر دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے اجلاسوں میں وفاداری کے اعلانات کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی کہ حکومت اور اس کے حلیف عنانہ نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ کانگریس کی ابتدائی کارروائیوں میں ہندوستان کے ابھرتے ہوئے متوسط اور سواہ دار طبقہ کے مقاصد اور مفاد کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ معمولی پہلے پر سہی، یہ مفاد غیر ملکیوں کے مفاد سے متصادم تھے اس لئے تقوڑے ہی دنوں کے اندر حکومت نے سرکاری ملازموں کو کانگریس کے جلسوں میں شرکت کرنے سے روک دیا۔

اب دیکھا یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک یا سرسید کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ سنہ ۱۸۸۸ء تک کی کانگریس کی کارروائیاں دعویٰ جانی تو اندازہ ہو گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی سرسید جس کے مخالف ہوتے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ سرسید کو ہندوستان کی معاشی پستی کا احساس نہ تھا لیکن عملاً مولہ ہی کہ سرسید کا نقطہ نظر محدود ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کی۔ مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے سے روکا۔ رئیس اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی تفریق پر زور دیا۔ لوکل بورڈ کے انتخاب کی مخالفت کی، سیاسی شورش سے خوفزدہ ہو کر مسلمانوں کو سمجھایا کہ ہم کو الگ رہنا چاہئے بجز یہود و غل کرنے کے ہم کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ بنگالی رہنما کی سیاسی جدوجہد کو مسلمان قوم پر بے جا استغلازی سے منسوب کیا۔ اس بات پر زور دیا کہ اگر انگریز چلے گئے تو ملک میں امن نہ رہیگا۔ مسلمانوں کو بار بار یہ بتایا کہ صرف انگریز تہذیب دوست ہیں اور یہ سب کچھ تقریباً دو تین سال کے اندر ہوا۔





سر سید مرحوم نے غداران انگریزوں کے مقابل  
اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے

بے جا نہیں گئے، غلہ اور روٹی کی تجارت کریں گے،  
— انگریز اس میں دخل بند کریں گے مگر یہ سب باتیں تعلیم پر  
دوقوف ہیں۔ یہاں وہ کشمکش نمایاں ہے جو اس عہد کے  
دوسرے رہنماؤں کے یہاں بھی تھی لیکن اس کا لب و لہجہ  
اس کا مقصد دادا بھائی نوروجی، سر سید رانا تھہ میزجی، لال  
مومن گھوش، ارمیش چندرت کے لب و لہجہ اور مقصد سے  
مختلف ہے حالانکہ ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو انگریزی حکومت  
کی برکتوں کا شفا خواں نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سر سید انگریزی حکمت عملی کا شکار

بعض حضرات نے اس تبدیلی کو تہیہ و تدبیر کے پلے پہل علی گڑھ  
کالج کی سیاسی چال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور ایسا نتیجہ نکالنا  
کچھ بہت غلط بھی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی  
ایک خاص منزل پر ”غیر کی جادو بیانی“ اس لئے ”کارگر“ ہو گئی  
کہ سر سید نے مسلمانوں کے صرف فوری مفاد پر غور کیا۔ یہ فوری  
مفاد سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا اور سیاسی یا قومی تحریکوں  
میں شرکت کے ساتھ یہ بات ناممکن ہو گئی تھی۔ یہ چیز ان کے  
طبقاتی مفاد سے بھی ہم آہنگ تھی۔ ترقی کی دوڑ میں مسلمان  
پیچھے تھے، دولت میں کم تھے، تعداد میں کم تھے، بڑی دشواریوں  
کے بعد حکومت نے ان پر عبور سے کرنا شروع کیا تھا بغاوت  
اور شورش پسندی کا دھبہ ان کے دامن سے دھویا  
گیا تھا اور سر سید جب ترقی کا تصور کرتے تھے تو ان کے ذہن  
میں ”زرق برق در دیاں پہنے کرنیل اور میر بنے ہوئے“  
مسلمان نوجوان ہوتے تھے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے والے  
تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے اس لئے سر سید نے تعلیم و تربیت  
کے ان پہلوؤں پر زور دینا شروع کیا۔ اگر کوئی شخص اس  
مسئلہ کے طبقاتی پہلو کو سمجھنا چاہے تو اس کے لئے ان کے  
ایک لکچر ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۸۸ء کی یہ چند سطریں کافی  
ہو گئی ہیں: ”ہم علم میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں۔ ہندو چاہیں  
تو ہم کو جو ہمیں گھنٹے میں تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل  
ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ بیرونی تجارت پر انگریزوں نے  
قبضہ کر لیا ہے۔ جو تجارت ہندوؤں کے پاس ہے وہ انہیں  
کے ہاتھ میں رہنے دو۔ کیونکہ ہم دوکان پر بیٹھ کر آٹا وال  
بیچ سکتے ہیں، نہ سوت کپاس۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی  
تجارت جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور جس سے وہ فائدہ  
اٹھاتے ہیں اس کو ان کے ہاتھ سے بھیننے کی کوشش کرو  
ان سے کہو کہ اب آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا  
چمرا انگلستان بے جا نہیں گئے اور وہاں بیچیں گے۔ بڑیاں امریکہ

ہو گئے۔ ان کی نگاہ محدود ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ انہوں نے صرف مسلمانوں اور وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کو اپنے تمام اعلیٰ خیالات کا مرکز بنالیا اور انگریزوں کی حمایت میں یہ بھی بھلا دیا کہ انگریز مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا خون بھی چوس لینا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اس طرح آہستہ آہستہ تغار کا شکار ہوتی گئی اور سرسید کے غیر معمولی ذہن نے اپنی کمان سے ترقی کے تیر نکال کر رجعت پسندی کے تیر لگائے جس سے خود انکی تحریک زخمی ہو گئی۔

جیسا کہ کہا گیا علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی یہ ہندوستان کے دور بیداری کا ایک اہم جزو تھی۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور ایوسی کے جنگل سے نکلنا سکھایا تھا اس کے اصلاحی مشن نے طرز کہن پر اڑنے اور تعلیم نو سے ڈرنے سے بچایا تھا۔ اس نے کسی حد تک جاگیر دارانہ تصورات سے نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن اس کی تعمیر میں جو غربابی کی صورت مضمحل تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ضرورت سے زیادہ حاکم طبقہ سے مدد لی گئی اور اسے عوام کی پہونچ سے باہر رکھا گیا جن عناصر کی مدد سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی گئی انہوں نے اس کے صحنہ پہلوؤں کو دبا کر محض وقتی فائدہ پہونچا کر اسے پہلوؤں کو ابھارا لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ ہندوستان کے تاریخی اور سماجی ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کے ادبی کارنامے تہذیب الاخلاق اور اس کی جاندار نشر، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث مباحثے، ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لکچر وں کے مجموعے، خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت، محسن الملک

جمال علی، وقار الملک، ذکا باللہ، سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے تحریک سے مخالفت کے باوجود شمالی کے ادبی اور علمی شاہکار اور ان سب سے بڑھ کر وہ زندہ تحریک اور ترقی پذیر ادب اور علمی نفا جو ان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی۔ یہ ساری چیزیں علی گڑھ تحریک کے دفتر عمل میں لکھی جائیں گی۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے قومی زبانوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہونچا دیا۔ معمولی بول چال کی زبانوں کو ادبی خزانوں سے مالا مال کر دیا، یہ بات ہندوستان کے ادبی ارتقا کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے یہاں کی سمجھی جدید زبانوں میں شعروادب موجود تھے لیکن اس دور بیداری نے حقیقت پسندی، نمونہ اسلوب بیان، ادب اور زندگی کے رشتہ پر زور دے کر ادب کو جاندار بنایا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں اردو ادب نے ایک نئی کلاسیکی عظمت حاصل کی جس کے حسن میں رعنائی کم، صحت زیادہ ہے، ان لوگوں نے جن نئی چیزوں کو قبول کیا اسے محض نقالی یا تقلید نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ نئی زندگی میں داخل ہونے کا شعوری احساس تھا جس نے ادب کو سماج اور تہذیب کے ارتقا کا ایک اہم آلہ کار بنادیا۔ شعروادب کے گیسو تو ہمیشہ ہی شانے کے منت پذیر رہتے ہیں اگر انہیں کاکل کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے لیکن سرسید کے دور میں اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب کی ایک منزل آئی اور ایک نئی منزل کی طرف ادب کا کارواں روانہ ہو گیا، نئے یقین اور نئے حوصلوں کے ساتھ نئے امکانات اور نئے جذبے کے ساتھ، علی گڑھ تحریک کی یہی وہ ممتاز خصوصیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس تحریک کی بہت سی خامیوں کا کفارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ●



اسلامی ڈائجسٹ

# ہمدی

جس نے آغاز سفر ہی میں  
اہل ذوق سے وہ بے پناہ  
خراج تحسین حاصل کیا ہے  
جسکی نظیر اردو تاریخ میں  
ملنی مشکل ہے

بلاشبک و شب

اسلامی ڈائجسٹ ہمدی

علمی، ادبی اور اسلامی رسالوں  
کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے

اس عظیم المثال علمی ادبی اور

اسلامی گلدستہ کا تازہ شمارہ

ہر ریوے بک شال اور اخبار فروش سے مل سکتا ہے

از اول تا آخر رنگین فوٹو فلم کی  
نظر انداز و زرباعث اور نادر  
و نایاب تصاویر سے آراستہ

دلچسپ ادبی، علمی اور تفسیری  
مضامین کا خزانہ

اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب،  
اسلامی روایات، اسلامی فتوحات  
اسلامی علوم، عظیم مسلم شخصیتوں  
اور ماضی و حال کی مسلم اقوام کے  
کردار و حالات کا حقیقی عکاس

ایڈین فائن آرٹ پریس دہلی